www.pakistanipoint.com
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

نورِ مُبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بُری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ اور اُس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے (71) اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے بہشتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (وہ) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور بہشت ہائے جاودانی میں نفیس مکانات کا (وعدہ کیا ہے) اور اللہ کی رضامندی تو سب سے بڑھ کر نعمت ہے یہی بڑی کامیابی ہے (72)

(سورۃ التوبہ)

اس شمارے میں

نقطۂ نظر

احتساب سب کا — سید ریاض الحسن — 16

خصوصی فیچر

ڈومور کا زمانہ گیا — افضال مظہر انجم

ضرب سکندری

سولجر نامہ قسط:19 — سکندر خان بلوچ — 27

سلسلہ وار ناول

پشیمان قسط:1 — ریاض عاقب کوہلر — 33

لمحۂ فکر

اپنی ہی قوم کے سوداگر — محمد صدیق — 61

جرم و سزا

ماں، محبت اور موت — احمد یار خان — 65

قسم، قتل اور کالا جادو — ریاض بٹ — 193

ایک ناٹر ایک کہانی

بیچ کی دیوار — نسیم سکینہ صدف — 24

ندامت — تسنیم کوثر — 85

کچھ یادیں کچھ باتیں

وعدہ معاف گواہ — ملک ساجد گل اعوان — 92

سفرنامہ

دیارِ حرم کو چلے آخری قسط — اعجاز حسین سٹھار — 97

ایک حقیقت ایک افسانہ

پچھل پیری — شاکر لطیف — 117

جگ بیتی

الاؤ آخری قسط — محمد رضوان قیوم — 129

منزلیں اور راستے — ڈاکٹر مبشر حسن ملک — 145

اس شمارے میں

آپ بیتی

پیار، پردیسی اور پیر — آخری قسط — حکیم مختار احمد ناز — 161

بات ہے رسوائی کی

دودھ حرام — دستگیر شہزاد — 171

میں بھول نہیں سکتی

زود پشیمان — سیّدہ شاہدہ شاہ — 177

تاریخ کے جھروکوں سے

مہاراجا — قسط 9 — میاں محمد ابراہیم طاہر — 187

طنز و مزاح

سنا تم نے بھی؟ — عنایت اللہ — 213

چاردیواری کی دنیا

بانجھ — عارف شہزاد — 221

خاکہ

صحت مند باتونی — خادم حسین مجاہد — 225

انسپکٹر کے قلم سے

چھوٹی چھوٹی باتیں — عدنان احمد طارق — 228

آثار قدیمہ

قلعہ شیخوپورہ — حامد رضا قادری — 231

خطوط و خیال

اظہارِ خیال — قارئین — 235

منظومات

مجھے کیوں نکالا؟ — شرافت ضیاء — 33

غزل — ہما طاہر — 64

غزل — حیا بٹ کشمیری — 64

ہر بوالہوس ہے وارثِ لیلائے اقتدار

پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر ایک خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس خبر کے مطابق الیکشن کمیشن ترمیمی بل 2017ء منظور کرلیا گیا۔ خبر کے مطابق ترمیمی بل میں ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلف میں ردو بدل کیا گیا ہے جبکہ حکومتی ترجمان کے مطابق اس شق کو حذف نہیں کیا گیا یہ موجود ہے۔

جب اس سلسلے میں تحقیق کی گئی تو ایک بہت بڑے فراڈ اور دھوکے کا انکشاف ہوا۔ اس ترمیمی بل کے کل 88 صفحات ہیں۔ صفحہ نمبر 79 میں امیدوار کے حلف نامہ میں شق نمبر 3 میں امیدوار سے ختم نبوت سے متعلق حلفیہ بیان اور اقرار لیا جاتا تھا لیکن جب جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ شق تو اپنی جگہ موجود ہے لیکن شق کے پیراگراف کا عنوان تبدیل کر دیا گیا ہے جو پہلے حلف نامہ اور اقرارنامہ (Oath and Declaration) تھا۔ اس کو بدل کر صرف اقرارنامہ (Declaration) کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک لائن جس میں امیدوار قسم کھاتا تھا کہ: ''میں قسم کھاتا ہوں (I Solemnly Swear) اور آگے ختم نبوت کے حوالے سے پیرا ہوتا تھا، اس لائن کو ختم کر دیا گیا ہے۔

ذرا غور کریں، اقرار کرنے اور قسم کھانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقرار تو کسی بھی بات کا کیا جاسکتا ہے لیکن قسم ہر بات کی نہیں کھائی جاسکتی، جب تک کہ آپ کو کسی بات پر من وعن یقین نہ ہو۔ اقرار کر کے انسان مکر سکتا ہے لیکن قسم سے مکر کر ایک مسلمان اپنی دنیا ہی نہیں آخرت بھی خراب کرتا ہے کیونکہ قسم کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

آخر ختم نبوت کے حلف نامہ کو اقرارنامہ میں تبدیل کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ میرے خیال میں میاں صاحبان اتنے سادہ نہیں ہیں کہ وہ حلف نامہ اور اقرارنامہ کے فرق کو نہ سمجھتے ہوں۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ایک گہری سوچ اور خطرناک چال کا حصہ ہے۔ قادیانیوں کو رعایت دینے کے لئے اور ختم نبوت سے متعلق ترمیم کو غیر مؤثر بنانے کے لئے جو کچھ ہو سکتا ہے، حکومت موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہ

بلاوجہ نہیں اس کے پردہ کے پیچھے چھپے ہوئے ہاتھوں کو غیر مؤثر بنانا ضروری ہے۔

کیا اس تبدیلی کا مقصد یہ تو نہیں کہ غلط کردار کے حامل اور پاکستان دشمن شخصیات کے لئے راہ ہموار کی جارہی ہے؟ بہت سے خدشات میں سے ایک خطرناک خدشہ یہ بھی ہے کل کو کوئی قادیانی یا غیر مسلم اقرار کرلے کہ میں ''مانتا ہوں'' اور وہ اسمبلی کا رکن یا کوئی اہم عہدے دار بن جاتا ہے اور بعد میں اس کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو وہ اس ''اقرار'' سے مکر بھی سکتا ہے اور دل سے پاکستان کے لئے کام نہیں کرے گا۔

''اس کے مقابلے میں اگر وہ قسم کھاتا ہے تو اس کے خلاف ختم نبوت کے تحت قانونی چارہ جوئی ہو گی اور جو مسلمان دل سے تسلیم کرے گا وہ اسلام کے منافی یا ختم نبوت کے منافی کوئی کام نہیں کرے گا اور اس کے لئے قسم کھانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی کہ ان الفاظ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی؟ کون سا آسمان گرنے والا تھا؟ وطن عزیز میں کرنے کے بہت سے کام پڑے ہیں جن پر توجہ دینے کی بجائے یہ کام خصوصی توجہ کے ساتھ کیا گیا؟ یہ کس کو خوش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؟

دوسری طرف وزیراعظم کے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران ایک امریکی صحافی نے قانون تحفظ ناموس رسالت کے بارے میں سوال پوچھا کہ آپ کب اس قانون کے تحت پھانسی کی سزا کو ختم کررہے ہیں؟

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم کو اس کے جواب میں اس قانون کا دفاع کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ جب پارلیمنٹ اس کو تبدیل کرے گی۔

میاں محمد نواز شریف صاحب نے اپنی پہلی وزارت عظمٰی کے دور میں اپنی پارٹی کے پارلیمانی اجلاس میں بھی کہا تھا قادیانیوں سے متعلق اگر ترمیم آئین سے ختم کردی جائے تو ہمارے سارے قرضے معاف ہو جائیں گے۔ اس کے لئے امریکہ تیار ہے، وہ تو جناب راجہ ظفرالحق صاحب ڈٹ گئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ جو آپ نے کہا اس کے ردعمل کا بھی آپ کو اندازہ ہے؟ تو اس پر نواز شریف صاحب طرح دے گئے کہ نہیں وہ تو میں نے ویسے ہی کہا۔ جناب نواز شریف صاحب نے قادیانیوں کو اپنا بھائی کہا۔ رحمت عالمؐ کے ازلی بدی مخالفین، ختم نبوت کے منکرین اور اہانت رسولؐ کرنے والوں کو اپنا بھائی کہنے کا کام جناب میاں صاحب نے ہی انجام دیا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ عالمی سطح پر یہود و نصاریٰ اس قانون کو تبدیل کرانے کے لئے سرگرم ہیں۔ اسی سلسلے میں امریکہ نے سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک سے دوسرے مطالبات کے علاوہ یہ مطالبہ بھی کیا

ہے اور اس کے عوض بھاری رقوم اور قرضے دینے کا لالچ دیا گیا ہے۔ اسی مطالبے کو پاکستان کے سامنے بھی رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے مشرف اور زرداری سے بھی ماضی میں یہ مطالبہ کیا جا چکا ہے لیکن ان کی جرأت نہیں ہوئی کہ اس قانون کو تبدیل کر سکتے۔

یہاں شرمناک بات یہ ہے کہ جب یہ بل سینٹ میں پیش ہوا تب کسی ایک ممبر نے بھی اس پر اعتراض کیوں نہ کیا؟ حکومت میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس قسم کے اسلام دشمن بل کی حمایت کی جائے اور ایسے اقدام کو تحفظ دیا جائے۔ اس وقت اپوزیشن کہاں تھی؟ اس نے اس وقت شور کیوں نہ مچایا؟

یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ حکومت کے حامی لوگوں نے اس مسئلے پر حکومت کو تحفظ دینے کے لئے سوشل میڈیا پر باقاعدہ مہم شروع کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حکومت کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے مجھے واٹس ایپ پر پیغام بھیجے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسے لوگ جو اس قانون کی بجائے حکومت کو تحفظ دینے میں لگے ہیں، وہ کل کو کس منہ سے نبی رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی امید رکھیں گے؟ خدارا! ہر قسم کی سیاسی وابستگی بھلا کر اس مسئلے پر ایک ہو جائیں۔ یہ صرف دینی جماعتوں کا کام نہیں ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے۔ حکومت کسی بھی پارٹی کی ہو، حکمران کوئی بھی ہو اگر اس قانون سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کرے تو اس سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے۔

کیا ملک میں کرنے کے لئے اور کوئی کام نہیں رہا؟ وطن عزیز تاریخ کے بلند ترین ریکارڈ قرضوں کے بوجھ تلے سسک رہا ہے۔ معیشت کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ بجلی اور پٹرول کے نرخ آئے دن بڑھائے جاتے ہیں، عوام کے خون پسینے کی کمائی کو الٹے سیدھ منصوبوں میں جھونکا جا رہا ہے۔ کروڑوں روپے لگا کر کرکٹ میچ کرائے جا رہے ہیں، ملکی سرمایہ بیرون ملک لے جایا جا رہا ہے۔ جس اینٹ کو اٹھاؤ وہاں سے کرپشن، سکینڈل اور لوٹ مار کا گند نکلتا ہے۔

اپنی حکومت میں ہوتے ہوئے اداروں سے پنگے لے رہے ہیں۔ اپنی ہی فوج کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کس بات کا خوف ہے جو ان کو بے حال کر رہا ہے؟ ترامیم ہی ترامیم، پھر جھوٹ کہ ہم نے تو کچھ نہیں کیا اور پھر معافی بھی مانگی جاتی ہے۔ جب کچھ نہیں کیا تو معافی کس بات کی؟

دوسری طرف عوام کو طفل تسلیاں دی جا رہی ہیں کہ ملک میں سب اچھا ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ واقعی ملک میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، سب سے بڑا مسئلہ یہ اقتدار کے بھوکے لیڈر اور سیاستدان خود ہیں۔

حال ہی میں خبر آئی ہے کہ آئی بی والوں نے ایک لسٹ جاری کی ہے جس میں ان اسمبلی ممبران کے

نام ہیں جن کا تعلق انڈیا، سی آئی اے اور افغانیوں سے ہے۔ اس بات کا ذکر اسمبلی میں بھی ہو چکا ہے۔

کبھی غور کریں، سوچیں کہ ان نصاریٰ کو اتنی جرأت کیوں ہوتی ہے کہ وہ ہمارے اتنے نازک دینی معاملے میں مداخلت کرتے ہیں؟

بے چارے پاکستان کے بھولے بھالے عوام اس خوش فہمی بلکہ خوفِ فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم آزاد ہیں اور کوئی قوم ہم کو غلام نہیں بنا سکتی۔ یہ جرأت بھی ہمارے بکاؤ لیڈروں نے ان کو دی ہے۔ ''زندہ باد، مردہ باد'' کے نعرے لگانے والے اس خوفناک حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ان کے لیڈروں نے امریکہ، آئی ایم ایف سے قرضے لے لے کر قوم کو یہودی ساہوکاروں کے پاس رہن رکھ دیا ہے۔ ہمارے پچھلے اور موجودہ حکمرانوں نے اتنے زیادہ قرضے لے رکھے ہیں کہ پاکستان اور پاکستان کی عظمت یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''جب حکومت نااہلوں کے ہاتھ آ جائے تو قیامت کا انتظار کرو''۔

ابن خلدون نے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب کسی قوم میں ناانصافی اور حقوق کی پامالی عام ہو جاتی ہے اور غریبوں کا خون اور ہڈیوں کا رس چوس چوس کر امراء اپنے شاہانہ ٹھاٹ پورے کرتے ہیں، وہ قوم اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ کوئی دوسری قوم حملہ کر کے اسے اپنا محکوم بنا لیتی ہے''۔

کیا یہ پاکستان کے حسب حال نہیں؟

پاکستانی عوام کچھ کم گناہگار نہیں لیکن ان کی کمر جس بوجھ نے توڑ دی ہے وہ حکمرانوں، سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے گناہوں کا بوجھ ہے۔ اقتدار کی کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ پر یہ سودی قرضے لٹا رہے ہیں اقتدار کی ہوس میں قوم، ملک اور اب دین کا سودا کرنے پر اتر آئے ہیں۔

کیا ہم دینی و ملی غیرت سے محروم ہو چکے ہیں؟

اگر ہم میں کچھ دینی و ملی غیرت و حمیت باقی ہے تو ایسے ہر حکمران، سیاسی و مذہبی لیڈر کو مسترد کر دیں جو ہماری دینی و ملی غیرت کا سودا کرنے کی کوشش کرے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی ایسا کرے گا، اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو گا اور انجام عبرت ناک ہو گا۔

عارف محمود

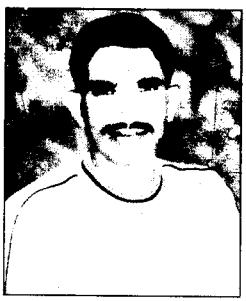

ایک پرندے سے مکالمہ

روہنگیا میں تو مسلمانوں پر غیر مسلم ظلم ڈھا رہے ہیں لیکن پاکستانی مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والے کون ہیں؟ پاکستانیوں کو مسلسل دہکتے ہوئے کوئلوں پر گھسیٹا جا رہا ہے۔ ابھی چند روز پہلے بجلی تین روپے 90 پیسے فی یونٹ کے حساب سے مہنگی کی گئی اور اب پیٹرول، ڈیزل اور مٹی کا تیل 4 روپے مہنگا ہو جانے پر مجھے جرمن نازیوں کی بدنام زمانہ گستاپو یاد آئی جس نے ٹارچر کے حیرت انگیز طریقے متعارف کرائے جن میں ایک یہ تھا کہ پٹ سن جیسی کسی شے کی رسّی اپنے شکار کے جسم پر جگہ جگہ مختصر وقفوں کے بعد ڈھیلے ڈھالے انداز میں یوں باندھ دیتے جیسے ہندو لڑکیاں راکھی باندھتی ہیں۔ بازوؤں، ٹانگوں، چھاتی پر رنگز کی شکل میں یہ باندھتے۔ لپیٹنے کے بعد ان پر پانی کی پھوار ڈالی جاتی تو کچھ دیر بعد رسّی کے وہ ڈھیلے سے رنگز آہستہ آہستہ سکڑنے لگتے۔ پھیلے انسانی کھال کو کاٹتے ہوئے یہ رسیاں گوشت میں دھنستی جاتیں۔ جتنی جگہ یہ رسی باندھی گئی ہوتی انسانی جسم اتنی گنڈیریوں میں ہی تقسیم ہو جاتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی نوبت کم ہی آتی۔ کیونکہ بڑے سے بڑا پھنے خان بھی پہلے مرحلہ پر ہی ناکردہ جرائم بھی تسلیم کر لیتا تھا۔

ہمارے حکمران بھی گزشتہ کئی عشروں سے ہمارے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔ معاشرہ کی بنیادی ساخت اور معاشی بنت ہی کچھ ایسی کر دی گئی ہے کہ پورا معاشرہ اک بہت بڑے ٹارچر سیل میں تبدیل ہو چکا

ہے۔ جہاں تمول اور فراوانی ہے۔ ان کے دیدوں سے پانی ڈھل چکا۔ کھاتے پیتے لوگ ہوائی دیدہ ہو چکے۔ ان کے دلوں سے رحم اور ہمدردی ہجرت کر چکی۔ ویسے بھی ہماری کھالیں کافی سخت اور موٹی ہیں۔ عام لوگ تو کیا دانشور ٹائپ لوگ بھی ترقی یافتہ ملک گھومنے جاتے ہیں تو سیٹیاں بجاتے جاتے، شاپنگ بیگز اٹھائے واپس آتے ہیں۔ آٹے میں نمک برابر بھی ایسے نہیں جو وہاں جا کر کڑھتے، جلتے، مرتے ہوں کہ یہ قوم کہاں پہنچ گئی۔ ہم کن گڑھوں میں پھنسے ہیں۔ ان کی ترجیحات کیا اور ہماری فخریہ پیشکش کیا؟

اصل میں ترجیحات ہی حیات ہیں اور یہاں جن کی اپنی زندگیاں، رہن سہن خوشگوار ہیں انہیں اس سے کوئی لینا دینا نہیں کہ بازار میں کوئی چیز کس بھاؤ بک رہی ہے۔ ملکی وسائل کی بے رحمانہ، ناجائز اور غلط تقسیم انسانی معاشروں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ جن کے پاس بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی کچھ نہیں۔ وہ بتدریج انسانیت، خودداری، عزت نفس کے مدارج سے نیچے گرتے پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ خوشامد، جی حضوری، کام چوری، گندگی وغیرہ ان کی خصوصیات قرار پاتی ہیں اور دوسری طرف جن کے پاس ڈھیروں دولت جمع ہو جائے وہ بھی انسانیت سے اس طرح گر جاتے ہیں کہ غرور، تکبر، سازش، عیاشی وغیرہ ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ قلت زر ہی نہیں کثرت زر بھی اتنی ہی تباہ کن ہے۔

جہاں تک انسان کی بنیادی ضروریات کا تعلق ہے وہاں ہم سب برابر ہیں کیونکہ سب کو سانس کے لئے آکسیجن، پیاس کے لئے پانی، بھوک کے لئے کھانا، سر پر چھت، بچوں کے لئے تعلیم، بیماریوں کے لئے علاج، ظلم کی صورت میں انصاف کی یکساں ضرورت ہے لیکن بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے۔ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے ہاں فی کس آمدنی میں ایسی چوکھی مہنگائی تو تاتاریوں اور نازیوں کے مظالم سے بھی بدتر ہے۔

ہماری ترجیحات، تربیت اور فوکس کا کیا حال ہے؟ حصول ثواب کے لئے رستے روکتے، وقت کسی کو رستے کے حقوق یاد نہیں آتے۔ عبادت محبوب کی پردہ پوشی سکھاتی ہے، ان کا کھوج نہیں لگاتی لیکن ہماری پسندیدہ پریکٹس کیا ہے؟ فرمایا۔ ''پیشہ ور (ہنرمند) اللہ کو پیارا ہے''۔ اور ہم ایک ایسے معاشرہ میں پروان چڑھتے ہیں جہاں کام کرنے والا کمی اور کمین، کچھ نہ کرنے والا چوہدری کہلاتا ہے۔ فرمایا: ''عاجزی کے ساتھ مانگنے سے بھوکا رہنا بہتر ہے''۔ حکمرانوں نے ہمیں قرضہ ایکسپرٹ بنا کر ہماری آئندہ نسلوں کو بھی نہ جانے کہاں کہاں رہن رکھ دیا اور کمال یہ ہے کہ بھوک نہ صرف بدستور قائم ہے بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

بدبختو! کچھ اور نہیں تو بھوک ہی برابر بانٹ دو کہ حکمرانوں کا فرض اوّلین ہی ملکی وسائل کی منصفانہ تقسیم

ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں بے شمار فائیو اور سیون سٹار فقنے نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ معزز بھی گردانے جاتے ہیں۔ فرمایا۔ ''جھوٹ تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے''۔

نواز شریف کو احتساب عدالت میں جاتے دیکھ کر مجھے ایک فلاپ انڈین فلم یاد آئی جس کا نام تھا ''چوروں کی بارات'' میں نے سر جھٹک دیا اور سوچا کہ اگر اس لاؤ لشکر کو کوئی نام دینا ہی ہے تو کرپشن کا جنازہ بہتر ہوگا۔

دوسری طرف وزیر داخلہ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے کیوں روکا؟ کسی کو نکالے جانے کی سمجھ نہیں آ رہی، کسی کو رد کے جانے کی سمجھ نہیں آ رہی، احسن اقبال کے دو جملے بھی مسلسل ہانٹ کر رہے ہیں۔

''کیا تماشا بنا ہوا ہے''۔ ''ریاست کے اندر ریاست نہیں چلے گی''۔ سبحان اللہ، صدقے جاواں اس ملک کے داخلے اور خارجے دونوں کا ہی جواب نہیں کہ ایک کی والدہ محترمہ ملکی تاریخ کے سفاک ترین آمر جنرل ضیاء الحق کی دست راست تھیں اور دوسرے کے والد ماجد جنرل صاحب کی مونچھ کے بال تھے اور یہی ڈکٹیٹر ''داخلے''، ''خارجے'' کے حالیہ آقا نامل شریف کا بھی موجد تھا۔ آج یہ تینوں ہی جمہوریت کے چیمپئن ہیں۔ کیونکہ بزرگوں کو وہ سوٹ کرتا تھا۔ ان کو یہ سوٹ کرتا ہے۔ چاہے احسان فراموشی کے ریکارڈ ٹوٹ جائیں، ریاست کے اندر ریاست بنانے اور تماشہ دکھانے کی بات احسن اقبال پر جچتی نہیں۔ کیونکہ (ن) لیگ تو ان وارداتوں کا سمبل ہے۔ یہ تو ریاست کے اندر ریاست بنانے کا تکلف بھی نہیں کرتے خود کو ریاست سمجھتے ہیں۔

دو گھروں کے قرب کی اس انتہا کے باوجود
تیرے دل سے میرے دل تک فاصلہ رہ جائے گا

یقیناً یہ تمام معاملات کسی طوفان کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ لگتا ہے کوئی آندھی آنے والی ہے۔ بڑے سے بڑے درخت اکھڑنے والے ہیں۔ ممکن ہے یہی کھیل کا آخری منظر ثابت ہو۔ مجھے اس طوفان کا رنگ تو نہیں دکھائی دے رہا، کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر ہواؤں کے تیور بتا رہے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کہتے ہیں کہ زلزلوں اور آندھیوں کا پتہ پرندوں کو پہلے چل جاتا ہے۔ کل شام میری ملاقات بھی ایک پرندے سے ہوئی۔ اس کے پر مٹی جیسے تھے اور پنجے کالے سیاہ تھے اور سر پر قلفی ٹوپی بھی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب کے جو طوفان آ رہا ہے اس میں صرف شاخیں اور تنے نہیں ٹوٹیں گے۔ درخت ہی جڑوں سے اکھڑ جائیں گے۔ منظروں میں دور دور تک اکھڑے ہوئے درخت، ٹوٹی ہوئی شاخیں، بکھرے ہوئے پتے، گرد آلود ہوائیں نظر آئیں گی لیکن اس مرتبہ ہر چیز کی ری سائیکلنگ کی جائے گی۔ اکھڑنے والے بڑے درختوں سے عام لوگوں کے استعمال کے لئے

فرنیچر بنایا جائے گا۔ درختوں کی جڑیں غریبوں کے چولہوں میں آگ جلانے کا کام دیں گی۔ ٹوٹے ہوئے پتے نئی فصلوں کے لئے کھاد کا کام کریں گے۔ اس پرندے نے بتایا کہ اس مرتبہ مالی ایسے درخت لگائیں گے جن پر چڑیلوں کا بسیرا نہیں ہوگا۔ جن کے سائے میں بھوت پریت نہیں ہوں گے اور نہ ان سایہ دار درختوں کا ثمر ایکسپورٹ کرنے دیا جائے گا۔ سارا ثمر گھر کے لوگ کھائیں گے۔

مگر اس خوبصورت منظر سے پہلے کے خوفناک منظر سے ڈر لگ رہا ہے کیونکہ جب طوفان آتے ہیں۔ آندھیاں چلتی ہیں تو پھر وہ کچھ تمیز نہیں کر پاتیں۔ ان کی بربادیاں ہر سمت تباہی بکھیر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ملک پاک کو ان تباہیوں سے محفوظ رکھے۔ بے شک بستیاں اجڑتی ہیں تو انہیں نئے سرے سے آباد کیا جاتا ہے۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت انداز میں اور زیادہ مضبوط بنیادوں پر۔ ممکن ہے اسی وجہ سے وہ پرندہ بار بار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میری برسوں کی زندگی گواہ ہے کہ جب بھی راتوں کو جنوں اور بھوتوں کا رقص ہوا۔ جب بھی سیاہیوں نے خوف کی فضا پیدا کی تو کوئی چراغ جل اٹھا۔ اس مرتبہ جو چراغ جلے گا، ان شاء اللہ وہ صبح تک جلتا رہے گا اور اس کی روشنی ہمارے راستوں کو منور کرتی رہے گی۔ اللہ کرم کرے، مجھے اس اندھیرے سے بھی بہت خوف آتا ہے جو چراغ تلے ہوتا ہے۔

دستگیر شہزاد

''حکایت'' کے معاون مدیر میاں محمد طاہر ابراہیم کو صدمہ

میاں محمد طاہر ابراہیم صاحب کے بڑے بیٹے مجید طاہر 14 ستمبر بروز جمعرات رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ان کی نماز جنازہ جامعہ مسجد منہاج القرآن میں ادا کی گئی۔ مرحوم معروف کالم نگار م۔ش کے داماد تھے۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ ان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ قارئین دعائے مغفرت فرما کے ثواب دارین حاصل کریں۔ (ادارہ)

اعلان

قارئین! ماہ اکتوبر سے ''حکایت'' کی قیمت میں دس روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اضافہ ہم نے نہایت مجبوری کے عالم میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پرچے کا سائز بڑھا دیا گیا ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ہمیشہ کی طرح تعاون فرمائیں۔ ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

''ستاروں بھری رات'' اس ماہ پیش نہیں کی جا رہی۔ وسیم رضا صاحب کینیڈا میں اپنے ملازمتی امور میں بے تحاشا مصروفیت کی وجہ سے قسط لکھ نہیں پائے۔ قسط 9: شمارہ نومبر میں پیش کی جائے گی۔ (ادارہ)

نقطہ نظر

حکم رب کا.....احتساب سب کا

آں را کہ حساب پاک است	از محاسبہ چہ باک است

نظام قدرت کی کسی کے ساتھ دوستی یا دشمنی نہیں، یہ ایک غیر جانبدار اور مؤثر نظام ہے جو بے لوث اور بے لاگ فیصلہ کرتا ہے۔

☆ سیّد ریاض الحسن سکواڈرن لیڈر (ر)

دنیا کے اندر انفرادی طور پر اور اجتماعی صورتِ حال میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے احتساب یا محاسبہ نہایت ضروری ہے۔ پاکستان میں ابتدا ہی سے اس پہلو پر مناسب توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے یہ ترقی کے میدان میں کافی پیچھے رہ گیا۔ اگرچہ ہر فرد اس کا ذمہ دار ہے لیکن حکومتی ارکان اس کے زیادہ ذمہ دار گردانے جاتے ہیں۔ نئے ملک کی تشکیل ایک عظیم کارنامہ ہے لہٰذا بانیانِ ملک نے اس کے وجود میں آتے ہی اپنی کارکردگی کے ثمرات وصول کرنا شروع کر دیئے۔ قائداعظمؒ کی صحت بہت خراب تھی اور حصول مقصد کے بعد ان کو مناسب علاج اور مکمل آرام کی ضرورت تھی۔ ان کی خوراک برائے نام رہ گئی تھی۔ آخری کئی ماہ تک انہیں ایسی جگہ رکھا گیا جہاں علاج معالجے کی مناسب سہولتوں کا فقدان تھا اور موسم کے لحاظ سے ان کو مناسب لباس بھی مہیا نہ کیا گیا۔ ان حالات میں وہ بطور گورنر جنرل اور پارلیمنٹ کے صدر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ زیارت میں اُن کے بیڈ پر فائلوں کا انبار لگا رہتا تھا جو ان کے معالج نے ہٹایا۔ مختلف فائلوں کو نپٹانا وزیراعظم کا کام تھا جس پر انہوں نے توجہ نہ دی۔ قائداعظمؒ کو اگر روزمرہ کے کاموں سے آزاد کر دیا جاتا تو وہ تشکیل آئین کے سلسلہ میں موزوں افراد کو ہدایات دے کر یہ بنیادی اور اہم کام سرانجام دے سکتے تھے جس کے بروقت نہ ہونے کی وجہ سے ملک بے شمار مسائل سے دوچار ہوا۔

ان حالات میں کوئی بھی کسی کا محاسبہ کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد حالات مزید ابتر ہو گئے۔ قائد ملت نے تمام سیاسی اور انتظامی اختیارات پر قبضہ کر لیا اور ضمنی انتخابات میں دھونس، دھاندلی اور جھرلو جیسے کارناموں کی ابتدا کی۔ کلی اختیارات کے حصول کی تگ و دو نے حالات مزید

خراب کر دیئے اور ہر کوئی اختیارات اور عہدوں کے پیچھے پڑ گیا۔ ہماری عدالتوں کو فعالیت کا خیال نہیں آیا اور از خود نوٹس لینے کا رواج نہیں پڑا تھا۔

ملکی آئین بنانے کی طرف کماحقہ توجہ نہ دی گئی اور برطانوی چھتری کے تحت حکومت کا عارضی نظام کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ تشکیل مملکت کے چار سال بعد وزیراعظم قائد ملت کے درجہ سے شہید ملت کے مقام پر فائز کر دیئے گئے اور مختلف عہدہ داروں نے من مانی شروع کر دی۔ اصولی طور پر تو وزیراعظم کی شہادت کے بعد ان کی کابینہ تو کالعدم ہو گئی اور نئے وزیراعظم کے لئے پارلیمنٹ کو فیصلہ کرنا چاہئے تھا لیکن وزیر خزانہ نے از خود ہی کالعدم کابینہ کا اجلاس منعقد کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود گورنر جنرل ہوں گے اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو وزیراعظم بنا دیا۔ کسی اللہ کے بندے نے اس کا نوٹس نہیں لیا کہ اس غیر قانونی کارروائی کے خلاف عدالت کا رخ کرتا لہٰذا جس کے ہاتھ میں جو لگا اس نے قبضہ کر لیا۔

وزیر خزانہ ملک غلام محمد گورنر جنرل بننے کے بعد بالکل ہی شتر بے مہار ہو گئے۔ اپنے طویل تجربہ، اعلیٰ تعلیمی قابلیت، مالی بدعنوانی سے پاک سروس، جرأت و بے باکی اور قائداعظمؒ کے معتمد خاص ہونے کی بنا پر انداز خاص سے حکومت سرانجام دینے لگے کیونکہ اکثر سیاستدان بدعنوان تھے اس لئے گورنر جنرل صاحب ان سے بری طرح پیش آتے اور ذرا ذرا سی بات پر سب کو بے نقط سناتے۔ سربراہ مملکت کے طور پر اپنے چار سالہ دور میں انہوں نے دو وزرائے اعظم برخاست کئے اور پارلیمنٹ بھی توڑ دی۔ عدالت عظمیٰ نے بھی ان کے اس اقدام کو نظریۂ ضرورت کے تحت جائز قرار دیا اور بظاہر ان کو من مانی کرنے سے کوئی روکنے والا نہیں تھا لیکن قدرت کے محاسبہ کا اپنا انتظام ہے، ان کے معتمد خاص محمد علی چوہدری وزیر خزانہ نے کمال ہوشیاری سے ان کی بیماری کی رخصت اور وزیر داخلہ جناب اسکندر مرزا کے قائم مقام گورنر جنرل بننے کے احکامات پر دستخط کروا لئے اور تقریباً ایک سال تک ان کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ اقتدار سے برطرف ہو چکے ہیں کیونکہ وہ گورنر جنرل ہاؤس کے رہائشی حصہ میں وہیل چیئر پر بیٹھے رہتے تھے اور کبھی کبھی ان سے زبانی احکامات حاصل کر لئے جاتے تھے۔ اتنا عرصہ قائم مقام گورنر جنرل عقبی دروازہ سے دفتر آتے جاتے تھے۔ جناب اسکندر مرزا نے محترم محمد علی چوہدری کو اس کارنامے کے سلسلہ میں وزیراعظم منتخب کرا لیا گیا۔ چوہدری صاحب نے چند ماہ کے اندر پاکستان کا پہلا آئین تشکیل دے کر نافذ کر دیا اور جناب اسکندر مرزا کو پاکستان کا پہلا صدر مملکت منتخب کرا لیا۔ انہوں نے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو ذلیل کر کے گورنر جنرل ہاؤس سے نکال دیا۔ انہوں نے بقیہ زندگی انتہائی کسمپرسی کی حالت میں بسر کی۔ وفات کے بعد انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہیں ہونے دیا اور وہ گورا قبرستان میں محوِ استراحت ہیں:

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اب حال ہی میں نااہل ہونے والے وزیراعظم اور (ن) لیگ کے سابق صدر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ احتساب صرف سیاستدانوں کا ہوتا ہے۔ یہ خیال انتہائی غلط اور اداروں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کا شاخسانہ ہے۔ سب سے پہلے جناب ملک غلام محمد کا محاسبہ ہوا اور ان کے معتمدین خاص نے ان کو رسوا کن حالات میں گورنر جنرل ہاؤس سے رخصت کیا۔ ان کی بعد کی زندگی اور موت اہل شعور کے لئے عبرت کا نشان ہے۔ ان سے ہاتھ کرنے والے چوہدری محمد علی سے بھی ایک سال بعد استعفیٰ لے لیا گیا اور بقیہ طویل عرصہ تک

پریشان حال زندگی بسر کرتے رہے۔ جناب اسکندر مرزا جو سول اور ملٹری انتظامیہ کے نہایت زیرک، شاطر اور تجربہ کار افسر تھے، ان کا بھی برا حشر ہوا۔ ان سے نہ صرف پسٹل پوائنٹ پر استعفیٰ لیا گیا بلکہ بغیر کسی قسم کی مراعات کے ملک بدر کر دیا گیا اور بعد از وفات انہیں ملک کی مٹی بھی نصیب نہ ہوئی۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں بڑے جہاں دیدہ اور طنطنے والے حکمران تھے، انہیں بھی نہایت خوار کر کے فارغ کیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان نے ملک میں پہلے عام انتخابات منصفانہ اور شفاف طریقے سے منعقد کرائے۔ انہیں بھی زبردست دباؤ کے تحت فارغ کر کے نظر بند رکھا گیا اور اسی حالت میں راہی ملک عدم ہوئے۔ آرمی چیف جنرل گل حسن اور ائر چیف ائر مارشل رحیم خاں کو بھی جبراً برطرف کر کے ایک لحاظ سے ملک بدر کیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق بھی قدرت کے احتساب کا نشانہ بن گئے۔ صدر غلام اسحاق خان جو اپنی ذہانت، تجربہ اور کارکردگی کی بنا پر نوکر شاہی کے مدار المہام گردانے جاتے تھے، ان کو بھی نہایت کسمپرسی کی حالت میں سبکدوش کیا گیا۔ صدر فاروق لغاری جو ایک جہاندیدہ بیوروکریٹ تھے، نہایت بے بسی سے ایوان صدر سے رخصت ہوئے۔ جناب کمانڈو صدر جنرل پرویز مشرف جو اعلیٰ پائے کے ہوشیار انسان ہیں، بچشم نم قبل از وقت رخصت ہوئے اور عرصہ سے غداری کے مقدمہ میں ملوث ہو کر جبری جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

لہٰذا یہ تصور کہ صرف سیاستدانوں کا ہی احتساب ہوتا ہے انتہائی گمراہ کن ہے۔ اس دنیا میں آئے دن مکافاتِ عمل کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے لیکن ہر کوئی خود کو بے گناہ اور دوسروں کو ہر برائی کا ذمہ دار گردانتا ہے۔ خود احتسابی کا احساس عنقا ہو کر رہ گیا ہے اور یہی ہمارا سب سے بڑا جرم ہے۔ اگر ہم لوگ اپنے اپنے اعمال اور جزا و سزا سے سبق حاصل کرنے کا وطیرہ اختیار کر لیں تو ہمارے کئی مسائل آسانی سے حل ہو جائیں۔ بحیثیت مسلمان ہمیں یہ یقین ہونا چاہئے کہ ہمارے ہر اچھے اور بُرے عمل کا اثر ہماری ذات پر ہوتا رہتا ہے اور ہمیں اس وقت یہ احساس ہوتا ہے جب اعمال کا فائنل نتیجہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اگر ہم ہمہ وقت اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور غلط کاموں کی بروقت اصلاح کرتے رہیں تو ہمیں غلط اعمال کی سزا سے محفوظ رہنے کا موقع مل جاتا ہے لیکن ہم قدرت کی مہلت سے غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے ہیں۔

ہمارے حال ہی میں نااہل ہونے والے سابق وزیراعظم جب پہلی دفعہ برطرف کئے گئے تھے تو انہیں احساس ہو جانا چاہئے کہ وہ عوام جن کے بل بوتے پر اب وہ نعرۂ مستانہ لگا رہے ہیں انہوں نے جناب کا ساتھ نہیں دیا تھا اور چند ہی ماہ کے بعد ہونے والے انتخابات میں ان کے مخالف کو اقتدار سونپ دیا تھا۔ دوسری دفعہ بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ پیش آیا لیکن جناب نے ان حالات سے سبق حاصل نہیں کیا۔ ان کے مخالف فریق کا بھی یہی حال ہے اور یہ ایک محکم کلیہ ہے کہ.....از مکافاتِ عمل غافل مشو!

نظام قدرت کی کسی کے ساتھ دوستی یا دشمنی نہیں، یہ ایک غیر جانبدار اور مؤثر نظام ہے جو بے لوث اور بے لاگ فیصلہ کرتا ہے۔ لہٰذا ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایک دوسرے پہ الزام تراشی کی بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور کوتاہیوں کا بروقت ازالہ کرتے رہیں۔

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

خصوصی فیچر

ٹرمپ کا زمانہ گیا

پاکستان امریکہ کا محتاج نہیں بلکہ امریکہ پاکستان کا محتاج ہے۔اس لئے پاکستان پر ناجائز دباؤ ڈالنے کا حربہ کامیاب نہیں ہوگا، الٹا امریکہ کو اس کا نقصان پہنچ سکتا ہے

☆ افضال مظہر انجم
afzaalmazhar@gmail.com

آج تک جتنے بھی امریکی صدور آئے اُن کا تعلق خالصتاً سیاست سے تھا اور اسی وجہ سے وہ بیرونی دنیا، عالمی سیاست سے باخبر رہتے اور تازہ ترین اعداد و شمار ان کی دسترس میں ہوتے یا وہ خود ہی اس کے بارے میں وسیع علم رکھتے تھے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے پیشرو اوباما، جارج بش، کلنٹن وغیرہ کی مثال سامنے ہے لیکن موجودہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا سیاست سے زیادہ واسطہ نہیں رہا اور وہ ایک بڑی کاروباری شخصیت تھے اور حادثاتی طور پر سیاست میں آئے، اس لئے مختلف اوقات میں ان کے خیالات مختلف رہے ہیں۔

2012ء میں فورٹ بیئر خطاب سے پانچ برس قبل ٹرمپ نے ٹویٹ کیا تھا کہ ہم ان افغانوں کو کیوں تربیت دے رہے ہیں جو پیچھے سے ہمارے ہی سپاہیوں کو گولی مار دیتے ہیں۔ افغانستان وقت کا ضیاع ہے، اب گھر واپسی کا وقت ہے۔ صدر بننے کے بعد اگست میں جنوب مشرقی ایشیا سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے ٹرمپ نے پاکستان سے متعلق نہایت سخت رویہ اختیار کیا بلکہ دھمکی آمیز حد تک چلے گئے کہ پاکستان ہمارے سے اربوں ڈالر لے کر ہمارے دشمن کو پناہ دیتا ہے۔ پاکستان نے دہشت گردوں کی مدد کی تو اسے بہت کچھ کھونا پڑے گا۔

امریکی صدر کو ہمیشہ ان کے آنکھ اور کان پینٹاگون اور سی آئی اے سیاسی اور فوجی مسائل پر بریفنگ دیتے ہیں اور اس کی روشنی میں صدر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے لیکن لگتا ہے کہ افغان جنگ میں کودنے کے 16 سال بعد بھی اس قسم کا سخت رویہ ان کے سیاسی بصیرت کی کمی کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ نائن الیون کے بعد امریکہ سپر پاور کے طور پر دنیا میں دندناتا پھر رہا تھا اور آج صورت حال یکسر مختلف ہے۔ سول سپر پاور

کو کئی ممالک للکارتے پھر رہے ہیں۔ اس موقع پر ایسے ممالک جن کے ساتھ اس کے تعلقات چار دہائی پرانے ہیں، کے ساتھ افہام و تفہیم کا رویہ اپنانے کی بجائے الٹا دھمکی کے لہجے میں بات کرنا خود امریکی مفادات کی نفی ہو گا۔ شاید اپنے ہم نواؤں بھارت، افغانستان کو خوش کرنے کے لئے ہی پاکستان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

اسی تقریر میں ایک طرف ٹرمپ نے کہا کہ پاکستان ہمارا سب سے بڑا اتحادی رہا ہے اور امریکی فوج کے ساتھ مل کر آپریشن میں حصہ لیا۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ پاکستانی قوم کو دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ہم ان کی قربانیوں اور خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف آج بھی یہی رٹ کہ ایٹمی ہتھیار کہیں دہشتگردوں کے ہاتھ نہ آ جائیں، چہ معنی دارد۔ امریکی صدر کے بیان پر ملک کے تمام حلقوں اور طبقوں کی طرف سے نہ صرف اس پر شدید ردِعمل سامنے آیا بلکہ اسے حیران کن کہا گیا۔ دفتر خارجہ کی طرف سے پاکستان میں دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہوں کا الزام مسترد کر دیا گیا اور کہا گیا کہ امریکہ محفوظ پناہ گاہوں کا الزام نہ لگائے اور دہشت گردی کے خلاف ہمارا ساتھ دے۔ پاکستان کی قربانیوں کو نظرانداز کرنا مایوس کن ہے۔ قومی اسمبلی نے بھی تمام الزامات کو مسترد کرتے ہوئے متفقہ طور پر قرارداد منظور کی کہ امریکہ کے ساتھ احتجاجاً افغان جنگ کے لئے بری اور فضائی رسد کے تمام راستے معطل کئے جائیں۔ ملک کے اہم سیاسی لیڈروں کی بجائے چیف آف سٹاف جنرل قمر جاوید باجوہ کا بھی ترکی بہ ترکی بیان آیا جس میں امریکیوں پر واضح کیا کہ پاکستان کو کسی قسم کی امریکی مالی یا مادی امداد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کا اعتماد چاہئے۔ پاکستان کی قربانیوں کا اعتراف کیا جائے کہ افغان امن کے لئے بہت کچھ کیا۔

اس سے ایک ماہ پہلے بھی امریکی سینیٹر جان میکین کی سربراہی میں پانچ رکنی سینیٹرز کے وفد نے پاکستان اور افغانستان کا دورہ کیا اور افغانستان پہنچنے کے بعد جان میکین نے یہ بیان داغا کہ ہم حقانی نیٹ ورک کے خلاف کارروائی چاہتے ہیں۔ پاکستان پر واضح کر دیا کہ رویہ بدلے۔ لگتا ہے کہ امریکی صدر کی پالیسی کے اعلان سے پہلے جان میکین کو پاکستانی حکام کا رویہ چیک کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن آپس میں دست و گریبان سیاسی قیادت نے غالباً امریکی وفد کو سخت لہجے میں جواب نہیں دیا۔ معلوم نہیں کون سی مصلحتوں کی خاطر۔

دہشت گردی سے لرزتا اور سلگتا پاکستان

نائن الیون کے بعد ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت سے جہاں اسامہ بن لادن چھپے ہوئے تھے، امریکی دباؤ کا نشانہ ہمیں ہی بننا پڑا۔ اس وقت حالات ہی ایسے تھے کہ سب سے پہلے کروڑوں کی تعداد پر مشتمل ایٹمی طاقت کو بچانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ پاکستان پر یہ بڑا نازک وقت تھا کہ سامنے بھی دشمن یعنی ہر محاذ پر پاکستان مخالف بیٹھا ہوا، اندرون ملک چھپے آستین کے سانپ سامنے آئے بغیر وار کر کے ملک کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے۔ افغانستان سے نبردآزما کچھ لوگ قبائلی علاقہ میں چھپ جاتے، اسی علاقہ میں انڈین ایجنٹوں کی کافی تعداد افغانستان میں طالبان سے نبردآزما ہونے کی بجائے 'پھنسے ہوئے' پاکستان میں مزید افراتفری پھیلانے لگی کہ نام تو دہشت گردوں کا ہی لگے گا۔ اوپر سے امریکی سرکار کا ڈومور کا ہر روز نیا مطالبہ۔ شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ایسا

ہو کہ جس نے چاروں محاذ پر اتنی بڑی اور پیچیدہ جنگ لڑی ہو۔ یہ کریڈٹ پاکستان آرمی کو ہی جاتا ہے کہ وہ نہایت نامساعد حالات کے بعد آہستہ آہستہ ملک کو دہشت گردی کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہوئی۔ اربوں ڈالر کے معاشی نقصان کے علاوہ 10 ہزار سے زائد شہریوں بشمول آرمی، سیکورٹی فورسز، پولیس اور عام شہریوں کو ملک کے تحفظ کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ اس کا اعتراف وقتاً فوقتاً نہ صرف امریکی اعلیٰ قیادت جارج بش، بارک اوبامہ، امریکہ میں مقیم افواج کے کمانڈر کے علاوہ پینٹاگون کے اعلیٰ فوجی حکام بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ریکارڈ میں شامل ہے۔ گو پاکستان کو ڈومور کے ان مطالبات میں کچھ ناگوار کام بھی کرنے پڑے لیکن اپنی سالمیت و خودمختاری کو قائم رکھنے اور اپنی اثاثوں کو بچانے کے لئے یہ ضروری تھا۔ بہرحال پاکستان اپنی سالمیت پر کسی صورت آنچ آئے بغیر امریکی ناروا شرائط پر بھی عمل کرنا پڑا۔ یہی وقت کا تقاضا تھا۔ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے پاکستان نے جو اقدامات کئے اس کے عالمی اور امریکی ادارے بھی معترف ہیں۔

☆..... 2015ء میں دہشت گردی میں 48 فیصد اور ہلاکتوں میں 38 فیصد کمی۔

☆..... 2016ء کے دوران دہشت گرد حملوں میں 28 فیصد کمی آئی۔

☆..... دسمبر 2016ء میں برطانوی جریدے نے کراچی کو چھٹے نمبر کی بجائے 31ویں نمبر پر خطرناک قرار دیا۔

☆..... امریکی محکمہ خارجہ کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 2014ء کے بعد دہشت گردی میں 70 فیصد کمی واقع ہوئی۔ امریکہ کا انسداد دہشت گردی سینٹر جو نیشنل انٹیلی جنس کا حصہ ہے، دنیا بھر میں دہشت گرد حملوں کے اعداد و شمار اکٹھے کرتا ہے۔ اس سینٹر کے مطابق پاکستان دہشت گردی سے متاثر 100 ممالک میں تیسرے نمبر پر آ گیا ہے جہاں امن و امان کی صورت حال بتدریج بہتر ہوئی ہے۔ 2012ء تک پاکستان اس فہرست میں سرفہرست تھا۔ جبکہ افغانستان، نیپال، بھارت اور نائیجیریا بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ امریکی محکمہ خارجہ کی رپورٹ جو اگست 2016ء میں سامنے آئی، کے مطابق بنگلہ دیش میں 2014ء کے مقابلے میں 2015ء میں دہشت گردی 400 فیصد زیادہ ہوئی۔

حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کہاں ہے؟

امریکی ہر مرتبہ پاکستان کو پریشرائز کرنے کے لئے یا شاید دباؤ میں رکھنے کے لئے حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کا واویلا کھڑا کرتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان نیٹ ورک کا وجود کہاں پایا جاتا ہے اور کبھی اس نیٹ ورک کے لوگ دہشت گردی میں ملوث رہے ہیں؟ جنرل (ر) راحیل شریف کے زمانے میں قبائلی علاقے میں جو زبردست آپریشن شروع کیا گیا تھا۔ اس نے دہشت گردوں کی موجود تھوڑی بہت تعداد کی بھی کمر توڑ کے رکھ دی تھی اور اس نیٹ ورک کے تھوڑے بہت بچے کھچے لوگ ایران افغانستان بھاگ گئے تھے یعنی پاکستانی علاقہ میں ان لوگوں کا وجود نہیں تھا اور آزاد قبائلی علاقہ اب پاکستانی حدود میں شامل ہو چکا ہے۔ دہشت گردوں کا وجود یا پناہ گاہیں اس قبائلی علاقہ میں تھیں اور اب وہ بھی ان سے آزاد کرا لیا گیا ہے۔ یہ پاکستانی فوج کی تاریخی کامیابی ہے۔ حقانی نیٹ ورک کے کئی لیڈر افغانستان میں امریکی آپریشن کے دوران مارے گئے۔ جولائی

میں آئے امریکی سینیٹرز کے وفد کو بھی اس بات سے آگاہ کیا گیا تھا۔ امریکی سینیٹرز نے پاکستان کی کی گئی انسداد دہشت گردی کی کوششوں کو سراہا لیکن ٹرمپ کی طرف سے دوبارہ حقانی نیٹ ورک کا شوشا اٹھانا سمجھ سے بالاتر ہے۔ حالانکہ حقانی نیٹ ورک کے زیادہ لیڈر افغانستان میں امریکیوں کے ہاتھوں ہی مارے گئے ہیں۔

پاکستان میں دہشت گرد افغانستان سے آتے ہیں

پاکستان کے دہشت گردوں کے خلاف سخت ترین اقدامات کرنے اور ان کی پناہ گاہیں تباہ کرنے کے بعد زیادہ تر دہشت گرد افغانستان سے آ رہے ہیں۔ لاہور کے دھماکے ہوں یا بلوچستان میں ہونے والے دھماکے ان کے ماسٹر مائنڈ اور ان کے کارندے اسی سرزمین سے وارد ہوئے۔ پاکستان کے علاوہ افغانستان میں ہونے والی دہشت گردی میں ملوث دہشت گردوں کی پناہ گاہیں افغانستان میں ہی ہیں۔ ایک سیدھی سادی حقیقت سے امریکیوں کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔

جب کسی بھی ملک میں کوئی غیر ملکی فوج غاصبانہ قبضہ جمالے اور طاقت اور دھونس کی وجہ سے لمبا عرصہ اس ملک میں ڈیرے جمائے رکھے تو یہاں کے باشندوں اور محب وطن اور حساس عوام کیا ہاتھ پر ہاتھ دھری بیٹھی رہے گی؟ افغانستان کا چالیس فیصد حصہ امریکیوں کے قبضہ میں ہے اور ساٹھ فیصد پر طالبان وغیرہ قابض ہیں اور یہ بہت زیادہ بڑی افرادی قوت رکھنے والے لوگ ہیں۔ اگر امریکی آئے روز اپنی طاقت کے زعم میں یہاں اپنا قیام بڑھانے کے لئے فوجی طاقت، فضائیہ اور بری افواج کا کھلا مظاہرہ کر رہے ہیں تو ساٹھ فیصد علاقہ پر قابض یہاں کے اصلی باشندے بھی ہر ممکن طاقت سے اسے روکنے کی کوشش میں ہیں۔ یعنی امریکہ کے خلاف تمام مزاحمت افغانستان سے ہی ہو رہی ہے۔ اسے امریکہ دہشت گردی کا نام دے رہا ہے تو علیحدہ بات ہے۔ پاکستان نے تو افغانستان سے ملحقہ اپنے تمام بارڈر سیل کئے ہوئے ہیں اور پاکستان کو کسی دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہمیں تو اپنا ملک بچانا ہے کیونکہ افغان جنگ افغانیوں اور امریکیوں کے درمیان ہے۔ یہی مزاحمت امریکیوں نے افغانیوں سے مل کر روسیوں کے خلاف بھی کرائی اور اب اگر امریکی قابض ہیں تو یہ ساری مزاحمت ملک کے اصل باشندے انہی کے خلاف کر رہے ہیں۔

ایک لاکھ فوج کیا جھک مارتی رہی ہے

2001ء میں افغانستان میں وارد ہونے والی ایک لاکھ کی نیٹو افواج جس میں اکثریت امریکی افواج کی تھی، عرصہ دراز سے ٹینک، میزائل اور فضائیہ رکھنے کے باوجود اگر طالبان کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو اس سولہ سال کے طویل عرصہ کے دوران یہ امریکی فوج کی نااہلی، مس مینجمنٹ ظاہر کرتی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا سے متعلق پالیسی سے پہلے سی آئی اے اور پینٹاگون کے فوجی حکام پر برسنے کے بعد کہ تم لوگوں نے (امریکی فوج نے) امریکہ کے سینکڑوں سپوت بھی قربان کرا دیئے۔ ایک ہزار ارب ڈالر کی رقم بھی اس جنگ میں جھونک دی گئی لیکن مطلوبہ نتائج حاصل نہ کئے جا سکے۔ اس پر دنیا کی اس بہادر فوج نے اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے گزشتہ کی طرح گھڑی گھڑائی توجیہہ پیش کی کہ دہشت گردوں کی پناہ گاہیں پاکستان میں ہیں تو ایک لاکھ امریکی فوج

جس کی آج تعداد 10 ہزار سے زائد ہے اور تین لاکھ تربیت یافتہ افغانی فوج بھی اس کے ہمراہ ہے، اپنے مقاصد کے حصول میں بُری طرح کیوں ناکام ہوئی؟ من حرامی بجتاں دا ڈھیر کے مترادف ہے۔

ٹرمپ کی اربوں ڈالر دینے کی ڈینگ

اپنی تقریر کے دوران ٹرمپ نے یہ ڈینگ بھی ماری کہ پاکستان ہم سے اربوں ڈالر لے کر ہمارے دشمن کو پناہ دے رہا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ سولہ سال کے طویل عرصہ میں دہشت گردی کی وجہ سے پاکستانی معیشت کو 123 ارب 13 کروڑ ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ نے پاکستان کو 22 ارب سے 24 ارب ڈالر کی رقوم فراہم کیں جس میں اڑھائی ارب ڈالر کا فوجی سازوسامان، اسلحہ، طیارے و ہیلی کاپٹر شامل تھے۔ ٹرمپ محدود امداد دے کر کس بات کا احسان جتلا رہے ہیں۔ یہ امداد پاکستان کے مجموعی مالی نقصان کا صرف 20 فیصد تھی۔ یہ تھوڑی بہت امداد امریکہ نے اپنے سمندر سے لے کر افغانستان تک جانے کے لئے بری راستہ کو محفوظ بنانے کے لئے دی تا کہ امریکی بھاری اسلحہ و گولہ بارود محفوظ طریقے سے منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ اس کے لئے پاکستان کے کئی ائربیس بھی استعمال کئے گئے۔

امریکی فوج کا لامحدود مدت تک قیام، دال میں کچھ کالا ہے

خطہ کے لئے امریکی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکہ کی فوج کے افغانستان میں لامحدود مدت تک کے قیام کا اعلان کیا ہے جو انتہائی معنی خیز ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے سابق امریکی صدر اوبامہ پوری دنیا کے سامنے افغانستان سے امریکی افواج کے مکمل انخلا کا اعلان کر چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک لاکھ امریکی فوج جدید قسم کے اسلحہ و فضائیہ سے لیس طالبان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تو محض 8400 فوجی کون سا ایسا تیر مار لیں گے جس کی وجہ سے ٹرمپ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالات و واقعات اس حقیقت کو آشکارا کر رہے ہیں کہ چین پاکستان کے درمیان عظیم معاشی منصوبہ سی پیک کو سبوتاژ کرنے کے لئے ہی یہ سارا ڈرامہ کیا جا رہا ہے۔ دوسرے امریکہ پاکستان کو چین روس سے روابط بڑھانے سے باز رکھنے کے لئے کوشاں ہے لیکن اس کے لئے اقدامات منفی کر رہا ہے۔

سی پیک منصوبہ کو ناکام بنانا انڈیا امریکہ دونوں کا مشترک مفاد ہے۔ حالانکہ یہ کوئی دفاعی نہیں خالصتاً معاشی منصوبہ ہے جس میں سڑکوں و پاور پراجیکٹس کی تعمیر شامل ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے درجنوں ممالک ہوں گے۔ امریکی پالیسی سامنے آنے یعنی پاکستان کو دھمکی دینے کے بعد چین اور روس کا اس کے خلاف ردِعمل آیا حتیٰ کہ برکس تنظیم کے اجلاس سے قبل چین نے واضح طور پر پاکستان کا دفاع کرنے کا اعلان کیا اور بھارت کو برکس اجلاس میں پاکستان پر دہشت گردی کے الزامات عائد کرنے سے بھی روک دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ چین بہ نظرغور ساری صورت حال کا جائزہ انتہائی سنجیدگی سے لے رہا ہے اور اس موقع پر امریکہ کا ڈرامہ یا گیدڑ بھبکی اور ساتھ ہی فوج کے لامحدود قیام کا اعلان، چین معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کل امریکہ خود یا انڈیا کے ذریعے علاقے میں کسی قسم کی

جنگی کارروائی کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ صریحاً سی پیک منصوبے میں رکاوٹ کے لئے ہوگا اور یہ منصوبہ چین کا ہی ہے جس نے منصوبہ میں 41 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرنی ہے اور اس کے زیادہ فوائد بھی اسے ہی حاصل ہوں گے۔ اس عظیم منصوبہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ کے خلاف چین سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا ہوگا۔

صدر ٹرمپ کی اس پالیسی کو خود امریکہ میں بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ امریکی میڈیا اور تھنک ٹینکس نے خبردار کیا ہے کہ پاکستان کو تنہا کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں افغانستان کی صورتِ حال خراب ہوسکتی ہے۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ آرٹیکل میں لکھا ہے کہ امریکی پالیسی سازوں نے ماضی میں بھی اس طرح کی تجاویز دیں اور پھر انہیں خود ہی مسترد کردیا۔ امریکی امداد کی بندش کی صورت میں چین کی صورت میں پاکستان کا ایک طاقتور حلیف اور اتحادی موجود ہے اور ایسا کرنے سے چین کو اس خلا سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ اخبار نے یہاں تک لکھا ہے کہ پاکستان کے خلاف اقدامات سے افغانستان کی صورت حال مزید خراب ہوگی۔ امریکی تھنک ٹینک یو ایس انسٹیٹیوٹ آف پیس نے بھی کہا ہے کہ امریکہ پاکستان کو اہم شراکت دار ملک سمجھتا ہے اور دہشت گردی کے خلاف اس کی قربانیاں بھی بے بہا ہیں۔

سی آئی اے کے سابق چیف نے بھی امریکی پالیسی کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ سی آئی اے کے سابق سربراہ مائیکل مورپل نے واضح کیا ہے کہ پاکستان امریکہ کا نہیں، ہم اس کے محتاج ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں مائیکل مورپل نے کہا ہے کہ امریکہ کا پاکستان پر ناجائز دباؤ کا حربہ کارگر نہیں ہوگا البتہ اس دباؤ سے امریکہ کو نقصان پہنچ سکتا ہے پاکستان کو نہیں کیونکہ پاکستان امریکی امداد سے آزاد ہو چکا ہے۔ اسے چین جیسے دوست کی امداد حاصل ہے اور امریکہ پاکستان کے فضائی اور زمینی راستوں کا محتاج ہے جس کے تعاون کے بغیر امریکہ یہ جنگ جیت ہی نہیں سکتا۔ صدر ٹرمپ کی پالیسی واضح نہیں ہے۔

امریکی میڈیا اور سی آئی کے سابق سربراہ کے بیانات اور تجزیوں سے ٹرمپ انتظامیہ کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں لیکن نہ جانے کون سی پٹی انہوں نے آنکھوں پر باندھی ہوئی ہے کہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آ رہے۔ مستقبل قریب میں سی پیک منصوبہ پورے زور وشور سے شروع ہونے کا امکان ہے اور اگر اس منصوبہ میں امریکہ بھارت کسی بھی قسم کی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کریں گے تو چین اس کا انتہائی سخت نوٹس لے گا۔ روس اور چین امریکہ کو افغانستان سے اپنی فوج کے انخلا کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں۔

امریکہ نے اگر سی پیک کے مسئلہ پر چین سے محاذ آرائی کی کوشش کی تو یہ کسی خوفناک تصادم میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ امریکہ اپنی واحد سپر پاوری کے زعم میں اپنی ضد پر اڑا رہا تو آئندہ اس کے سامنے کھڑا ہونے والا چین وہ نہیں ہوگا جسے دنیا عرصہ دراز سے دیکھتی چلی آ رہی ہے۔ امریکہ کو اس مسئلہ پر لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ یہ امریکی مفاد میں ہی ہے کہ اپنی باقی ماندہ فوج کو باعزت واپس بلا لے اور افغانستان کی قسمت کا فیصلہ یا یہاں حکومت کے قیام کا فیصلہ جمہوری روایات کے مطابق اسی ملک کے باشندوں کو ہی کرنے دیا جائے، اسی میں ہی اس کی اور افغان عوام کی بہتری ہے۔

❁❁❁

ایک تاثر ایک کہانی

بیچ کی دیوار

حسن رضا کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر نیچے گر گئی اور انہیں محسوس ہوا کہ بیچ کی دیوار اچانک ڈھے گئی اور اس کے بوجھ تلے ان کا جسم، ان کا دل، ان کا دماغ اور ان کی روح سب کچھ چکنا چور ہو گئے۔

☆نسیم سکینہ صدف

پورے دس دن ہو گئے تھے، فساد کی آگ جو بھڑکی تو بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ سارے شہر میں سخت کرفیو کے باوجود وارداتیں ہو رہی تھیں۔ پوری دس راتیں آنکھوں میں گزر گئیں۔ اس قدر شور شرابے میں نیند کس کو آتی ہے۔ پھر ہر وقت یہ ڈر کہ فسادی حملہ نہ کر دیں۔ یوں تو پہلے ہی سب کچھ لٹ چکا تھا لیکن جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور اس سے بھی پیاری اولاد۔ حسن رضا اور ان کی بیگم اپنی دو بیٹیوں کو گلے لگائے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے رہتے کہ خدایا ان معصوم بچیوں پر کوئی آنچ نہ آئے چاہے ہماری تکا بوٹی کر دی جائے۔

بڑی لڑکی عفا ہائی سکول پاس کر کے انٹر میں داخل ہوئی تو جوانی میں قدم رکھتے ہی اس پر ایسا نکھار آیا کہ پورے محلے والوں کی نظروں میں سما گئی۔ کالج کے منچلے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ آس پاس کیا دور دراز سے بھی کئی پیغام آئے لیکن حسن رضا انکار کر دیتے کہ ابھی بچی پڑھ رہی ہے اور میں اس کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا ہوں۔ خدا نے بیٹا نہیں دیا تو کیا، یہ میری بیٹیاں ہی بیٹوں سے بہتر ہیں۔

لیکن عفا کی جوانی نے ماں باپ کی آنکھوں سے نیند چھین لی تھی اور دن بدن ایک عجیب سا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا اور پچھلے دس روز سے تو وہ صرف عفا کی فکر ہی میں اتنے پریشان تھے کہ کوئی موت سے بھی اتنا پریشان نہ ہو گا۔ ویسے کئی مرتبہ حسن رضا نے اپنی دونالی بندوق نکال کر اس کی صفائی کی تھی اور پرانے کارتوس کو دھوپ دکھائی تھی۔ وہ روزانہ کارتوس گن گن کر رکھتے تھے۔ کُل نو کارتوس تھے۔ انہوں نے اچھی طرح سوچ رکھا تھا کہ اگر فسادی آتے ہیں، پہلے تو صدر دروازہ ہی آسانی سے نہیں ٹوٹ سکے گا۔ اگر دروازہ ٹوٹ بھی جاتا ہے اور وہ اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہیں تو حسن رضا عفا

کو اپنے ساتھ ہی رکھیں گے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا آٹھ کارتوسوں سے فسادیوں کا مقابلہ کریں گے اور اگر فسادی بھاگے نہ پھر نواں کارتوس عفا کی عزت بچانے کے لئے کافی ہوگا۔

لیکن آج انہیں عفا کی کم اور اپنی چھوٹی بیٹی شزا کی زیادہ فکر تھی۔ شزا سات آٹھ سال کی تھی اور اپنی توتلی زبان میں اتنی پیاری پیاری باتیں کرتی تھی کہ سبھی اس کے گرویدہ تھے لیکن پچھلے تین دن سے وہ بخار میں مبتلا تھی۔ دوائی تو درکنار، کھانے کے لئے ایک دانہ بھی باقی نہ رہا۔ حسن رضا ہمیشہ ذخیرہ اندوزی کے خلاف تھے اور کبھی انہوں نے مستقبل کی فکر نہ کی تھی لیکن اب بے حد پچھتا رہے تھے۔ کاش! پہلے ہی سے ایک ادھ بوری آٹا اور چاول وغیرہ جمع کر لیتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ اس کرفیو میں بجلی اور پانی کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا تھا۔ اب تو پینے کا پانی بھی بمشکل تمام فراہم ہو پا رہا تھا اور پھر رہ رہ کر شزا کا دل دوز آواز کے ساتھ کھانا مانگنا حسن رضا اور ان کی بیگم کو جس قدر بھی بے چین کر سکتا تھا کر دیتا۔ آج تک انہوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے تھے۔

زمینداری ختم ہوئی، جائداد کے ہوارے ہوئے، حسن رضا کے حصے میں ایک پرانا مکان اور چار چھوٹی چھوٹی دکانیں آئیں جن کا برائے نام کرایہ ہی ان کا ذریعہ گزر اوقات تھا۔ انہوں نے اس پر ہی اکتفا کیا لیکن اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے کے ناطے انہوں نے ضد کر کے اپنے بزرگوں کی نشانی یہ دو نالی بندوق اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ کتنے بھی اتار چڑھاؤ آئے، ایک ایک کر کے گھر کی سبھی قیمتی چیزیں سستے داموں بک گئیں۔ فاقوں تک کی بھی نوبت آئی لیکن انہیں اپنی آبائی شان و شوکت کی نشانی اس دو نالی بندوق کو بیچنے کا خیال نہیں آیا مگر آج وہ اپنی شزا کی بھوک کی خاطر اپنی جان بھی بیچنے کو تیار تھے۔ وہ فقیروں کی طرح بھیک مانگ کر بھی اپنی بچی کا پیٹ بھرنا چاہتے تھے لیکن باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ کرفیو نے سخت شکل اختیار کر لی تھی۔ دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکامات جاری ہو گئے تھے۔ باہر پولیس کی جیپ گزرتی تو لاؤڈ سپیکر پر یہی اعلان کرتی کہ کوئی بھی گھر سے باہر نہ نکلے۔ آس پڑوس میں سبھی ہندوؤں کے مکان تھے۔

یوں تو حسن رضا کے تعلقات سبھی سے اچھے تھے لیکن اس فساد نے تو دلوں میں دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ کس پر اعتبار کیا جائے، ان کے گھر کی دیوار کے اس طرف پنڈت رتن لال رہتے تھے، ان کی بچی بھی شزا کے ساتھ ایک ہی سکول میں پڑھتی تھی۔ دونوں میں اس قدر دوستی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی رہنا گوارا نہ تھا۔ اوشا کی گڑیا اور شزا کا گڈا جن کی کئی بار شادی رچائی گئی تھی، آج الگ الگ تھے۔ اوشا ادھر رو رو کر شزا کے گھر جانے کی ضد کر رہی تھی لیکن پنڈت رتن لال خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ حسن رضا مسلمان تھا۔ ویسے تو بھلا آدمی تھا لیکن فساد میں تو سب ایک ہو جاتے ہیں۔ نعرہ تکبیر کی آواز کان میں پڑتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو اس کے گھر بھیجوں اور وہ اس کا گلا دبا دے تو کیا ہوگا۔ وہ اپنی بیٹی کو بہت سمجھاتے لیکن اس کی ضد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ادھر شزا کی بھی حالت غیر ہو رہی تھی، حسن رضا کی بیگم اور عفا رونے لگی۔ حسن رضا انہیں دلاسا تو دیتے رہے لیکن خود ان کی آواز بھی بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ان کی دیوار پر آہٹ ہوئی، رات کافی ہو چکی تھی، کوئی ان کے گھر کی دیوار توڑ رہا تھا۔

دیوار کے اس طرف پنڈت رتن لال کا مکان تھا۔ حسن رضا نے اپنی بندوق کس کے پکڑ لی اس میں کارتوس بھر دیئے اور خطرے سے نکلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے بیگم سے کہا کہ وہ شزا کو لے کر

دوسرے کمرے میں چلی جائیں اور عفا کو اپنے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔

مجھے رتن لال سے ایسی امید نہ تھی'' وہ بڑبڑائے۔ ''کہ وہ فسادیوں کو اپنے گھر سے میرے گھر میں داخل کرے گا۔ یہ کمینہ ویسے تو بہت پیار جتاتا تھا، آج اس نے اپنا کمینہ پن دکھا ہی دیا''۔

حسن رضا نے مستحکم ارادہ کر لیا کہ فسادیوں کے اندر گھستے ہی وہ گولی چلا دیں گے چاہے ان میں رتن لال ہی کیوں نہ ہو۔ جب اس کو دوستی کا پاس نہیں تو میں کیوں ہچکچاؤں۔

دیوار کے پیچھے سے کدال کی ضربیں لگ رہی تھیں اور ہر ضرب کے ساتھ حسن رضا کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ عفا ان کے پیچھے سہمی ہوئی زخمی فاختہ کی طرح کانپ رہی تھی۔ پرانے زمانے کی دیوار اتنی آسانی سے گرنے والی نہیں تھی۔ ایک جگہ سے چونا اکھڑنا شروع ہوا۔ حسن رضا دیوار کے بالکل قریب آ گئے۔ بہت دیر کے بعد دیوار کی ایک اینٹ گھر میں گری اور آر پار ایک سوراخ ہو گیا۔ حسن رضا نے للکار کر کہا۔

''خبردار! اگر کسی نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا''۔ اور انہوں نے بندوق کی نال اینٹ نکلے ہوئے سوراخ پر لگا دی لیکن دوسرے ہی لمحے اوشا کی آواز نے چونکا دیا۔

''حسن چاچا! میں شزا کے لئے کھانا لائی ہوں''۔ اور اسی سوراخ میں سے ایک ٹفن حسن رضا کی طرف بڑا دیا۔

حسن رضا کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر نیچے گر گئی اور انہیں محسوس ہوا کہ بیچ کی دیوار اچانک ڈھے گئی اور اس کے بوجھ تلے ان کا جسم، ان کا دل، ان کا دماغ اور ان کی روح سب کچھ چکنا چور ہو گئے۔

❁❁❁

ISO 9001:2008
النور فینز
رجسٹرڈ
النور الیکٹرک انڈسٹریز B-75، سمال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات
053-3530447 , 0300-9702203 , 0345-6333393
http://www.alnoorfans.com

ضربِ سکندری

سولجرنامہ

سعودی عرب میں تین سال

ہمارا پروگرام تقریباً مکمل ہوگیا۔ دو ماہ ہم مختلف موضوعات پر ہالینڈ ڈیوٹی فری مارکیٹ سے لیٹر بازی کرتے رہے۔ ہمارا موضوع بحث یہ تھا کہ کار کون سی لیں۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ یورپ کے لئے سپیشل ماڈل ہوتے ہیں اور اگر یہ سچ ہے تو پھر پاکستان میں ان پر ڈیوٹی بہت زیادہ ہوگی۔

☆ سکندر خان بلوچ balochsk@yahoo.com قسط: 19

شیخ چلی کے تعاقب میں

پیسہ آتے ہوئے کسے برا لگتا ہے اور سعودی عرب میں تو ریالوں کی کشش انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ بعض ہم وطنوں کو اس لالچ میں نا قابلِ یقین پستی میں گرتے دیکھا۔ یقین نہیں آتا کہ پڑھے لکھے اور معزز انسان ریالوں کے لالچ میں اس قدر پست اخلاقی حرکتیں بھی کر سکتے ہیں۔ بہر حال جو مشاہدہ دیکھنے میں آیا وہ کافی عبرتناک ہے۔

ہمارا تین سال کا عرصہ ایک طویل قید معلوم ہوتا تھا۔ صحیح پوچھئے تو یہ ریالوں کی چمک تھی جس نے تین صبر آزما سال وہاں گزارنے پر مجبور کیا۔ مادی خواہشات اور دنیاوی مجبوریاں انسان سے کیا کچھ نہیں کراتیں۔ ہم تو سونے کے پنجرے میں قید تھے۔ جہاں اندر خوش تھے نہ باہر نکلنے کو تیار۔ بہر حال ایک خوشی ضرور تھی کہ تین سال تو کسی نہ کسی طرح سے کٹ جائیں گے کم از کم تین سال بعد تو مالی پوزیشن مستحکم ہوگی اور بقیہ زندگی آرام سے گزار سکیں گے۔ پہلے تو ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کے بعد بنک سے ادھار مانگا کرتے تھے۔ اب کم از کم اس لعنت سے تو جان چھوٹے گی۔ یہی ایک خوشی تھی جس کے سہارے اتنے سارے مصائب کے باوجود زندگی گزارتے رہے۔ غربت سے نجات پانا ہر آدمی کا فرض ہے اور ہم اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

جیسے بھی ہوا دن گزرتے رہے۔ کیپٹن جعفری نے دو سال بعد ہی ہینڈز اپ (Hands up) کر دیئے اور واپس آگئے۔ ارشاد اور میں ذرا زیادہ ااچی ثابت ہوئے۔ لہٰذا تیسرے سال بھی ٹھہرے رہے لیکن یہ تیسرا سال جیسے گزرا وہ فقط ہم ہی جانتے ہیں۔ ریالوں کی کشش کے باوجود بھی ہم اپنے آپ کو بوجھل اور مضمحل محسوس کرنے لگے۔ پاکستان کی یاد کچھ زیادہ ہی ستانے لگی۔ ہم روزانہ بیٹھ کر پروگرام بناتے کہ پاکستان جا کر یہ کام کریں گے وہ کام کریں گے۔ ایسے ٹھاٹھ سے رہیں گے۔ سعودی دوستوں کو اکثر دعوتیں دیتے کہ جب کبھی پاکستان آئیں ہم سے ضرور ملیں۔ پاکستان کی یاد میں دن گن گن کر کاٹے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے دل میں ایک عجیب قسم کی بے چینی اور خوشی کے ملے جلے جذبات ابھرتے رہے۔ بے چینی اس بات کی کہ کب یہاں سے فراغت ہو گی اور خوشی اس چیز کی کہ اپنے وطن واپس جائیں گے۔ ان جذبات کے ساتھ ساتھ ایک اور شدید خواہش نے بھی ہمیں بہت بے چین کر دیا۔ وہ تھی یورپ کی سیر۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو ایسے مواقع نہیں دیتا۔ ایسا موقع دوبارہ ہماری زندگی میں آنا ناممکن تھا اور اب جبکہ پہلے ہی باہر تھے اور مالی وسائل بھی ٹھیک تھے تو کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور آخر زندگی میں رکھا ہی کیا ہے؟ بہر حال ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ یورپ کی سیر کی جائے اور ضرور کی جائے یہ فیصلہ تیسرے سال کے شروع ہی میں کر لیا تھا۔

اس فیصلے نے ہماری بے چینی میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا۔ اکثر یہی صلاح مشورے رہتے کہ یورپ کیسے جائیں گے وہاں کہاں کہاں سیر کریں گے اور پھر وطن واپس کیسے جائیں گے؟ اس کے ساتھ جو دوسرا فیصلہ کیا وہ تھا کہ یورپ کی اس سیر میں جی بھر کر لطف اندوز ہوا جائے۔ مقامات کی سیر تو خیر تھی ہی سہی لیکن وہاں کی سوسائٹی کے ہر نیک و بد فعل کو قریب سے دیکھا بھی جائے۔ وہ کہانیاں جو ہم بچپن سے سنتے آئے تھے یا کتابوں میں پڑھی تھیں انہیں خود جا کر آزمایا جائے۔ یورپ جا کر قدرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز نہ ہونا صرف بد ذوقی ہی نہیں بلکہ سراسر کفرانِ نعمت بھی ہے جو ہمیں کسی طور گوارا نہ تھا۔ اب ہمارے دن رات یورپ ہی کے خیالات میں گزرنے لگے۔ ہمارا پہلا پروگرام کچھ یوں بنا۔ مئی 1978 میں ہمارا قیام ختم ہو رہا تھا۔ گرمیوں میں تو یورپ میں اور بھی مزا آئے گا لہٰذا یہ سارا سفر بذریعہ سڑک کیا جائے۔ سعودی عرب سے بذریعہ کار روانہ ہوں۔ شام اور ترکی سے گھومتے ہوئے یورپ میں داخل ہوں۔ لندن میں کچھ دن ٹھہر کر سیکنڈے نیو یا جائیں۔ پھر بذریعہ ترکی ایران اسی کار میں پاکستان پہنچیں۔ تجویز بڑی معقول تھی ہم دو ڈرائیور تھے اس لئے آرام سے چل سکتے تھے۔ راستے میں رفاقت (Company) کے لئے کسی دل پسند ٹورسٹ کو لفٹ (lift) بھی دے سکتے تھے اور علاقہ بھی خوب گھوم پھر کر دیکھ سکتے تھے۔ فوجی زندگی کا خاصہ یہ ہے کہ ہر کام کے لئے بہت زیادہ منصوبہ بندی کرنا لازمی ہے اور بعض اوقات یہ منصوبہ بندی ضرورت سے زیادہ طویل ہو جاتی ہے۔ ہمارے پاس چونکہ وقت تھا۔ وسائل تھے اس لئے تفصیلی منصوبہ بندی میں پڑ گئے۔

اس فیصلے کے بعد ہمارے جسم تو سعودی عرب میں تھے لیکن دل و دماغ یورپ میں۔ اس مقصد کے لئے ہم نے دو تین بڑی بڑی اٹلس لائبریری سے نکالیں۔ جونہی صبح سویرے دفتر پہنچتے اٹلس کھول کر بیٹھ جاتے۔ اپنے سفر کی تفصیلات اور راستے میں پڑنے

والے ممالک کو دیکھتے پھر پیانہ لے کرنا پتے کہ تقریباً کتنے میل سفر طے کرنا پڑے گا۔ پھر ہر ملک کی اچھائیوں اور برائیوں پر غور کرتے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد آپس میں بحث مباحثہ چلتا کہ اس ملک سے کیوں جائیں دوسرے ملک سے کیوں نہ جائیں مثلاً میں براستہ یونان جانا چاہتا تھا اور یونان کے متعلق بڑی بڑی دلیلیں دے کر ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ وہاں جانا ہمارے لئے زیادہ اچھا ہوگا لیکن ارشاد سب کچھ سننے کے بعد بڑے آرام سے کہتا۔ یار! میرے خیال میں ہمیں براستہ اٹلی جانا چاہیے۔ وہاں روم جائیں گے۔ وہاں سے سسلی بھی جاسکتے ہیں یا سوئٹزرلینڈ بھی۔ بہرحال اسی بحث مباحثے میں دن گزر جاتا اور ہم اپنی اپنی اٹلس بند کرکے واپس آجاتے۔

دوسرے دن صبح سویرے پھر وہی موضوع ''یار میرے خیال میں ہم کویت کی طرف سے نہیں بلکہ اردن کی طرف سے جاتے ہیں''

''نہیں وہ راستہ لمبا ہے اور خراب بھی ہمیں کویت کی طرف سے چلنا چاہیے''

''اچھا تو استنبول کتنے دن ٹھہریں گے؟''

''میرے خیال میں ایک ہفتہ کافی ہوگا''۔

''نہیں بھائی میں تو تین چار دن سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرنا چاہوں گا۔ میں زیادہ عرصہ لندن میں گزارنا چاہتا ہوں''

''لندن میں اتنا عرصہ کس لئے اصل مزہ تو سکینڈے نیویا کے ملکوں میں آئے گا ہم ڈنمارک یا سویڈن کیوں نہ ٹھہریں''۔

جب اس موضوع سے دل بھر جاتا تو اسے بدل کر سفر کے موضوع پر شروع ہوجاتے۔

''اچھا تو ایک دن میں کتنے سو میل سفر کرلیں گے؟''

''میرے خیال میں پانچ سے چھ سو میل فی دن کافی ہے''۔

''نہیں بھائی اس سے تھکاوٹ زیادہ ہوگی۔ میرے خیال میں تین سو میل فی دن سے زیادہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے گاڑی کے انجن پر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ اچھا تو آئیں نقشہ دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ راستے میں کون کون سے شہر آتے ہیں اور کہاں کہاں ٹھہریں گے؟'' تو یوں ہم ایک دفعہ پھر بند شدہ اٹلس کھول کر راستے کے شہروں کو دیکھنا شروع کر دیتے۔ شہر اور ٹھہراؤ گنتے گنتے پھر خیال آتا:

''تو اس کے لئے ساتھ ایک خیمہ اور کھانے پینے کے بند ڈبے لے جاتے ہیں''۔

''لیکن کھانا پکانے کا مسئلہ۔ مرچ مسالے اور بستر وغیرہ کا کیا بنے گا؟''

''ہاں تو وہ سب کچھ یہاں سے ہی گاڑی میں رکھ لیں گے''۔ اسی بندوبست کے ساتھ تو ہم عمرے اور حج پر بھی جاتے رہے ہیں۔ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ لہٰذا وہی انتظام۔ بحث کرتے کرتے سر دکھنے لگ جاتا تو ایک دفعہ پھر موضوع بدل کر شروع ہوجاتے۔

''اچھا تو شاپنگ کہاں سے کریں گے؟''

''زیادہ شاپنگ تو لندن سے کریں گے اور باقی جو چیز جہاں سے پسند آگئی''

''تو اتنی چیزیں لائیں گے کیسے کار میں تو نہیں آسکتیں!''

''تو پھر زیادہ چیزیں نہیں خریدیں گے''۔

''نہیں بھائی یہ غلط ہے۔ زندگی میں ایک دفعہ تو وہاں جانے کا موقع مل رہا ہے۔ شاپنگ دل بھر کر کریں گے''۔

''اچھا بالفرض اتنی چیزیں خرید لیں تو ان کی حفاظت کیسے ہوگی؟''

''آپ کیا کیا خریدیں گے؟''

''پہلے آپ بتائیں کس کس چیز کی لسٹ بنائی ہے؟''

جب اس موضوع سے بھی تنگ آتے تو اس کا رخ پھر تھوڑا سا موڑ کر نئے زاویئے سے شروع ہوجاتے:

''دوست یورپ میں تو ہوٹل بڑے مہنگے ہیں بہت خرچ ہوگا''۔

''فکر نہ کرو لندن میں بہت واقف کار ہیں''۔

''ان کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے اور پھر صرف لندن ہی تو نہیں باقی جگہوں پر کیا کریں گے؟''

''اچھا تو پھر کار کے اندر ہی سویا کریں گے''

''لیکن وہ تو سامان سے بھری ہوگی''۔

''اس کے اوپر کیریر (Carrier) لگالیں گے''۔

''اس پر بھی سامان ہوگا جو رات کو لوگ اتار کر لے جائیں گے''۔

یہ باتیں کرتے ہوئے ہمیں دو بج جاتے اور یوں مجبوراً ہمیں یہ بحث ختم کر کے گھر واپس لوٹنا پڑتا۔ انہی خیالات اور حسین سپنوں میں دن گزرتے رہے اس تیزی سے کہ پتہ بھی نہ چلا۔ کچھ عرصہ بعد اس پروگرام کو ایک نئے زاویئے سے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ یہ کہ سعودی عرب سے جو کار لے جائیں گے ل وہ تو لیفٹ ہینڈ (Left Hand) ہوگی۔ اس کی پاکستان میں کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ قیمت کم ملے گی اور خود رکھی تو ہر وقت حادثات کا خطرہ! خاص کر پاکستان کے ٹرک ڈرائیوروں سے کیسے بچا جائے گا؟ لہٰذا کیوں نہ انگلینڈ سے کار خریدیں اور اسی میں واپس آئیں آخر ''میر پور یئے'' بھی تو وہاں سے خرید ہی لاتے ہیں۔ وہ سستی بھی پڑے گی اور ہوگی بھی رائیٹ ہینڈ (Right Hand)۔

اس کے ساتھ ہی پہلے والا پروگرام دھڑام سے نیچے آگرا۔ اب انگلینڈ میں اپنی اپنی واقفیت تلاش کرنا شروع کردی تا کہ کسی واقف کار کی معرفت کار خریدیں۔ اسی دوران وہاں کے چند ڈیلروں کا بھی پتہ معلوم کرلیا۔ ہم دونوں نے مختلف انداز سے ان ڈیلروں کو خط لکھنا شروع کر دیئے لیکن یہ کم بخت انگریز لوگ جواب دینے میں بھی اتنے تیز ہوتے ہیں کہ ہمارا پروگرام چند روز سے زیادہ نہ چل سکا۔ ایک ہفتے کے اندر انگلینڈ سے سوالات کے جواب آگئے۔ وہاں کی قیمتیں سعودی عرب کی قیمتوں سے دگنی تھیں لہٰذا وہاں سے کار خریدنے کی خوش فہمی ایک ہفتے کے اندر ہی دور ہوگئی۔

انہی دنوں ہمارے ایک دوست کو پتہ چلا کہ ہالینڈ میں ایک بہت بڑی ڈیوٹی فری مارکیٹ ہے جو صرف غیر ملکیوں کے لئے مخصوص ہے اور وہاں سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک سب کچھ میسر ہے۔ اس نئی خبر نے ہماری سوچ کا رخ ایک اور طرف موڑ دیا۔ لہٰذا ہم نے وہاں خط لکھنے شروع کر دیئے۔ دو ہفتے کے اندر اندر وہاں سے بڑے خوبصورت کتابچے بمعہ تصاویر موصول ہوئے۔ وہاں کاروں سمیت ہر چیز میسر تھی حتیٰ کہ جاپانی کاریں بھی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر خوشی کی بات یہ تھی کہ وہاں قیمتیں بہت مناسب تھیں۔ اور ہمیں کیا چاہیے تھا۔ بس فٹ سے پروگرام بنالیا۔ اب غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ آیا پہلے انگلینڈ جائیں یا ہالینڈ۔ اس معاملے میں ہماری رائے میں اختلاف تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ پورا پروگرام ملتوی ہوجائے۔

ہمارا پروگرام تقریباً مکمل ہوگیا۔ دو ماہ ہم مختلف موضوعات پر ہالینڈ ڈیوٹی فری مارکیٹ سے لیٹر بازی

کرتے رہے۔ ہمارا موضوع بحث یہ تھا کہ کار کون سی لیں۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ یورپ کے لئے سپیشل ماڈل ہوتے ہیں اور اگر یہ سچ ہے تو پھر پاکستان میں ان پر ڈیوٹی بہت زیادہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی Specification میں بھی فرق ہو۔ پھر ان کے پارٹس کا مسئلہ بھی ہوگا۔ لہٰذا ہم نے اس موضوع پر خط و کتابت کی لیکن واہ ری قسمت جب سب اطلاعات مل گئیں اور ہم آرڈر بک کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے تو پتہ چلا کہ وہاں بھی لیفٹ ہینڈ ہی گاڑی ملے گی۔ رائٹ ہینڈ نہیں مل سکتی۔ پروگرام کی یہ عمارت جو ہم نے بڑی محنت سے تیار کی تھی ایک دفعہ پھر دھڑام سے نیچے آ گری۔

ہمارے قیام کی مدت بھی ختم ہونے والی تھی اور ہم نے اپنی گاڑیوں کی فروخت کے لئے بھی بات چیت کر لی تھی۔ لہٰذا اپنی گاڑیوں والا پروگرام تو ختم۔ ہاں اتنی امید رکھی کہ اگر انگلینڈ میں اتفاق سے کوئی سستی گاڑی مل گئی تو خرید لیں گے۔ ورنہ سیاحوں کی طرح بذریعہ بس یا ٹرین سفر کریں گے اور واپسی بذریعہ ہوائی جہاز ہوگی۔ ہم نے چھٹیوں کی درخواستیں دے رکھی تھیں۔ میری تین ماہ کی اور ارشاد کی دو ماہ کی رخصت منظور ہو کر آ گئی، بچوں کو ہم نے اپریل کے آخر میں گھر بھیج دیا اور اپنی طرف سے یورپ کی تیاری مکمل کر لی لیکن ہمارے پروگرام سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارا خیال تھا کہ مئی کے آخر میں چلے جائیں گے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مئی کے آخر میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمیں مزید کچھ مدت کے لئے ٹھہرنا پڑ گیا جس سے ایک عجیب غیر یقینی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کبھی ہمیں حکم ملتا کہ ایک ہفتے کے اندر چلے جائیں گے اور پھر پتہ چلتا کہ جب تک ہماری جگہ دوسرے افسر نہیں پہنچیں گے ہم نہیں جا سکتے۔ اس غیر یقینی صورت نے ہمیں خاصا پریشان کر دیا۔ ہم نے ہر حربہ آزمایا کہ جلد فراغت ہو جائے لیکن کامیاب نہ ہوئے اور پھر آخر میں حالات نے ایسا ظالمانہ مذاق کیا کہ جس نے ہمارے سارے پروگرام کا ستیاناس کر دیا۔ 18 جون کو ہمیں دفتر میں بلا کر یہ خوش خبری سنائی گئی کہ میری جو چھٹی سعودی حکومت کے ذمہ تھی وہ منظور ہو گئی ہے۔ لہٰذا مجھے 19 جون سے فارغ کر دیا گیا۔ ارشاد اگست کے پہلے ہفتے سے پہلے نہیں جا سکتے تھے۔ یہ حکم سن کر ہماری جو حالت ہوئی ہو گی اس کا ہمارے جیسے لوگ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اب کسی قسم کی کوشش بے کار تھی۔ میں ڈیڑھ ماہ اور ٹھہر نہیں سکتا تھا اور ارشاد میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا اب اپنا اپنا بندوبست یا پشتو محاورے کے مطابق ''انپل بندوبست''۔

یہ حکم سنتے ہی ارشاد کو میں نے وہیں چھوڑا اور خود اپنی تیاری کے لئے کمرے میں آ گیا۔ کئی ایک سرکاری کاغذات کی تکمیل اور تنخواہ ابھی باقی تھی۔ یہ سب کام بھاگ دوڑ کر کے مکمل کرائے۔ اب وہاں ایک پل بھی ٹھہرنا فضول تھا اور نہ ہی ٹھہرنے کا موڈ تھا۔ دفتروں کے چکر سے دو بجے فارغ ہوا پھر بازار کے کئی ایک کام تھے۔ دوستوں سے بھی ملنا تھا۔ غرض کہ ایک مشین کی سی پھرتی سے مجھے ادھر اُدھر بھاگنا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ رات گیارہ بجے میری تیاری مکمل ہو گئی۔ صبح چھ بجے والی پرواز سے مجھے جدہ جانا تھا۔ جہاں آخری عمرہ کرنے کے بعد یورپ کے ویزے لگوانے تھے۔ ساری رات ایک عجیب قسم کی بے قراری رہی جس سے سو نہ سکا۔ آنے والے سفر کے خیالات نے چین نہ لینے دیا اور یوں کروٹیں بدلتے بدلتے رات گزر گئی۔

(جاری ہے)

مجھے کیوں نکالا؟

(متاثرہ فریق سے معذرت کے ساتھ)

شرافت ضیاء

سیاست کا ہے بادا آدم نرالا
وہی جانتا ہے پڑے جس کا پالا
صدا آ رہی ہے مجھے کیوں نکالا؟
جدھر دیکھئے ہے اسی کا حوالہ
مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا

کہیں جا رہا ہے کوئی جانے والا
کہیں آ رہا ہے کوئی آنے والا
کہیں پر پڑا ہے زبانوں پہ تالہ
کوئی جپ رہا ہے مسلسل یہ مالا
مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا

گیا ساتھ جب چھوڑ کر اس کا سایہ
کوئی ہاتھ پھر تھامنے کو نہ آیا
لگایا جو لوگوں نے ترکا مسالہ
تو کہنا پڑا پھر اسے لا محالہ
مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا

اُسے تھا حساب اپنا شفاف رکھنا
ہتھیلی پہ جیسے ہو ماہتاب رکھنا
جو غلطی کا بروقت ہوتا ازالہ
تو رائی کا بنتا نہ کوہِ ہمالہ
مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا

سبق سارے قصے سے ملتا یہی ہے
کہ قدرت کا دستِ نگر آدمی ہے
کوئی ایک پتا بھی ہلتا نہیں ہے
اگر نہ ہلائے اسے عرش والا
مناسب نہیں اب یہ شیون یہ نالہ
مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا

سلسلہ وار ناول

☆ ریاض عاقب کوہلر
aqibkohlar@gmail.com

قسط:1

پشیمان

عرضِ مصنف

''حکایت'' کے ساتھ میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ میں نے لکھنے کی ابتدا یہیں سے کی۔ میرے چار ناول ''حکایت'' کے صفحات کی وساطت سے آپ کی بصارتوں کی نذر ہو چکے ہیں جن میں بھگوڑا، دلدل، جنونِ عشق اور وفا ہے ذات عورت کی، شامل ہیں۔ اب اپنا پانچواں ناول ''پشیمان'' قارئین ''حکایت'' کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ان شاء اللہ میرا چھٹا ناول ''عداوت'' آپ کو حکایت کے صفحات میں پڑھنے کو ملے گا۔ ''عداوت'' کے بعد بہت سارے قارئین، دوستوں، عزیزوں اور خاص طور پر مدیر ''حکایت'' عارف بھائی کے حکم کی تعمیل میں ایک ایکشن، ایڈونچر اور سسپنس سے بھرپور ناول ''سنائپر'' پیش کروں گا جو پاک آرمی کے ایک ایسے نشانہ باز کی ولولہ انگیز داستان ہے جو اُڑتی مکھی کو بھی نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ایک ایسا محبِ وطن جسے دشمنوں کی سازش کی وجہ سے اپنے بھی غدار سمجھ بیٹھے تھے، اس کے علاوہ ایک تاریخی ناول پر ''وردہ'' پر بھی کام ہو رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت سے پہلے کے عرب معاشرے کے پس منظر میں ہے۔ ایک ایسا سردار زادہ جس نے غلام بن کر پرورش پائی تھی لیکن فی الحال بات کرتے ہیں ''پشیمان'' کے بارے۔

نشہ شراب کا ہو یا اقتدار و اختیار کا، انسان کی عقل خبط کر دیتا ہے۔ اونچے مقام پر بیٹھ کر انسان کو پستی کے کمین بونے اور بالشتیے دکھائی دیتے ہیں۔ امارت انسان سے بُرے بھلے، نیک بد اور مخلص غیر مخلص کی پہچان کی صلاحیت چھین لیتی ہے۔ حالانکہ یہ آفاقی حقیقت ہے کہ روپیا، رتبہ اور شہرت کسی کے پاس بھی مستقل نہیں رہتے۔ ہر بلندی کے بعد پستی کی ذلت جھیلنا پڑتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

بلندی کا بھروسہ کیا
کبھی ہم تھے جہاں تم ہو

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ محنت لگن اور حوصلے ہی سے انسان کامیابی کی منازل طے کرتا ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والوں کو وہی ملتا ہے جو کوشش کرنے والوں سے بچ جائے۔

مفہوم ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''انسان کو اتنا ہی ملتا ہے جتنا وہ کوشش کرتا ہے''۔ چاہے یہ کوشش دنیا کی ہو یا عقبیٰ کی اور صداقت، ایمانداری و دیانت داری ایسی خوبیاں ہیں جو انسان کو دوسروں سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں۔

زیرِ نظر ناول کی کہانی میں محبت و نفرت کے جذبے کو اجاگر کرنے کے ساتھ ایک جوان کی ہمت و حوصلے کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً کامیابی کے خوابوں کی تعبیر لمبی لمبی دعاؤں، مختلف قسم کے شرعی اور غیر شرعی وظائف، گنڈے، تعویذ اور اسی طرح کے کسی اور عمل میں پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے لئے تو دن رات ایک کرنا پڑتا ہے۔ دعاؤں کے ساتھ جسمانی محنت و مشقت کی چکی میں بھی پسنا پڑتا ہے۔ معجزوں اور کرامات کا ظہور بھی انسان کی ہمت و طاقت کی انتہا پر پہنچ کر ہوتا ہے۔ اللہ پاک کی مدد کے حصول کے لئے جہاں دعائیں اور نوافل ضروری ہیں، وہیں اپنی جسمانی صلاحیتوں کا استعمال بھی ناگزیر ہے اور جو کوئی ایسا کر گزرے، شک نہیں کہ وہ کامیابیوں کی سیڑھیاں دوڑ کر طے کرتا ہے۔

آپ کی رائے اور مشوروں کا منتظر، آپ تمام کا

ریاض عاقب کوہلر
aqibkohlar@gmail.com

''تم پاگل تو نہیں ہو.....اسوہ!'' رباب نے اسے سختی سے جھڑکا۔

''اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اور نہیں تو کیا، بے چارے نے ایسا کیا کر دیا کہ تم نے اس کی اتنی زیادہ توہین کر دی۔''

''لڑکیوں کو گھورنے والے بے شرم مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ پھر موصوف کا سٹیٹس دیکھو، ایک کلرک کا بیٹا، اسوہ اسلم شکور خان سے عشق فرمانے چلا ہے۔''

رباب مزاحیہ لہجے میں بولی۔ ''وہ کیا کہتے ہیں .....

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

''ایسی کی تیسی اس آتش کی۔'' اسوہ نے قہقہہ لگایا۔ ''اور اس کی آتش پر تو میں نے ایسا پانی پھینکا ہے کہ چنگاری بھی باقی نہیں رہی ہوگی۔''

رباب بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''ویسے بڑی ظالم ہو یار!.....اچھا خاصا ہینڈسم نوجوان ہے، پڑھائی کے لحاظ سے بھی کلاس کا نمایاں لڑکا ہے، کیا ہوا جو غریب ہے۔''

اسوہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''اس کی طرف داری سے بہتر ہے خود اسے اپنا لو۔''

''تمھیں تو پتا ہے نا یار!..... میری منگنی ہو چکی ہے اور پھر اسوہ شکور کی موجودی میں کسی اور کی دال کہاں گلتی ہے۔''

''نفرت ہے مجھے مرد ذات سے۔''

رباب نے پوچھا۔ ''تو کیا ساری زندگی کنواری بیٹھی رہو گی؟''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' اسوہ نے کندھے اچکائے۔

رباب نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''حرج کا تو پتا نہیں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ فطرت سے مفر مشکل ہے۔''

''فطرت سے کون بھاگ رہا ہے یار!.....'' اسوہ ہنسی۔ ''میں تو مردوں سے دور ہونے کی بات کر رہی ہوں۔''

''تو شادی فطرت ہی ہوتی نا محترمہ۔''

''دفع کرو اس موضوع کو، اگر کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو موڈ خراب نہ کرو۔''

رباب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں جی امیر زادیوں کے موڈ کی تو کیا بات ہے۔''

وہ اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولی۔ ''تم کون سا مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہو۔''

''ٹھیک کہا، مگر تمھاری طرح اکلوتی تو نہیں ہوں نا۔''

''اچھا اپنے منگیتر کی سناؤ.....؟''

''کیا سناؤں یار!.....وہی پیسا کمانے کی مشین بنا ہوا ہے۔''

''کیوں، اب کال نہیں کرتا۔''

''کرتا ہے.....مگر اس کے پاس گپ شپ کا وقت نہیں ہوتا۔ بس خیریت پوچھ کر ایک دو رسمی سے جملے کہتا اور پھر وقت کی کمی کا رونا رو کر خدا حافظ۔''

''اتنا کچھ کم ہے کیا۔''

''کم تو ہے نا.....پہلے گھنٹا بھر لمبی کالیں کیا کرتا تھا۔ اب دو تین منٹ سے زیادہ اس سے بات نہیں ہو سکتی۔ شاید ٹیلی فون کا بل محترم سے برداشت نہیں ہوتا۔''

''تمھارے لیے ہی کما رہا ہے محترمہ!''

''ہاں کہتی تو ٹھیک ہو، ویسے بھی جب مرد ہمارے

لیے دن رات خوار ہوں، تو بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''مجھے تو کسی صورت بھی نہیں بھاتے۔'' اسوہ نے منہ بنایا۔

رباب نے پوچھ۔ ''کیا اپنے پاپا بھی اچھے نہیں لگتے۔''

''شٹ اپ یار!..... ڈیڈی کیوں اچھے نہیں لگیں گے، میں عام مردوں کی بات کر رہی تھی۔''

رباب اس کے غصے کو خاطر نہ لاتے ہوئے ہنسی۔ ''انہی عام مردوں میں جب کوئی خاص بنتا ہے تو پھر اس جیسا خاص کوئی نہیں رہتا۔''

اس کی بات اسوہ کو مزید تپا گئی تھی۔ ''تیری سوئی ابھی تک اسی کمینے پر اٹکی ہوئی ہے۔''

''نہیں جی۔'' رباب نے پرزور انداز میں اس کی تردید کی۔ ''میں اپنے کامی کو یاد کر رہی تھی۔''

اسوہ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ خبردار جو تم نے اس کی بات کی۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''محترمہ!..... میں تو نہیں، البتہ تم بار بار اسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہو۔''

''ذکر کیا کمینے کا اور وہ پہنچ گیا۔'' اسوہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اس وقت یونیورسٹی کی کنٹین میں بیٹھی تھیں۔ رباب نے پیچھے مڑ کر دیکھا عمار نے حسب عادت اپنے لیے ایسی جگہ پسند کی تھی جہاں سے اس کی نظریں براہِ راست اسوہ کے چہرے پر پڑ سکتی تھیں۔ اور بیٹھنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں نے اپنا دل پسند مشغلہ، مطلب اسوہ کے چہرے کا طواف شروع کر دیا تھا۔

''یہ ایسے باز نہیں آئے گا۔'' اسوہ نے دانت پیستے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی، مگر رباب نے جلدی سے اس کی کلائی تھام لی۔

''پاگل مت بنو اسوہ!..... کیوں خود کو بدنام کرنے پر تلی ہو اور پھر یوں کسی کو بھی یونیورسٹی کی کنٹین میں بیٹھنے سے منع نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''میں کسی کے بیٹھنے پر نہیں دیدے پھاڑ کر گھورنے پر معترض ہوں۔''

''دیکھو!..... تھوڑی دیر پہلے تم نے اسے گیلری میں جھڑکا۔ بلکہ اس کی اچھی خاصی بے عزتی کی۔ حالانکہ اس نے کوئی بات بھی نہیں کی تھی بس خاموش کھڑا محترمہ کا دیدار کر رہا تھا۔ اور میرے خیال میں یہ اتنا بڑا جرم بھی نہیں ہے۔ کسی کا گھورنا اگر اتنا ہی برا لگتا ہے تو نقاب اوڑھنا شروع کر دو..... ثواب بھی ملے گا اور گندی نظروں سے چھٹکارا بھی۔''

''تم کچھ زیادہ ہی اس کی طرف داری نہیں کر رہی ہو۔'' اسوہ اپنی سہیلی ہی پر برس پڑی۔

''نہیں، تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی کے گھورنے سے تمھارا کیا بگڑتا ہے۔''

''تو کوئی گھورے کیوں۔'' اسوہ پیر پٹختی ہوئی کنٹین سے باہر نکل گئی۔ جبکہ رباب افسوس سے سر ہلاتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ پیسوں کی ادائی کے بعد اس کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا، مگر اچانک کسی خیال تحت وہ عمار کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی، اسوہ کے جانے کے بعد ابھی تک اس کی نظریں بیرونی دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، جہاں سے گزر کر وہ باہر نکلی تھی۔

اس کے قریب جا کر رباب نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔ وہ رباب کو اچھی طرح پہچانتا تھا، آخر کو وہ اسوہ کی سہیلی تھی۔

''کیا میں آپ کے دو منٹ لے سکتی ہوں مسٹر عمار!.....''

''کیوں نہیں مس!.....'' اس کا لہجہ حیرانی کا عنصر

لیے ہوئے تھا۔

اس کے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے رباب شائستہ لہجے میں بولی۔ ''مسٹر عمار!..... سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہوں گی، کہ اگر میری کوئی بات بری لگے یا آپ اسے اپنی توہین وغیرہ سمجھیں تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔ اوران باتوں کو دل پر نہ لینا کہ میرا مقصد ہرگز ہرگز آپ کی دل آزاری نہیں ہے۔''

''آپ مس اسوہ کی سہیلی ہیں اور اس ناتے میں آپ کو بہن سمجھتا ہوں اور بہنیں کبھی بھائیوں کا برا نہیں چاہتیں۔''

''شکریہ عمار بھائی!'' وہ ممنونیت سے بولی۔ ''میں دراصل آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اسوہ کے دل میں آپ کے لیے رتی بھر بھی محبت نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ شکل وصورت یا کردار کی کوئی خامی نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے چند خوش شکل لڑکوں میں آپ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ عادات واطوار بھی ٹھیک ہیں لیکن آپ معاشی لحاظ سے اسوہ سے بہت نیچے ہو۔ وہ اسلم شکور خان کی اکلوتی بیٹی ہے، جو خان گروپ آف کمپنیز کا مالک ہے۔ جبکہ آپ ایک کلرک کے بیٹے ہیں۔ تو یہ جوڑ کس طرح ہو پائے گا؟ بالفرض اگر وہ آپ سے شادی پر راضی ہو بھی جاتی ہے تو اس کے باپ کو کون راضی کرے گا؟ کیا اسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند گوارا ہوگا.....؟ اسی طرح اگر اسوہ بغاوت کر کے آپ سے کورٹ میرج بھی کر لے تب بھی کیا آپ اسے وہ سہولیات، وہ عیش آرام مہیا کر سکتے ہیں جن کی وہ بچپن سے عادی ہے؟ جانتے ہو؟ اس کے صرف ہینڈ بیگ کی قیمت پچاس ہزار ہے۔ اس کے پاؤں میں موجود سینڈلوں کی قیمت بیس پچیس ہزار سے زیادہ ہوگی۔ لباس سے لے کر میک اپ کے سامان تک وہ امپورٹڈ اور اتنا قیمتی سامان خریدتی ہے کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک بار کی شاپنگ سے سفید پوش طبقے کی کئی لڑکیوں کا جہیز آسانی سے تیار ہو سکتا ہے۔ وہ ہر ماہ شاپنگ کے لیے کینیڈا، برطانیہ، فرانس، ابوظہبی وغیرہ کا پھیرا لگاتی ہے۔ شاید تعلیم کی تکمیل بھی وہ آکسفورڈ، کیمرج وغیرہ جیسی کسی یونیورسٹی میں کرتی مگر اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈلی ہے اور والدین سے دور نہیں رہنا چاہتی۔''

عمار پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''بہن!..... آپ نے بہت اچھی باتیں کی ہیں، لیکن یقیناً آپ میرے احساسات سے ناواقف ہیں۔ کسی کو چاہنا اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ خواب دیکھنے والے کی نظر اپنی اوقات پر نہیں خدا کی رحمت پر ہوتی ہے اور اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ خواب ہوتا ہی وہی ہے جو امکان سے باہر ہو۔ باقی میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں مل سکتی۔ نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے کہ اس سے اظہارِ محبت کروں یا کوئی اور بے ہودگی کا ثبوت دوں۔ البتہ اسے دیکھنا میری مجبوری ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں اس پر گڑی رہتی ہیں یقین مانو میں بے بس ہوں۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ اپنے خوابوں کو سچا کر سکتا۔''

''بھائی!..... آپ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ایسی غلطی کر رہے ہیں۔ دیکھو ناممکن الحصول کی تمنا کرنا بے وقوفی ہی کہلائی جائے گی نا۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ آپ سے محبت بھی نہیں کرتی، بلکہ برا نہ مانو تو یہ کہوں کہ سخت نفرت کرتی ہے۔ اب بھی وہ مجھ سے اس لیے جھگڑ کر کے گئی ہے کہ میں نے اسے آپ کی توہین کرنے سے روکا کیوں۔''

''رباب بہن!..... میں کیا کروں؟ اس کی نفرت میرے لیے دکھ کا باعث سہی، مگر یہ نفرت میری محبت تو کم نہیں کر سکتی ناں۔''

''میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔'' رباب جانتی تھی کہ اس بحث کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں تھا۔

''آپ شاید خفا ہوگئی ہیں۔''

''نہیں، لیکن افسوس ضرور ہوا کہ آپ جان بوجھ کر اپنا وقار اور عزت خراب کرنے پر تلے ہیں۔''

''شکریہ رباب بہن!.....آپ کا خلوص بھرا رویہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

اور رباب ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے واپس مڑ گئی۔ عمار نے اسے مایوس کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے قائل کر لے گی، مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ مہلک مرض ناقابل علاج ہوتا ہے۔

☆☆☆

''میں نے آج عمار بھائی سے بات کی تھی۔'' چھٹی کے وقت پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے وہ اسوہ سے مخاطب ہوئی۔

''میں سمجھی نہیں، کس سلسلے میں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اور وہ تمھارا بھائی کب سے ہوگیا؟''

''جب تم کنٹین سے بھاگ آئی تھیں تو میں نے سوچا چلو اسے برا بھلا سمجھا دوں اور تم دونوں کے درمیان موجود طبقاتی فرق کی طرف اس کی توجہ مبذول کرا دوں۔''

''تو.....''

''تو کیا، بس تاویلیں کرنے لگا۔''

''حالانکہ تم نے اسے بھائی بھی بنا دیا پھر بھی وہ نہ مانا۔''

''نہیں، بلکہ اس نے مجھے بہن بنایا ہے اور اس کے تیں تمھیں نہ دیکھنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنی اور تمھاری حیثیت سے خوب واقف ہے۔ بہ قول اس کے نہ تو اس نے کبھی مس اسوہ کے ساتھ محبت کا اظہار کیا ہے اور نہ وہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا ہے، البتہ کسی کو چاہنا چونکہ غیر ارادی فعل ہے اس لیے وہ خود کو بے بس و بے قصور سمجھتا ہے۔''

''محترمہ! .....اگر اس نے کبھی مجھ سے محبت جتلانے کی کوشش کی تو دیکھ لینا اس کی زبان نہ کٹوا دی تو اسلم شکور خان کی بیٹی نہ کہنا۔''

''اچھا جانے دو یار!.....تم نے تو ہر وقت مرچیں چبائی ہوتی ہیں۔ محبت ہی کرتا ہے ناں، یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ اسے دشمن سمجھ لیا جائے۔''

''روبا!.....وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یقین مانو میں نے یہ بات پاپا جانی کو نہیں بتلائی، ورنہ اب تک اس کی ہڈیوں کا سرما بن چکا ہوتا۔ حالانکہ میں پاپا سے ہر بات شیئر کرتی ہوں۔''

''ذرا میں بھی سنوں کہ تم انکل کو کیا بتاؤ گی، یہی کہ ایک لڑکا میری طرف دیکھتا ہے۔''

''کسی غیر عورت کو گھورنا چھوٹا جرم ہے کیا؟''

''اچھا.....بالفرض تمھیں وہ بہت اچھا لگتا، تو کیا تم اسے گھورتیں۔''

''اس میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ مجھے اچھا لگے گا۔''

''میں نے کہا فرض کرو.....''

''پتا نہیں۔'' اسوہ نے منہ بنایا۔

رباب نے اچانک غیر متعلق سا سوال پوچھا۔

''اسماء کو جانتی ہو؟''

''پروفیسر احتشام کی بیٹی۔''

''ہاں وہی۔''

''کیا ہوا اسے۔'' اسوہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ اسے کیا ہوا، مگر کبھی کلاس روم میں بیٹھے ہوئے اس کا جائزہ لینا۔''

''یار سیدھی طرح منہ سے پھوٹ دو، کیا تمھارا بل آجائے گا۔''

رباب کو ہنسی آگئی۔ وہ دونوں اسوہ کی گاڑی کے قریب رک کر محو گفتگو تھیں۔ اس کا ڈرائیور اسے دور ہی

سے آتے دیکھ کر کار کے عقبی دروازے کے ساتھ اٹن شن کھڑا ہو گیا تھا۔

''پچھلے چار پانچ دنوں سے وہ بھی کسی کو ایسے ہی گھورتی ہے جیسے کوئی تمھیں گھورتا ہے۔''

''کس کو؟''

''جو تمھیں گھورتا ہے اس کو۔''

''تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔''

''پتا ہوتا تو ضرور ذکر کرتی۔ یہ تو آج عاصمہ نے بتایا ہے۔ ہم دونوں پیریڈ ختم ہونے کے بعد پانی پینے الیکٹرک کولر کی طرف گئی تھیں۔ وہیں اس نے پھوٹ دیا۔''

''احمقوں کے سینگ تو نہیں ہوتے نا۔'' اسوہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''بات حماقت کی نہیں، محبت کی ہے۔ اب اگر اسے عمار بھائی اچھا لگتا ہے تو کیا کرے، جبکہ یہ بات بھی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہو گی، کہ عمار خود کسی دوسرے کی محبت میں مبتلا ہے۔''

اسوہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''اچھا تو اس ضمن میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''کچھ بھی نہیں۔ بس یہ بتا دو، کہ عمار بھائی جو لازماً اب تک اسماء بی بی کے خیالات سے آگاہ ہو چکا ہو گا اور جسے بالکل بھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ محترمہ اسوہ بی بی کا شیدا ہے۔ تو کیا اس کے گھورنے پر اسے جھاڑ پلا دے یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور کارروائی کرے۔''

اسوہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمھارا عمار بھائی لڑکی تو نہیں ہے نا۔''

رباب تلخی سے بولی۔ ''مس اسوہ اسلم شکور خان! .....اپنے لینے اور دینے کے باٹ ایک ہی رکھو۔ ایک جانب ہم مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنے کا نعرہ لگائیں اور دوسری جانب ہم لڑکیاں ہیں۔ ہم کسی لڑکے کو گھوریں تو خیر ہے اور اگر وہ ہمیں دیکھے تو کمینہ اور خبیث ہوا۔ واہ.....''

''تو اس میں شک کیا ہے، لڑکیاں ہی تو ہیں نا ہم۔''

''تو لڑکیوں کے لیے جو پردے کا حکم ہے پہلے اسے پورا کرو تا کہ کسی مرد کو کمینگی کا موقع نہ ملے ورنہ اس کے ساتھ کمینے پن میں آپ برابر کی شریک ہوں گی۔''

''شٹ اپ یار!.....'' کہہ کر اسوہ اپنی قیمتی کار کی جانب بڑھ گئی جبکہ رباب پارکنگ ایریا کے دوسرے کونے میں موجود اپنی سوزکی کار کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''محترم! .....تم میں ذرا سی بھی عقل بھی نہیں ہے، وہ اسلم شکور خان کی بیٹی ہے۔ اسلم شکور خان کی۔ جو تم جیسوں کو ملازم بھی نہیں رکھے گا کجا بیٹی پکڑا دے۔ وہ بھی ایسی کہ جسے دیکھ کر حوریں بھی شرما جائیں۔'' مدثر نے اسے شرمندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور کیوں نہ کرتا کہ اس کا گہرا دوست جو تھا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہا تھا۔ اسے خاموش پا کر مدثر نے بات جاری رکھی .....

''غضب خدا کا، یونیورسٹی بھر میں کتنی لڑکیاں ہیں۔ ایسی جو خوب صورت بھی ہیں اور خاندانی لحاظ سے تمھاری ہم پلّہ بھی۔ ان تمام سے صرفِ نظر کر کے تم براہ راست میڈم اسوہ اسلم شکور تک پہنچ گئے۔ کچھ خدا کا خوف کرو یار!''

اس مرتبہ بھی عمار خاموش رہا تھا۔

''اب منہ سے کچھ پھوٹو بھی۔''

''کیا کہوں، میں جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہا۔''

''یہ جانے اَن جانے کی ڈفلی بجانے کے بجائے

تم ہوش کے ناخن لو اور خود کو سنبھالو۔''

''سنبھالا ہی ہوا ہے نا، اور کسی کو دیکھنا جرم نہیں ہے کہ مجھے سزا ہو جائے گی۔''

''جانتے ہو اس کی وجہ سے تمھاری تعلیم کا کتنا حرج ہو رہا ہے۔ ایسے ہی چلتا رہا تو بڑی آسانی سے فیل ہو جاؤ گے۔ فیس پوری کرنے کے لیے تمھارے والد کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، کبھی اس بات کا اندازہ کیا ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔''ایسا بس تم ہی سوچتے ہو۔''

''میں نے حقیقت بیان کی ہے محترم۔'' مدثر جھنجھلا گیا تھا۔

''یار! کسی کو چاہنا، پسند کرنا، اسے دیکھنا، ان سب کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی پڑھائی ہی سے غافل ہو جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو، ان شاء اللہ کلاس میں کسی کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔''

''اللہ کرے۔'' مدثر نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کے چہرے پر پھیرے۔ اور عمار ہنس پڑا۔

☆☆☆

''منہ کیوں پھلایا ہوا ہے؟'' خالی پیریڈ میں اسوہ جیسے ہی کلاس روم سے نکلی۔ دروازے کے ساتھ منتظر کھڑی رباب، آگے بڑھ کر اس مخاطب ہوئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' اسوہ نے کہا، مگر اس کے الفاظ اور لہجے میں واضح تضاد جھلک رہا تھا۔

''آج تم کلاس روم میں بھی میرے ساتھ نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھیں۔'' رباب کے ہونٹوں پر شکوہ مچلا۔

''دیکھو رباب!.....تم میری سب سے قریبی سہیلی ہو۔ ایک ایسی دوست جسے میں بہن سمجھتی ہوں۔ تم اگر ایک انجان شخص کی طرف داری کرتے ہوئے مجھے لعن و طعن کرو گی تو کیا مجھے دکھ نہیں ہو گا۔''

''میں نے کب کسی کی طرف داری کی ہے میری بھولی شہزادی، اگر تمھارا اشارہ کل کی گفتگو کی طرف ہے تو وہ عمار کی طرف داری ہرگز نہیں تھی۔''

''رباب! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں اس سے بہت نفرت کرتی ہوں۔'' اس نے حقارت سے ہونٹ سکیڑے۔

''کیا اس وجہ سے کہ میں غریب ہوں؟'' انھیں اچانک اپنی پشت کی طرف سے عمار کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں حیران رہ گئی تھیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ جانے کب سے ان کے پیچھے چلتا ہوا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

اسوہ نے ایک دم اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے زہر اگلا۔''نہیں.....بلکہ تم ہو ہی نفرت کے قابل۔''

''وجہ؟'' اس کے لہجے میں شامل کرب اسوہ کے لیے حیران کن نہیں تھا۔

وہ اطمینان سے بولی۔''محبت اور نفرت کے لیے وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔''

''یہ بات صرف محبت کے بارے سنی تھی۔''

''ہاں، کچھ بے وقوف ایسا ہی سمجھتے ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

رباب حیرانی سے اسوہ کو دیکھ رہی تھی جو عمار کے استفسار پر آگ بگولا ہونے کے بجائے اسے خاطر خواہ جواب دے رہی تھی۔

''ہونہہ! معلومات میں اضافے کے لیے شکریہ عرض کرتا ہوں۔'' کہہ کر عمار آگے بڑھ گیا۔

''بات سنو؟'' اسوہ نے اسے پکارا۔

''جی۔'' اس کے لہجے میں خوش گوار حیرت تھی۔

''گو تمھیں سمجھانے کے لیے مجھے زحمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں رباب کی خاطر تمھیں پہلی اور آخری بار متنبہ کر رہی ہوں۔ اگر اس یونیورسٹی سے نکلنا

نہیں چاہتے تو اپنی حرکتوں پر قابو رکھو۔ اور یقیناً تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ دھمکی نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رباب کا بازو تھام کر کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ عمار وہیں کھڑا مسکراتی نظروں سے انھیں گھورتا رہا۔

چند قدم لے کر اسوہ ایک بار پھر رکی اور پیچھے مڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''اور ہاں، اگر کسی دن محسوس کرو کہ تم معاشی لحاظ سے میرے ہم پلہ ہو گئے ہو، تب اپنے والدین کو میرے گھر رشتا لینے بھیج دینا۔ یقیناً پاپا کو اپنے برابر کے لوگوں کو ہاں کرنے میں تامل نہیں ہوگا۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو آپ بھی سن لیں، میں شادی کروں گا تو آپ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔''

اسوہ زہر خند لہجے میں مسکرائی۔ ''اور جب میری شادی کسی دوسرے کے ساتھ ہو جائے گی پھر؟''

''پھر بھی نہیں کروں گا۔'' عمار مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

''کچھ لوگوں کو بھونڈے انداز اور بڑے بڑے دعووں سے اپنی محبت ظاہر کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے، مگر تھوڑا وقت گزرنے کے بعد وہ اپنے گزشتہ دعووں کے خلاف کر کے شرمندہ ہونے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔'' طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اسوہ، رباب کو ساتھ لے کر کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ گئی۔

اسوہ کی اس بات نے عمار کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب کر دی تھی۔ یوں جیسے کہ جنگل میں ناچتے مور کو اپنے پاؤں نظر آ گئے ہوں۔

☆☆☆

''شکریہ اسوہ!.....'' آگے بڑھتے ہی رباب نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اسوہ مسکرائی۔ ''شکریہ کس بات پر۔''

''تم نے اتنا مان دیا۔ میری خاطر اتنے تحمل سے عمار کو جواب دیا اور اسے جتلا بھی دیا کہ یہ سب تم نے میری وجہ سے کیا ہے۔''

''ہاں، تمھاری ہی وجہ سے کیا ہے۔ یہ پہلی اور آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ کمینہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو دیکھنا میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔''

''دفع کرو یار!.....اسے اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔''

''میری جان!..... اہمیت تو اسے تم نے دلوائی ہے۔ ورنہ اسوہ اسلم شکور خان اور ایسے تھرڈ کلاس لڑکوں کو گھاس ڈالے، ناممکن۔''

''چھوڑو اس موضوع کو۔'' رباب نے دوبارہ اس موضوع سے پہلو تہی کرنا چاہی۔

''میں بس یہ کہہ رہی ہوں کہ اس کے بعد مجھے گلہ نہ کرنا۔''

''تم سے بڑھ کر میرے لیے کوئی اہم نہیں سمجھیں۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے رباب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اسوہ ناز سے بولی۔ ''ہونا بھی کسی کو نہیں چاہیے۔''

''تم اب تک کل کی گفتگو کو لیے بیٹھی ہو۔''

''صحیح کہا روبا!.....تمھارا ایک تھرڈ کلاس لڑکے کی طرف داری کرنا میں کہاں برداشت کر سکتی ہوں۔''

''میری جان!.....تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی ہو۔ مجھے کیا ضرورت تھی کسی کی طرف داری کی۔ اگر حق بات کہنا کسی کی طرف داری ہے تو پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''یعنی، اب بھی وہ حق پر ہے۔'' اسوہ کا موڈ بگڑنے لگا۔

''اچھا سوری نا یار! اب دفع بھی کرو اس موضوع کو۔'' یہ کہہ کر رباب بیرے کو چائے کا بتانے لگی۔

☆☆☆

''آج تو بہت خوش نظر آرہا ہے میرا بیٹا!'' سکینہ نے روٹیوں کا چھابا اور اور سالن کی پلیٹ عمار کے سامنے رکھتے ہوئے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''کوئی خاص بات تو نہیں ہے امی جان!'' عمار کے ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی تھی۔

''اللہ پاک کرے میرا لال ہمیشہ یونہی ہنستا مسکراتا رہے۔'' سکینہ اس کے ماتھے پر بوسا دے کر سامنے بیٹھ گئی تھی۔ جب تک وہ کھانا کھاتا رہتا وہ اس کے سامنے بیٹھے اسے تکتی رہتی تھی۔ کھانا کھا کر وہ پاؤں پسار کر لیٹ گیا۔ جبکہ ماں برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی کہ اسے بیٹے کے لیے چائے بنانا تھی۔

جب تک وہ چائے تیار کرتی عمار کا والد دفتر سے واپس آ گیا تھا۔ وہ عمار کو چائے دے کر شوہر کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ بشیر صاحب بھی تازہ دم ہو کر بیٹے کے کمرے میں آ گئے تھے۔

اس چھوٹے سے گھر میں دو کمرے، ان کمروں کے سامنے برآمدہ اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ باورچی خانہ برآمدے کے ایک کونے ہی میں تھا۔ بیرونی دروازے کے ساتھ ایک جانب بیت الخلا اور غسل خانہ، جبکہ دوسری جانب عمار کے والد نے ایک دکان ڈالی ہوئی تھی۔ وہ چھوٹی سی کریانے کی دکان، نماز عصر سے رات آٹھ نو بجے تک کھلی رہتی۔ البتہ اتوار کے دن وہ دکان صبح دم کھل جاتی۔ دکان کاروبار کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ان کے لیے بیٹھک کی ضرورت کو بھی پورا کرتی تھی۔ دکان اور باتھ روم کے درمیانی خلا کے اوپر بھی گھاس پھونس کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ ایسے کہ درمیانی خلا نے چھپر نما سایا دار جگہ کا روپ دھار لیا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر وہ خلا مرغیوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ گھر کا صحن بہت مختصر سا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں وہاں بہ مشکل تین چارپائیاں پہلو بہ پہلو بچھائی جا سکتی تھیں۔ وہ بھی اس طرح کہ چارپائیوں پر سونے والوں کو نیچے اترنے کے لیے پاؤں یا سرہانے کی جانب استعمال کرنا پڑتی۔ مگر وہ چھوٹا سا چار مرلے کا گھر بھی ان کے لیے کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ سکینہ خاتون صابر و شاکر عورت تھی اور پھر اس کا شوہر بشیر احمد بھی نہایت ملنسار، ہنس مکھ اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ اس کا سلوک بالکل کسی دوست کا سا تھا۔ دونوں آپس میں ہر قسم کی گفتگو کر لیتے تھے۔

''آرام ہو رہا ہے میاں۔'' بشیر احمد دوسری چارپائی پر پھیل کر بیٹھتا ہوا مستفسر ہوا۔

''جی ابو!''

''آج تو بہت تھک گیا ہوں یار!'' سکینہ خاتون کو کھانا لاتے دیکھ کر وہ چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''تو مان لو نا، ابو جان! .....اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' عمار کا لہجہ بے تکلفانہ ہونے کے باوجود ادب کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

''واہ جی واہ، پرسوں جب تم نے یہی بات کہی تھی کہ آج بہت تھکا ہوا ہوں، تب؟''

عمار ہنسا۔ ''بوڑھے اور جوان کی تھکاوٹ میں بھی فرق ہوتا ہے نا ابو جان۔ مجھے تھکاوٹ تھی کام کی زیادتی کی وجہ سے اور آپ تھکے ہیں بڑھاپے کی وجہ سے؟''

''ہا.....ہا.....ہا، یہ بھی خوب کہی۔ سن رہی ہو سکینہ بیگم! لڑکا جوان ہو گیا ہے اس لیے اس کی باتوں میں شوخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے اور اس کا ایک

ہی علاج ہے۔''

''توبہ جی!'' عمار نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''اب باپ کے ساتھ گپ شپ کرنا بھی قابلِ گرفت ٹھہرا۔ اور خدارا امی جان اب میری شادی کا ذکر لے کر نہ بیٹھ جانا۔''

''بس نکل گئی شوخی کے غبارے سے ہوا۔'' بشیر معنی خیز ہنسی سے بولا۔ ''ویسے شادی کوئی اتنی بھی بھیانک چیز نہیں ہے یار!''

''شادی سے کون کم بخت ڈرتا ہے ابو جان، میں تو بیوی سے ڈرتا ہوں۔''

''ساری عورتیں تمھاری ماں کی طرح ڈراؤنی تھوڑی ہوتی ہیں۔''

''میری ماں تو بہت پیاری ہے۔'' عمار اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھی ماں کو بازوؤں کے گھیرے میں لیتا ہوا بولا۔ ''شکر کریں، آپ کی قسمت اچھی تھی جو امی جان جیسی شریک حیات ملی۔''

''لو بئی سن لو۔'' بشیر احمد ہنسا۔ ''وہ کیا کہتے ہیں؟ ''یک نہ شد دو شد'' پہلے تمھاری ماں یہ راگ الاپتی رہتی تھی کہ میں اتنی سگھڑ ہوں، اتنی سگھڑ ہوں؟ اب بیٹے کی طرف داریاں شروع ہو گئیں۔''

سکینہ خاتون مسکراتے ہوئے ان کی بحث سن رہی تھی، وہ شوہر اور بیٹے کی نوک جھوک میں عموماً خاموش فریق کا کردار ادا کرتی۔

''ویسے ابو جان! ایمان سے بتائیں۔ کیا امی جان جیسی دوسری آپ ڈھونڈ لیں گے؟''

''اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ میرا جواب نفی میں ہوگا تو.....'' بشیر احمد ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تو یقیناً تمھارا خیال درست ہے۔''

اس کی بات پر عمار کے ساتھ سکینہ بھی ہنس پڑی تھی۔

''ویسے میاں! تم ہمیشہ اپنی شادی کی بات کو اسی طرح آئیں بائیں کر کے ٹال دیتے ہو۔ کہیں کوئی چکر تو نہیں چلا رکھا۔''

''ابو جان!.....آپ بھی نا بس؟''

''کیا میں بھی نا بس۔''

''خواتین کی موجودی میں ایسی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔''

بشیر احمد نے زوردار قہقہہ لگایا اور سکینہ خاتون نے جھینپ کر عمار کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اچھا اب میں امی جان سے خاتون ہو گئی۔''

''امی جان! آپ جتنی کوشش کر لیں یہ کان نہیں اکھڑ سکتا، پھر خود کو تھکانے کا فائدہ۔''

''بڑا بے شرم ہو گیا ہے یہ لڑکا۔'' سکینہ خاتون، بشیر احمد کے سامنے دھرے کھانے کے برتن سمیٹنے لگی۔

''لو جی اب خوش ہو جائیں، ماں بیٹے میں جھگڑا کرا دیا ہے نا۔'' سکینہ خاتون برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی، جب کہ بشیر احمد بھی چارپائی سے اٹھتا ہوا بولا۔

''میاں! میرا خیال ہے ٹرخانے کی کوئی کلاس ہی اٹینڈ کرتے رہتے ہو؟'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ عمار نے شادی کے مسئلے پر کبھی بھی سیدھے منہ گفتگو نہیں کرنا تھی۔ یوں بھی ابھی تک وہ پڑھ رہا تھا۔ پڑھائی کے بعد ہی اس نے کہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا اور پھر اس کے بعد بشیر احمد اصرار کرتا ہوا بھی بھلا لگتا۔ ابھی تک تو اس کا تعلیمی سلسلہ جاری تھا، اور یہی وجہ تھی کہ سکینہ خاتون نے اس موضوع پر کبھی بھی اس کی طرف داری نہیں کی تھی۔

ماں باپ کے رخصت ہوتے ہی اسوہ چھلانگ لگا کر اس کے خیالوں میں آدھمکی تھی۔

اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ابو جان!

آپ کو کیا پتا، میں آپ سے زیادہ بے چین ہوں۔ مگر جس کے لیے بے چین ہوں شاید وہ میری قسمت میں نہیں ہے۔''

اس کے کانوں میں اسوہ کا نفرت انگیز لہجہ گونجا۔

''میں اس سے بہت نفرت کرتی ہوں۔ کیونکہ تم ہو ہی نفرت کے قابل .....نفرت کے لیے وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا .....اگر یونیورسٹی سے نہیں نکلنا چاہتے تو.....''

وہ اس کی گفتگو کو یاد کرنے لگا، کچھ بھی تھا آج وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی اور عمار کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی۔

☆☆☆

اسوہ کے سمجھانے کے باوجود عمار نے اپنی روش ترک نہیں کی تھی۔ چاہنے کے باوجود وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں اسوہ موجود ہو وہاں نہ جائے ورنہ دوسری صورت میں اسوہ کو دیکھنا اس کی مجبوری بن جاتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ دونوں ایک ہی کلاس میں تھے۔ کلاس سے باہر تو وہ کوشش کر کے دائیں بائیں ہو جاتا مگر کلاس روم میں مصیبت میں پڑا رہتا۔ اس دن بھی ایک اہم پیریڈ کے دوران اچانک پروفیسر ہاشم اس سے مخاطب ہوا.....

''مسٹر عمار!..... یقیناً آپ کی توجہ لیکچر کی طرف نہیں ہے۔''

''نن.....نہیں سر؟'' اچانک پکارے جانے پر وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی وقت اسوہ نے بھی تیز نظروں سے اسے گھورا۔ پروفیسر ہاشم کے پکارنے سے پہلے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''اچھا؟'' پروفیسر نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

''چلیں پھر میرے سوال کا جواب دے دیں۔''

''سس.....سوری سر میں آپ کا سوال نہیں سن سکا ہوں؟''

''بس یہ بتا دو کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟'' پروفیسر ہاشم نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''چچ.....چار۔'' اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''درست، بالکل بجا فرمایا۔ جو سٹوڈنٹ پڑھائی کے بجائے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرے اس کا فیل ہونا دو اور دو چار کی طرح واضح اور ثابت شدہ ہے۔ پلیز، تشریف رکھیں اور آنکھ کان میری طرف متوجہ رکھیں۔'' پروفیسر کی بات نے سٹوڈنٹس کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اس کی اسوہ میں دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔

عمار نادم ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر جتنی دیر پروفیسر ہاشم کا پیریڈ جاری رہا اس نے اسوہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

پروفیسر ہاشم کے کلاس روم سے نکلنے کی دیر تھی کہ اسوہ تیر کی طرح اس کی جانب بڑھی۔ اور پھر جب تک دوسرے طلبہ سمجھ پاتے کلاس روم ''چٹاخ'' کی زور دار آواز سے گونج اٹھا۔

''تمھاری اتنی جرأت۔'' اسوہ پھنکاری۔

عمار کچھ کہنے کے بجائے بس اس کے چہرے پر پھیلی نفرت کو گھورتا رہا۔ اس عالم میں بھی وہ اسے اچھی ہی لگ رہی تھی۔

اسے خاموش پا کر اسوہ کا ہاتھ دوبارہ اٹھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ عمار کے چہرے تک پہنچ پاتا۔ اسماء نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''محترمہ! .....آپ ہوش میں ہیں؟'' اسماء کے لہجے میں شامل غصہ تمام کے لیے حیران کن تھا۔

''تم کون ہوتی ہو میرا ہاتھ پکڑنے والی، چھوڑو میرا ہاتھ۔'' اسوہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

اس اثنا میں باقی کلاس فیلوز بھی ان کے نزدیک جمع ہو

گئے تھے۔

''اور تم کون ہوتی ہو عمار پر ہاتھ اٹھانے والی۔'' اسماء ترکی بہ ترکی بولی تھی۔

رباب نے آگے بڑھ کر اسوہ کو تھام لیا۔

''پلیز اسوہ آرام سے..... کیا ہو گیا ہے تمھیں۔''

مگر وہ رباب کو جواب دیے بغیر اسماء کی طرف متوجہ رہی۔ ''اگر اتنی تکلیف ہوئی ہے، تو اسے باندھ کر رکھو۔ یوں پرائی لڑکیوں کو گھورنا نہایت گندی اور غلیظ حرکت ہے۔ اس کی وجہ سے پروفیسر ہاشم نے جانے میرے بارے کیا تاثر لیا ہوگا۔''

''تم ہو نا نیک پروین؟ میں جانتی ہوں تم جیسی امیر زادیوں کے لچھن۔'' اسماء بہت زیادہ تپی ہوئی تھی۔

''بتاؤ، تم نے مجھ میں کون سی غلط بات دیکھی ہے؟'' اسوہ جارحانہ انداز میں اسماء کی طرف بڑھی۔

''نہیں اسوہ!'' رباب نے بے ساختہ اس کے بازو کو تھام لیا۔

''تم آؤ قریب۔'' اسماء بھی بپھر گئی تھی۔

''پلیز اسماء بہن!'' عمار نے اسماء کا ہاتھ تھامتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''غلطی میری تھی۔ یہ جو کہتی ہے اسے کہنے دیں۔''

''کیا گنواروں کی طرح لڑ رہے ہو یار!'' زوہیب جو کہ طلبہ کی ایک یونین کا صدر تھا۔ اونچی آواز میں بولا۔ ''ماسٹر کرنے والے طلبہ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے تو رونا آرہا ہے۔ اور مس اسوہ!..... پلیز، عمار نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ یوں بپھر جائیں۔''

''میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں مسٹر!'' اسوہ زوہیب کی طرف متوجہ ہو کر سخت لہجے میں بولی اور پھر اسماء کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مس لیلیٰ! تم دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کلاس روم سے نکلتی چلی گئی۔ باقی طلبہ بھی آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگ گئے تھے۔ یوں بھی چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔

عمار سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ مدثر اس کے قریب آکر آہستہ سے بولا۔

''چلو چائے پیتے ہیں۔''

''نہیں تم جاؤ، میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''جب کہا تھا کہ خود پر قابو رکھا کرو۔'' مدثر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''آپ کو اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہیے تھا۔'' اسماء جو اب تک وہیں کھڑی تھی اسے مخاطب ہوئی۔ ''نواب زادی ہوگی تو اپنے گھر میں ہوگی۔''

''اسماء بہن!..... وہ حق بہ جانب تھی، کیونکہ میری وجہ سے اسے خفت اٹھانا پڑی۔''

بہن کے لفظ پر اسماء کے چہرے پر ناپسندیدگی کے اثرات نمودار ہوئے مگر عمار اس کی جانب دیکھ ہی نہیں رہا تھا کہ اسے معلوم پڑتا۔ یا شاید وہ جان بوجھ کے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اسماء نے منہ بنایا۔ ''نہیں، بس آپ ہی کو دل پر اختیار نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بھی باہر کی جانب چل دی۔

''اچھا! اب اٹھو نا، کہ یہیں بیٹھے رہو گے؟''

''مجھے تھوڑی دیر اکیلا چھوڑ سکتے ہو؟'' عمار نے مدثر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔'' مدثر اس کی ذہنی حالت سے واقف تھا، اس لیے مزید بحث کیے بغیر اٹھ گیا۔

عمار نے آنکھیں بند کر لیں، اس کی نگاہوں میں اسوہ کا لال بھبوکا چہرہ لہرانے لگا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اسوہ کی آنکھوں میں اس کے لیے اتنی نفرت

ہو گی۔

☆☆☆

کلاس روم سے نکل کر اسوہ پارکنگ کی جانب چل پڑی تھی۔ رباب اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پارکنگ میں جا کر وہ جیسے ہی رکی رباب نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''اسوہ! بہت افسوس ہوا یار، یہ کوئی طریقہ ہے؟''

''شٹ اپ رباب!'' وہ سخت غصے میں تھی۔ ''ایک کمینے کی وجہ سے میری کتنی توہین ہوئی اور تم مجھے اخلاق سکھا رہی ہو۔''

''جاؤ بھاڑ میں۔ جو مرضی آئے کرو۔'' یہ کہہ کر رباب پاؤں پٹختی ہوئی اپنی کار کی جانب بڑھ گئی۔ جبکہ اسوہ اپنے والد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''جی پاپا کی جان!'' اس کے والد نے پہلی بیل ہی پر کال ریسو کر لی تھی۔

''پاپا! .....ایک لڑکے نے میری بہت زیادہ توہین کی ہے۔''

''کیا .....کون ہے وہ بد بخت؟'' اسلم شکور خان کی آواز میں شامل غصہ اس بات کا مظہر تھا کہ اسے اپنی اکلوتی بیٹی کتنی عزیز ہے۔

''عمار نام ہے۔ ایک کلرک کا بیٹا ہے۔''

''اس وقت کہاں ملے گا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''ابھی تک یونیورسٹی ہی میں ہے۔''

''او کے تم وہیں رہو۔ اگر کہیں جاتا ہے تو مجھے مطلع کرنا۔''

''جی پاپا۔'' کہہ کر وہ اپنی کار میں بیٹھ گئی۔

دو تین منٹ بعد اس کے والد کی کال آنے لگی۔

''جی پاپا!'' اس نے اٹینڈنگ بٹن پریس کیا۔

''گڑیا! میں نے متعلقہ تھانے دار کو فون کر دیا ہے وہ ابھی آ کر تمہیں ملے گا۔ اس بد بخت کی شناخت اسے کرا دینا اور پھر تماشا دیکھنا۔''

اس نے کہا۔ ''میں منتظر ہوں پاپا!''

بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا ہو گا کہ اسے ایک انجان نمبر سے کال آنے لگی۔

''یس۔'' اس نے کال ریسو کی۔

''میڈم! .....میں انسپکٹر راحیل بات کر رہا ہوں۔ ہم یونیورسٹی کے گیٹ پر ہیں۔ آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''میں پارکنگ میں ہوں۔ کریم کلر کی ٹویوٹا میں بیٹھی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میڈم ہم آ گئے۔'' انسپکٹر نے مودبانہ لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ چند لمحوں بعد پولیس کی گاڑی پارکنگ میں آ گئی تھی۔ وہ اپنی کار سے باہر نکلی۔

''السلام علیکم میڈم!'' انسپکٹر کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اسلم شکور خان کی حیثیت اور پہنچ سے اچھی طرح واقف ہے۔

''انسپکٹر صاحب! .....وہ اب تک کلاس روم سے باہر نہیں نکلا۔''

''کیا آپ کلاس روم تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔''

''کیوں نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔'' اسوہ ان کے ساتھ ہو لی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر اسماء کا غصے میں تمتماتا چہرہ گھوم رہا تھا۔ عمار کو پھینٹی لگوا کر وہ اسماء کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اسماء کا عمار کی طرف داری کرنا بہت زیادہ برا لگا تھا۔

انسپکٹر کے ساتھ چار سپاہی موجود تھے وہ اسوہ کی معیت میں کلاس روم کی طرف بڑھ گئے۔ چاروں

سپاہیوں نے یوں رائفلیں تانی ہوئی تھیں گویا کسی دہشت گرد کا مقابلہ کرنے جا رہے ہوں۔

وہ کلاس روم میں داخل ہوئے۔ ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر عمار نے آنکھیں کھول دیں۔ اسوہ کے ساتھ پولیس والوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

''یہی ہے؟'' انسپکٹر مستفسر ہوا اور اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پکڑ لو اسے۔'' انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے چیل کی طرح جھپٹ کر عمار کو دونوں بازوؤں سے جکڑ لیا۔

''کک..... یہ کیا انسپکٹر صاحب؟'' عمار ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ تو تمھیں تھانے چل کر پتا چلے گا بچہ کہ شریف لڑکیوں کو کیسے چھیڑا جاتا ہے اور یونیورسٹی میں بدمعاشی کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟'' وہ بھلایا۔ ''آ..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''کیوں یہ میڈم صاحب جھوٹ کہہ رہی ہیں۔'' انسپکٹر نے ہاتھ میں پکڑی اسٹک اس کے پیٹ میں چبھوئی۔

عمار نے استفہامیہ نظروں سے اسوہ کو دیکھا وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔

''میں نے منع کیا تھا نا۔'' وہ نخوت بھرے لہجے میں بولی۔ ''مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے مان جائیں تو پھر انھیں بھوت کون کہے۔''

عمار اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک گر سکتی تھی۔

''لے جاؤ اسے۔'' انسپکٹر درشت لہجے میں بولا اور سپاہی اسے لے کر دروازے کی جانب چل پڑے۔

وہ کلاس روم سے باہر نکلے عمار کو یہ اطمینان تھا کہ اس کے کلاس فیلوز یونیورسٹی سے جا چکے تھے۔ اگر پولیس ان سب کے سامنے اسے پکڑتی تو یقیناً اس کی زیادہ سبکی ہوتی۔ وہ اسوہ کا تھپڑ کھا کر اتنا دل گرفتہ ہوا تھا کہ کلاس روم سے اٹھ ہی نہیں سکا تھا۔ اسے کیا پتا تھا اسوہ اس کے لیے دل میں اتنی نفرت رکھتی ہے۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔

پارکنگ میں جا کر سپاہیوں نے اسے دھکا دے کر جیپ میں بٹھا دیا۔ کلاس روم سے پارکنگ تک بھی وہ اسے کسی تھرڈ کلاس مجرم کی طرح کھینچتے ہوئے لائے تھے۔ یوں بھی غریب شرفا کی ہتک پاکستانی پولیس مثالی انداز میں کرتی ہے۔ مرے ہوؤں کو مارنا اور گرے ہوؤں کو زندہ درگور کرنا پولیس کی فطرتِ ثانیہ ہے۔

''انسپکٹر صاحب!'' اسوہ نے پولیس والوں کو جانے پر تیار دیکھ کر آواز دی۔

''جی میڈم!'' وہ مستعدی سے جیپ سے نیچے اترا۔

''اسے لے کر میرے پیچھے پیچھے آؤ۔''

''جی بہتر۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

وہ تفاخر سے اپنی کار کی جانب بڑھی۔ ڈرائیور نے ادب سے دروازہ کھولا اور وہ عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھا دی۔ پولیس کی جیپ ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ اسلم شکور خان کی وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے پہنچے۔ چوکیدار نے اسوہ کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ پولیس کی گاڑی بھی اس کی کار کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔

دو ایکڑ کے رقبے پر پھیلی وہ وسیع و عریض کوٹھی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ داخلی گیٹ سے اندرونی عمارت تک سرخ بجری کی ایک چوڑی روش تھی جس کے جوانب میں درانتا کی خوب صورت باڑ لگی ہوئی

تھی۔ دائیں بائیں آسٹریلین گھاس کے چوڑے مخملی قطعات، ذوقِ بصارت کو دعوتِ نظارا دے رہے تھے۔ کوٹھی کی دیواروں کے ساتھ بوتل پام، کھجور پام اور کنگھی پام کے درخت ایک ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ مخملی قطعات میں وقفے وقفے پر سرو کے درخت، مورپنکھ اور ایروکیریا کے بوٹے لگے ہوئے تھے۔ مورپنکھ کی تراش خراش بڑی مہارت سے کی گئی تھی۔ ہر درخت کے تنے کے ساتھ پھولوں کی گول کیاری بنی ہوئی تھی جو موسمی پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ گھاس کے قطعات کے تین اطراف میں بھی پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اندرونی عمارت ہلکے گلابی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔

اسوہ کے اشارے پر ڈرائیور نے کار روکی اور پھر جلدی سے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ کرّو فر سے نیچے اتری۔ انسپکٹر بھی جیپ روک کر نیچے اترا۔

اسوہ ڈرائیور کو کار گیراج میں لے جانے کا اشارہ کر کے انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اسے نیچے اتارو۔''

''چل بے!'' سپاہیوں نے اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے اتارا۔

عمار خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ اس کے چہرے پر ڈر، خوف یا گھبراہٹ کا کوئی اثر نظر نہیں آرہا تھا۔

''اب بلاؤ اپنی اسماء بی بی کو کہ تمھیں چھڑا کر لے جائے۔'' وہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔

عمار نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

''اس دن میں نے تمھیں متنبہ کیا تھا کہ جب تک میرے ہم پلہ نہیں ہو جاتے اس عشق وغیرہ سے باز آجاؤ۔ نظر آرہی ہے میری کوٹھی؟ ہو رہا ہے کچھ اندازہ کہ اسوہ اسلم شکور خان کس بلا کا نام ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے ایک کلاس میں پڑھنے کی وجہ سے ہم دونوں برابر ہو گئے ہیں۔ احمق انسان! میرے لباس اور جوتوں کی قیمت سے تمھاری کلاس کے لوگوں کا سالانہ بجٹ تیار ہو سکتا ہے اور تم مجھے اپنی گھٹیا محبت سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ منع نہیں کیا تھا کہ اپنی حیثیت پہچانو۔'' اس کا گریبان چھوڑتے ہوئے اسوہ نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ ''میرے نزدیک، تمھاری حیثیت سڑک پر پھرنے والے کتے کے آوارہ پلّے سے زیادہ نہیں ہے۔ گھٹیا نسل کے نیچ انسان! تمھیں میرے نرمی سے سمجھانے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا کیوں؟''

عمار خاموشی سے اسے گھورتا رہا، اس کی آنکھوں میں کسی جذبے کی جھلک نظر نہیں آرہی تھی۔

''نیچے دیکھو۔'' غصے سے بپھرتے ہوئے اسوہ نے اسے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔

عمار نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

''آئندہ اگر مجھے فلمی محبت دکھانے کی کوشش کی تو آنکھیں نکال کر چیل کوؤں کو ڈال دوں گی۔ بڑا آیا مجنوں کی اولاد۔ تھانے جا کر تمھارے سر سے محبت کا بھوت اچھی طرح اتر جاتا مگر مجھے تمھاری ماں پر ترس آرہا ہے۔ اور یاد رکھنا ہمیشہ یہ ترس نہیں آئے گا۔ بڑا آیا شادی کرنے والا۔'' یہ کہہ کر وہ انسپکٹر کی جانب مڑی۔

''انسپکٹر صاحب! اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال باہر کرو۔ اور ہاں خود کھانا کھا کر جانا۔''

''جی میڈم!'' کہہ کر انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ عمار کو دھکے دیتے ہوئے گیٹ کی طرف لے چلے۔

یقیناً وہ اس کی زیادہ سے زیادہ توہین اسی لیے کر رہی تھی کہ وہ اس کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔

گیٹ تک وہ سر جھکائے چلتا رہا۔ اس کے

احساسات عجیب قسم کے ہو رہے تھے جن کی توجیہ سے وہ قاصر تھا۔ اتنی توہین اور ہتک کے بعد انسان کچھ بہتر سوچنے کے قابل نہیں رہتا مگر اس پر بہت سے اسرار منکشف ہو رہے تھے۔ دنیا میں عزت سے جینے کے لیے دولت کی ضرورت ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔ بلکہ پیار محبت بھی دولت کے مرہون منت ہی نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے رباب، مدثر اور پھر آج اسوہ کی گفتگو کا لب لباب ان دونوں کے درمیان پائی جانے والی معاشی خلیج ہی تھی۔ وہ اسوہ کی ضروریات کا کفیل نہیں ہو سکتا تھا، کہ اس کے پاس دولت نہیں تھی۔ اس کی شکل و صورت، کردار قابلیت ساری کی ساری دولت کے سامنے ہیچ ہو گئی تھی۔ تھانے دار اسے غیر قانونی طور پر یونیورسٹی سے اٹھا کر تھانے کے بجائے اسلم شکور خان کی کوٹھی میں لے آیا تھا، کیونکہ اسوہ دولت مند تھی اور وہ غریب تھا۔

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ اسے باہر نکالنے کے لیے چوکیدار نے ذیلی کھڑکی کھولی باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

اسوہ کمر پر ہاتھ رکھے وہیں کھڑی تھی۔ عمار کی آخری نظر میں جانے کیا بات تھی کہ وہ نظر چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ اسے محسوس ہوا کہ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے۔ دل میں ایک جذبے نے سر ابھارا کہ اسے روک لینا چاہیے۔ توہین کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مگر پھر وہ بروقت فیصلہ نہ کر پائی اور وہ باہر نکل گیا۔

اسے باہر نکال کر پولیس والے فخریہ انداز میں واپس لوٹے۔

''انسپکٹر صاحب تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی وجہ سے ایک شہدے کو میں نے اچھی طرح نصیحت کر دی ہے۔''

''میڈم! ہم تو اسلم صاحب کے ادنا سے خادم ہیں۔ یہ لفنگا تو آپ کی رحم دلی کی وجہ سے بچ گیا ورنہ آپ دیکھتیں کہ یہ کس طرح زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے گڑگڑاتا ہے۔''

''اچھا یوں ہے کہ آپ کو اصل انعام تو پاپا ہی دیں گے۔ میری طرف سے یہ رکھ لو کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھا لینا۔'' اسوہ نے پرس میں موجود ساری رقم ان کی جانب بڑھا دی۔

''اس کی ضرورت تو نہیں تھی میڈم صاحب! ..... مگر آپ کی عنایت کو ٹھکرانا بھی بے ادبی ہو گی۔'' انسپکٹر اس کے ہاتھوں سے رقم کو جھپٹتا ہوا بولا۔ اسوہ کی نظر میں ادنا سی رقم بھی اتنی خطیر تھی کہ انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

''او کے، اب آپ کو اجازت ہے۔'' سپاہیوں کی حالت دیکھ کر وہ متکبرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے مڑ گئی۔

انسپکٹر نے باقاعدہ ایڑیاں بجا کر اسے سیلوٹ کیا اور جیپ میں بیٹھ کر واپسی کی راہ لی۔ ابھی تک اسلم شکور خان کی بخشش بقایا تھی۔ جب بیٹی نے صرف کھانے کے لیے اتنی خطیر رقم انھیں عنایت کی تھی تو باپ کا انعام جانے کتنا ہوتا؟ انسپکٹر دل ہی دل میں اپنی مستعدی کو سراہنے لگا کہ، اسلم شکور خان کی طرف سے کال موصول ہوتے ہی اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔

اگر اس مستعدی سے ہماری پولیس اصل مجرم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوتی تو یقیناً پاکستان میں جرم کا نام نشان نہ ہوتا۔

☆☆☆

گھر داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ظاہری طور پر اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا

مگر اس کے دل کے اتنے ٹکڑے ہوئے تھے کہ کرچیاں سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

محبت ہو چکی پوری
چلو اب زخم گنتے ہیں

اس کی ماں باورچی خانے میں تھی، جلدی سے کمرے میں گھس کر اس نے قمیص اتاری اور تولیا کندھے پر ڈال کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ قمیص کے سامنے کے سارے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور وہ ماں کے سوالات کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''بیٹا!.....آج دیر کر دی؟ کھانا گرم کر دوں؟'' اسے غسل خانے کا رخ کرتے دیکھ کر ماں نے باورچی خانے سے آواز دی۔

''کھانا کھا کے آیا ہوں ماں!.....آپ بس اچھی سی چائے پلا دیں۔ میں ذرا نہالوں۔'' اسے ذرا سی بھی بھوک نہیں تھی۔

وہ نہا کر باہر نکلا تو ماں اسے چائے کے برتنوں کے ساتھ اپنے کمرے میں ملی اور اس کی بدقسمتی کہ اس کی اتاری ہوئی قمیص ماں کے ہاتھ میں تھی۔

''بیٹا! یہ بٹن کیسے ٹوٹے کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟'' اس کے لہجے میں ہزاروں اندیشے پنہاں تھے۔

''نہیں ماں!'' اس نے جلدی سے بات بنائی۔ ''یہ مدثر کی مہربانی سے ٹوٹے ہیں۔''

''بھلا وہ کیسے؟''

''آج ہم دونوں نے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں بل کی ادائی کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور اس نے مجھے روکنا چاہا کہ کھانے کی دعوت اس نے دی تھی اور بل بھی وہی دے گا۔ پس کھینچا تانی میں اس کا ہاتھ میرے گریبان پر پڑ گیا اور بٹن گئے۔''

''تم دونوں کا ابھی بچپنا نہیں گیا۔'' وہ شفقت سے مسکرائی۔

''ماں جی!.....ابو جان نظر نہیں آ رہے۔''

''معلوم ہے نا، وہ اس وقت آرام کرتے ہیں۔ تمھارا پوچھ رہے تھے، میں نے بتا دیا کہ کہیں آوارہ گردی کرنے نکل گیا ہوگا۔''

''بیٹے کے کرتوتوں پر کبھی پردہ نہ ڈالنا۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ اس کی ماں ہنس پڑی تھی۔

چائے پی کر وہ بستر پر لیٹ گیا جبکہ اس کی ماں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کی سوچوں میں اسوہ آ دھمکی تھی۔ اس کی مترنم آواز میں آج دکھ دینے والی حقارت اور نفرت ابل رہی تھی وہ اس کی گفتگو پر غور کرنے لگا۔

''سڑک پر آوارہ گھومنے والا کتے کا پلا۔ ہونہہ!.....بغیر دولت کے میری یہ حیثیت ہے۔ کوئی بات نہیں مس اسوہ اسلم شکور خان.....

جتنی بھی مجھ پہ قرض ہیں سب سود کے سمیت
واپس کروں گا میں تمھیں تیری حقارتیں

''میں تمھیں دولت مند ہو کر دکھاؤں گا۔ اتنا کہ تمھارے ساتھ دست درازی کرنے پر بھی پولیس مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ چاہے تم اس وقت جس کی بھی بیوی ہوئیں؟ میں تمھیں معاف نہیں کروں گا۔ یاد رکھنا اسوہ!.....تم نے بہت برا کیا، تم نے میری ہی نہیں میری محبت کی بھی توہین کی ہے۔ دھن کی کثرت نے تم سے لطیف جذبات کا احساس ہی چھین لیا۔ ایک غریب کی محبت اتنی ارزاں ہوگئی کہ اسے کتے سے تشبیہ دے ڈالی؟'' وہ سوچتا رہا، خود سے عہد کرتا رہا اور دولت مند ہونے کے منصوبے بناتا رہا۔

☆☆☆

''خفا ہو؟'' اسوہ نے رباب کے سامنے نشست

سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

رباب خاموش رہی تھی۔

''اب ایسی بھی کیا بے مروتی یار!'' اسوہ دوبارہ اس کو مخاطب ہوئی۔

''کل تم نے اچھا نہیں کیا۔'' رباب سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''اس کی غلطی اتنی نہیں تھی کہ جتنی تم نے اس کی توہین کی؟''

وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ''ایسا کیا کر دیا میں نے بھئی؟''

''پوری کلاس کے سامنے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دینا کہاں کی شرافت ہے؟''

''ایسے لوگ شرافت کی زبان سمجھتے کب ہیں؟'' اسوہ نے منہ بنایا۔

''بہ ہرحال، اس بارے میں تم سے اتفاق نہیں کروں گی۔''

''کرنا پڑے گا جی!.....آج دیکھنا اگر تمھارے عمار بھائی نے میری طرف دیکھ لیا تو جو جرمانہ کہو گی ادا کروں گی۔ معلوم ہے آج کلاس روم میں اس نے آنکھ اٹھا کر بھی میری جانب نہیں دیکھا۔''

''غیرت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اسے تمھاری طرف بالکل نہیں دیکھنا چاہیے، لیکن وہ جس مرض میں مبتلا ہے مشکل ہے کہ اپنی اس حرکت سے باز آسکے۔ کلاس روم میں تو شاید وہ خود پر قابو پالے گا مگر کینٹین ٹیریا میں اس کی نظروں کی آوارگی کو روکنا شاید ممکن نہ ہو۔''

''تو پھر لگ گئی شرط؟'' اسوہ نے چیلنج کرتے ہوئے پوچھا۔

''لگ گئی۔'' رباب نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔

''جیتنے والا کوئی بھی ایک بات منوا سکتا ہے۔''

اسوہ نے شرط پیش کی۔

''منظور ہے، مگر یاد رکھنا ہارنے کی صورت میں، میں تمھیں مکرنے نہیں دوں گی۔''

''یہ تو پتا چلے گا نا، ہارتا کون ہے۔'' اسوہ کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ اور پھر ان کی اسی گفتگو کے دوران عمار، مدثر کے ہمراہ کینٹین کے ہال میں داخل ہوا۔

''لیں جی! تیار ہو جاؤ، عاشق نامراد پہنچ گیا۔'' اسوہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

اندر داخل ہوتے وقت دروازے کے قریب کھڑے ہو کر دونوں دوستوں نے کینٹین کے ہال میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ہال میں دو ٹیبل ہی خالی پڑے تھے۔ ایک اسوہ اور رباب کی ٹیبل کے بالکل متصل تھا۔ جب کہ دوسرا، ان کی ٹیبل سے دو ٹیبل چھوڑ کر پڑا تھا۔ ہر ٹیبل کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے دو کرسیاں ایسی تھیں کہ ان پر بیٹھ کر براہِ راست اسوہ کا دیدار کیا جا سکتا تھا اور رباب کو یقین تھا کہ عمار نے انھی دو کرسیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔

اسوہ کی سوچیں اس سے برعکس تھیں۔ اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر عمار کی آخری نگاہ لہرانے لگتی۔ جانے کیوں اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ عمار کی آخری نگاہ تھی۔

دونوں دوست جیسے ہی ٹیبل کے نزدیک پہنچے، وہ کن انکھیوں سے ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اچانک اسوہ کے دل میں شدت سے ہار جانے کی تمنا بیدار ہوئی۔ وہ خود حیران ہو گئی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ وہ توجیہ سے قاصر تھی۔ مگر اس کے چاہنے کے برعکس عمار ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ رباب کی حیرانی کی انتہا نہ رہی تھی۔ اسوہ کو یوں لگا جیسے کوئی چیز چھنا کے

سے اس کے اندر ٹوٹ گئی ہو۔

''اسوہ! تم جیت گئیں یار!'' رباب مایوسی سے بولی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمار اتنی آسانی سے اپنے وظیفے سے باز آجائے گا۔

''میں نے کہا تھا نا۔'' اسوہ پھیکے لہجے میں بولی۔ جیتنے کے باوجود مایوسی کی ہلکی سی لہر نے اس کے دل کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔

رباب نے کہا۔ ''اچھا جناب! اب اپنی خواہش بتاؤ تاکہ مابدولت اسے پورا کر سکے۔''

''ایسا ہے کہ.....'' اسوہ یہ کہہ کر چند لمحے سوچ میں ڈوبی رہی اور پھر بولی۔ ''آج بل کی ادائی تم کرو گی۔''

''بس؟'' رباب کے لہجے میں خوشگوار حیرت تھی۔

اسوہ نے کہا۔ ''تمھیں ہرا دیا، یہ خوشی ہی کافی ہے۔'' یہ الگ بات کہ اس کے لہجے سے بالکل بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خوش ہے۔

رباب ہنسی۔ ''اگر میں جیتی ہوتی تو ایسی شرط منواتی کہ تمھاری طبیعت صاف ہو جاتی۔''

''اچھا، میں بھی سنوں۔''

''سچ بتاؤں، تو میں نے تمھیں یہ کہنا تھا کہ عمار کے حال پر رحم کرو، اگر زیادہ نہیں تو اسے خود کو دیکھنے سے تو منع نہ کرو۔ کیا تم یہ شرط مان جاتیں؟''

''کیا پتا، ویسے شرط تو شرط ہوتی ہے۔'' اسوہ مبہم لہجے میں بولی۔

''اچھا چھوڑو یار! اس کی اپنی قسمت۔ کہتے ہیں کہ ثابت قدمی کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے اور عمار ثابت قدم نہیں رہ پایا۔''

اسوہ نے اس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے مشورہ دیا۔ ''چلنا چاہیے؟''

''میں تھوڑی دیر بیٹھوں گی۔''

اور رباب کے جواب پر اسوہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کیوں عمار کے اس طرح بیٹھنے پر اسے توہین کے شدید احساس نے گھیر لیا تھا۔

ہال سے نکلنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر ایسا رستا اختیار کیا کہ عمار کی نگاہ فوراً اس پر پڑ سکے۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے اچانک مڑ کر دیکھا۔ اسے امید تھی کہ عمار اسے گھور رہا ہوگا، مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے اسے اسماء نظر آئی۔ وہ سنگی بینچ پر بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اپنا غصہ ہلکا کرنے کے لیے وہ اسماء کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے قدموں کی چاپ پر اسماء نے کتاب سے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اور اس کے چہرے پر نفرت بھرے تاثرات پھیل گئے تھے۔ وہ ان تاثرات کو خاطر لائے بغیر شوخ لہجے گویا ہوئی۔

''ہیلو اسماء عمار صاحب!.....کیسی ہو؟''

اس کی بات پر بجائے غصے میں پھٹ پڑنے کے اسماء کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تمھارے منہ میں گھی شکر جی! کاش ایسا ہو جائے۔''

جواب سن کر وہ سر تا پا سلگ اٹھی۔ اسے غصہ دلانے کے لیے وہ غیر مہذبانہ لہجے میں بولی۔

''اپنے یار کا حال بھی پوچھ لینا تھا، کہ کل اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔''

''مس اسوہ!.....یہ جو تم مجھے بار بار عمار کے حوالے سے مخاطب کر رہی ہو نا، بہ خدا بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اللہ پاک تمھاری زبان مبارک کرے۔''

''کل تم نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، اس کی جزا میں مسٹر عمار کو جو مار پڑی اس نے جناب کے اندر پائے جانے والے عشق و محبت کے سارے جراثیم کا خاتمہ کر

دیا ہے۔"

"تم نے بہت برا کیا.....لیکن اس کا اتنا اچھا نتیجہ نکلا کہ اس کے مقابل تمھاری ساری برائی ہیچ ہے۔ ایک بار پھر شکریہ مس اسوہ!.....میں سوچ سوچ کر تھک گئی تھی کہ کس طرح عمار کے دل سے تمھاری محبت ختم کروں۔ مگر نہ تو کوئی تدبیر سوجھ رہی تھی اور نہ اسے میری محبت کی قدر آ رہی تھی۔ اگر تمھاری بات درست ہے تو، امید ہے اب وہ میری طرف لوٹ آئے گا۔ میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتی۔ یوں بھی تم دونوں کا ملاپ ناممکن تھا۔ وہ ایک سفید پوش خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور تم ٹھہریں نواب زادی۔"

اسماء کے لہجے میں طنز سے زیادہ حقائق کے اظہار کی جھلک تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کی باتیں اسوہ کو بہت بری لگی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ اسماء کو خوش خبری سنانے آئی تھی کہ.....

"محترمہ! اب عمار تمھارا ہوا۔"

اور دیکھا جاتا تو عمار کو پھینٹی لگوانے کا مقصد بھی یہی تھا، کہ وہ اسوہ کی جان چھوڑ دے۔ اور اسوہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد لامحالہ وہ اسماء کی جانب متوجہ ہو جاتا۔ کہ اسماء کا شمار بھی خوب صورت اور پُرکشش لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اور پھر وہ اسے چاہتی بھی تھی۔

اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "تو میرے نواب زادی ہونے میں شک ہی کیا ہے؟"

"شک کس کم بخت کو ہے۔ بس درخواست ہے کہ اب بھی اگر عمار نہ سدھرا تو تم نے ایک بار پھر اسے ہلکی سی پھینٹی لگوا دینی ہے۔ تمھارا تعاون ہمیشہ یاد رہے گا۔"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اسماء بھی لبوں پر مسکراہٹ سجائے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

"اللہ پاک تمھاری زبان مبارک کرے، تمھارے منہ میں گھی شکر....."

وہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ بڑے حجم کے گول بیڈ پر لیٹے ہوئے اس کے دماغ میں اسماء کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ اسے غصہ دلانے گئی تھی مگر اسماء بجائے غضب ناک ہونے کے اس کی ممنون و احسان مند ہو رہی تھی۔

"یوں بھی تم دونوں کا ملاپ ناممکن تھا.....وہ ایک سفید پوش خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور تم ٹھہریں نواب زادی.....تمھارا تعاون ہمیشہ یاد رہے گا....."

"بے شرم.....تعاون یاد رہے گا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ "تھرڈ کلاس خاندان کی نیچ لڑکی۔ تمھیں عمار کیوں گھاس ڈالے گا۔"

"مگر میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں، عمار اسے گھاس ڈالے یا نہ ڈالے میری بلا سے۔ جائیں بھاڑ میں دونوں۔" وہ کروٹ بدل سونے کی کوشش کرنے لگی۔

کلاس روم میں عمار نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود کئی بار بہانے بہانے سے اور کبھی کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے چکی تھی۔ مگر عمار نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔

"چلو شکر ہے جان چھوٹی۔ خواہ مخواہ کی بدنامی کس کو اچھی لگتی ہے۔" اس نے مطمئن انداز میں سوچا مگر یہ سوچ طفل تسلی ثابت ہوئی۔ پہلے وہ اس کے گھورنے پر سیخ پا رہتی اور اب جب وہ اس حرکت سے باز آ گیا تھا تو اسے عجیب قسم کی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی۔ "یہ شاید اپنی اہمیت کے کم ہونے کا احساس ہے یا کسی کی نظروں سے گرنے کی توہین کا

احساس۔ یہ بھی ہوسکتا ہے ہر وقت اس کی ادنا سی نظر کا متمنی رہنے والے کا یوں بے رخی برتنا مجھے ہضم نہ ہو رہا۔"

وہ یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی کہ یہ عمار کی محبت یا چاہت کے حصول کی تڑپ ہے۔

اگلے دن ایک اور حیرانی اس کی منتظر تھی۔ پہلے عمار کلاس میں ایسی جگہ بیٹھا کرتا تھا جہاں وہ اسوہ کو آسانی سے گھور سکے۔ مگر اب اس نے اپنی جگہ پہلی رو میں بیٹھنے والے ایک لڑکے سے بدل لی تھی۔ اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ اسوہ کو دیکھنے کے لیے اسے باقاعدہ مڑنا پڑتا۔

"ہونہہ! .....جیسے میں اس کے لیے مری جا رہی ہوں نا۔" اسوہ نے طنزیہ انداز میں ساتھ بیٹھی رباب کو کہا۔ دوسرے پیریڈ کی ابتدا میں عمار نے جگہ بدلی تھی۔

"کیا مطلب، تمہارا دماغ اپنی جگہ پر ہے نا؟" رباب نے دبے لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ پروفیسر فرقان کلاس روم میں داخل ہو گئے تھے۔

"کک .....کیا ہوا؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"اسے اس کام پر مجبور کرنے والی تم خود ہو، بلکہ اس کے لیے تم نے پولیس سے اس کی چھترول بھی کروائی اور اب کیا فرما رہی ہو؟"

"نن .....نہیں یار! تم غلط سمجھیں۔ میرا مطلب تھا کہ اس کا انداز ایسا ہے جیسے میں اس کے لیے مری جا رہی ہوں۔"

"اچھا اب خاموشی سے لیکچر سنو۔" رباب پرفیسر فرقان کو توجہ سے سننے لگی۔

خالی پیریڈ کے دوران کیفے ٹیریا میں چائے پیتے ہوئے رباب اسے جھڑک رہی تھی۔

"یار! .....اس غریب کی جان بخش دو۔ اب تو اس نے تمہیں گھورنا بھی بند کر دیا ہے، پھر طعنہ زنی کا مقصد۔"

"طعنہ زنی کب کی ہے؟ میں نے تو یونہی بات کی تھی۔" اسوہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"اسوہ ایک بات پوچھوں؟"

"جی پوچھو۔"

"جب پولیس والے ایک بے گناہ کی پٹائی کر رہے تھے تو تمہیں ترس نہیں آیا تھا۔"

"بے گناہ کیوں، اس نے ایک لڑکی کی زندگی اجیرن کر دی تھی اور بے گناہ ہو گیا۔ یہ سوچو کہ اگر میری جگہ کوئی غریب لڑکی ہوتی تو یہ اسے کتنا تنگ کرتا۔"

"محترمہ! .....یہ امکانی گھوڑے دوڑانے کے بجائے یہ فرماؤ کہ جب بھری کلاس میں تم نے اس کے منہ پر تھپڑ تک جڑ دیا تھا، پھر پولیس کو بلوا کر اس کے ساتھ اتنا برا سلوک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سزا تو بہرحال وہ کاٹ چکا تھا۔"

"یہ سزا تو میں نے اسے اسماء کی بدتمیزی کی وجہ سے دی تھی۔ یاد ہے اسماء نے میری کلائی پکڑ کر مجھے چیلنج دیا تھا کہ اب میں اسے ہاتھ لگا کر دیکھوں، پس میں نے اسے وہ سب کر دکھایا۔"

"محترمہ! .....جانتی ہو پوری کلاس کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے اور تمام، تمہارے گھٹیا فعل اور نیچ حرکت سے برگشتا ہیں۔"

"گھٹیا کیوں، ایک چھچھوری لڑکی کی جرأت کہ وہ اسوہ اسلم شکور خان کے منہ لگے۔ میں نے اسے اپنی طاقت دکھائی تھی اور بس۔"

"میں تمہاری دوست ہوں، لیکن یقین کرو تمہاری یہ حرکت بہ ذاتِ خود مجھے اتنی بری لگی کہ بیان سے باہر ہے۔ عمار کے اندر مجھے سوائے خوبیوں کے کچھ نظر نہیں آتا اور اگر غربت خامی ہے، تب بھی صرف ایک خامی کی بنا پر اس کی اتنی ہتک اور توہین، یہ کہاں کا انصاف ہے یار!"

''واہ بڑی خوبیاں نظر آ رہی ہیں، کہیں کامران بھائی کو ہری جھنڈی دکھانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔''

''شٹ اَپ۔'' رباب نے اسے جھڑکا۔

اسوہ ہنسی۔ ''سچ کہہ رہی ہوں۔ اتنی خوبیوں کا مالک دوبارہ نہیں ملے گا اور پھر تمھاری دولت اس کے اندر موجود واحد خامی کو بھی ختم کر دے گی۔''

''مجھے تو وہ بہن سمجھتا ہے اور پھر شیدا بھی تم پر ہے۔ تم خود کیوں نہیں اسے خوش آمدید کہتیں۔''

اسوہ نے منہ بنایا۔ ''میں مرنا پسند کروں گی۔''

''میرا خیال ہے بہت ہو گیا، اب اس موضوع کی جان چھوڑ دینا چاہیے۔'' رباب نے اکتا کر کہا، مجبوراً اسوہ کو بھی اثبات میں سر ہلانا پڑا۔

☆☆☆

''یار! تم نے تو خود کو بالکل بدل لیا ہے۔'' مدثر کے لہجے میں تعریف کا عنصر نمایاں تھا۔

عمار نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''حالات بدل دیتے ہیں ورنہ کوئی کب بدلنا چاہتا ہے؟''

مدثر ہنسا۔ ''شاید ڈر گئے ہو۔''

''ایسا کہہ سکتے ہو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پولیس سے۔''

''نہیں۔'' عمار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کی نفرت سے۔ جب میں نے یہ جان لیا کہ میرے بارے اس کے دل میں موجود نفرت کو میری اس حرکت سے بڑھاوا مل رہا ہے تو مجھے اپنی روش بدلنا پڑی۔''

''یعنی اب تک اس کی محبت دل سے رخصت نہیں ہوئی۔''

عمار کے لب مسکراہٹ کے انداز میں کھنچے مگر یہ ایک ناکام کوشش ہی تھی۔ مسکراہٹ خوشی کا نام ہے جب ہنستے ہوئے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں لرزتی نظر آئیں تو اسے کوئی مسکراہٹ کا نام نہیں دے سکتا۔ وہ آہستہ سے گنگنایا.....

دل میں ہوتا تو کسی طور نکل بھی جاتا
اب تو وہ شخص بہت دور تلک ہے مجھ میں

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ اختیاری فعل تو نہیں ہے نا، البتہ کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش میں بس اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ اب اپنے افعال پر قابو حاصل ہو گیا ہے۔ پہلے بے بس ہو کر اسے دیکھنے لگتا تھا۔ اب نہیں دیکھتا اور نہ دیکھوں گا۔ البتہ اس کی نفرت و حقارت کا جواب ایک دن ضرور دوں گا۔ کب؟ یہ میرے ربّ ہی کو معلوم ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔''

''تمھاری مؤخر الذکر بات بالکل درست ہے۔ یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اپنی حیثیت دیکھو، تم اس سے کیسے بدلہ لو گے۔ اور ہاں اگر تمھارے ذہن میں کوئی غلط خیال پرورش پا رہا ہے تو خدارا کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ ضرور کر لینا۔ یہ نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''کوئی غلط خیال نہیں ہے یار! .....میں بس دولت مند بننا چاہتا ہوں، اتنا کہ اپنے جائز حقوق کے حصول میں دشواری نہ ہو۔''

مدثر نے کہا۔ ''وہ تو تم یوں بھی حاصل کر سکتے ہو۔''

''غلط فہمی ہے جناب کی۔ اگر غریبوں کو اپنا حق مل جائے تو سارے جھگڑے، فساد ہی ختم ہو جائیں۔ ایک امیر زادی صرف اس لیے مجھے پولیس کے ہاتھوں زدوکوب کراتی ہے کہ میں نے اسے دیکھا کیوں؟ سونے پر سہاگا یہ کہ میرے ساتھ یہ بدسلوکی تھانے کے بجائے اس کی کوٹھی میں کی جاتی ہے۔ اب میں لاکھ

پاپڑ، شور مچاؤں؟ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تھانے والوں نے تو ایف آئی آر ہی نہیں درج کرنی عمل تو بعد کی بات ہے؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا کیس بنالیں کہ مجھے جان چھڑانا مشکل ہو جائے۔''

''تو اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟''

''بتا تو دیا ہے کہ دولت کا حصول۔''

''خوب، تو یہ ہوگا کیوں کر۔'' مدثر ہنسا۔ ''ایم بی اے کرنے کے بعد تم کسی فرم میں جاب حاصل کر کے بہت زیادہ دولت حاصل کر لو گے اتنی کہ ایک موٹر سائیکل خرید لو گے۔ نئے جوتے اور قیمتی لباس بھی۔ ہے نا.....؟''

وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔ ''میں اپنا کاروبار کروں گا۔''

''مثلاً کیا؟''

''معلوم نہیں، ابھی تک اس بارے سوچا نہیں ہے۔''

''میں بتا دیتا ہوں۔'' مدثر نے حقائق کا پٹارا کھولا۔ ''تم سگریٹ پان کا کھوکا ڈال لینا۔ ساتھ میں چائے بھی بنانا شروع کر دی تو سونے پر سہاگا ہوگا۔ سبزی فروٹ کی ریڑھی بھی عمدہ کاروبار ہے۔ کسی گرلز کالج کے باہر فروٹ چاٹ اور نمکین چاولوں کا آئیڈیا بھی برا نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر اگر مکئی کے بھٹے بھون کر بیچو تو ہزاروں میں کھیلو گے۔''

عمار ایک بار پھر اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتا ہوا بولا۔ ''اسلم شکور خان اور اس جیسے درجنوں کو تمھارے جیسے مخلص دوستوں نے یوں ہی مطعون کیا ہوگا۔''

''ہا.....ہا.....ہا''۔ مدثر نے قہقہہ لگایا۔ ''اسلم شکور خان خاندانی رئیس ہے محترم۔ اور یاد رکھنا ایسے امراء شروع شروع میں ہزار قسم کے غلط دھندوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ جب خوب دھن کما لیتے ہیں تو پھر

قائداعظم نے افواج پاکستان کے افسران سے کراچی میں 11 اکتوبر 1947ء کو ایک موقعے پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر ہم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں انتھک محنت اور جدوجہد سے کام لینا پڑے گا۔ یہ ذاتی ترقی، عہدے اور مرتبے حاصل کرنے کا وقت نہیں ہے۔ یہ وقت ہے تعمیری کوشش کا، بے لوث جدوجہد اور مستقل مزاجی سے فرض شناسی کا۔''

محمد زہیر۔ لاہور

اس کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے عام کاروبار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو اس ضمن میں جناب کس کالے دھندے میں ہاتھ ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''کہتے ہیں نیت صاف منزل آسان۔''

''یہ گھسا پٹا محاورہ کتابوں ہی میں بھلا لگتا ہے۔''

''میرا خیال ہے چلتے ہیں، خالی پیریڈ ختم ہونے والا ہے۔'' عمار بحث کو ختم کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ مدثر نے اس کی تقلید کی تھی۔ وہ اس وقت یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔ اسوہ کو رباب کے ساتھ کینٹے ٹیریا کی طرف جاتے دیکھ کر وہ مدثر کے ساتھ لان میں آ گیا تھا۔ آج کل وہ حتی الوسع کوشش کر رہا تھا کہ اسوہ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

☆☆☆

''ہونہہ! .....گھٹیا لڑکیوں کی گھٹیا محبت۔'' اسماء کو عمار کے ساتھ جڑے بیٹھے دیکھ کر وہ رباب کو مخاطب ہوئی۔ مگر اس کی آواز بہ ہر حال اتنی بلند ضرور تھی کہ اسماء کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اسماء نے آج کل عمار کے ساتھ ہی بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔

''عمار! پتا ہے مکھی ہمیشہ صاف اشیاء کو چھوڑ کر گند ہی پر بیٹھتی ہے اور اسی گندی مکھی کی طرح کچھ لوگوں کی

ذہنیت بھی اتنی گندی ہوتی ہے کہ بس گندی سوچ ہی اس میں پل سکتی ہے۔'' اسماء کی آواز بھی کافی بلند تھی۔

''چور کی داڑھی میں تنکا'' اسوہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ کلاس میں موجود طلبہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''چور کون؟'' اسماء تیز لہجے میں کہتی ہوئی کھڑی ہوئی اور بے باکانہ انداز میں بولی۔ ''سارے سن لیں۔ میں عمار کو پسند کرتی ہوں اور ان شاء اللہ جلد ہی ہم شادی کرنے والے ہیں۔ بس یا کچھ اور سننا ہے۔'' آخر میں وہ اسوہ کو مخاطب ہوئی تھی۔

''واہ .....خوب.....عمدہ ..... بلے بھئی بلے.....''

کلاس میں مختلف طلبہ کی ملی جلی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔

''اسماء پلیز بیٹھ جاؤ'' عمار نے اسے بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچا اور وہ اسوہ کو گھورتی ہوئی بیٹھ گئی۔

اسوہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، البتہ اسماء کی بات نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اسی وقت پروفیسر ہاشم کلاس روم میں داخل ہوا اور تمام چہ مگوئیاں خاموشی میں ڈھل گئیں۔ سارے پروفیسر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ پروفیسر ہاشم کا لیکچر شروع ہوا مگر اسوہ باوجود کوشش کے لیکچر دھیان سے نہ سن سکی۔ اس کے دماغ میں مسلسل اسماء کا طنزیہ لہجہ گونج رہا تھا۔

''میں عمار کو پسند کرتی ہوں، جلد ہی ہم شادی کر لیں گے .....شادی کر لیں گے.....شادی کر لیں گے.....''

بیریڈ کے خاتمے پر رباب اسے مخاطب ہوئی۔

''اسوہ!.....تم ٹھیک تو ہو؟''

''آں .....ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''بس سر میں درد ہے۔ میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ اگلے پروفیسر کے آنے سے پہلے وہ کلاس روم سے باہر آ گئی تھی۔

''ہوش میں تو ہو صاحب زادے؟'' بشیر احمد کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''جی ابو جان!.....آپ جانتے ہیں کہ میں نشہ نہیں کرتا۔'' عمار نے اطمینان سے جواب دیا۔

''مگر آج مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔''

''ابو جان! میں مذاق کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''ہاں، موڈ میں تو نہیں ہو مگر مذاق کر تو رہے ہو نا۔''

''ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔''

''جناب!.....آپ اپنی تعلیم مکمل کریں اور کوئی اچھی سی جاب تلاش کریں۔''

''ابو جان!.....آپ نے اپنی جاب سے کیا کما لیا؟''

''تمھیں کسی چیز کی کمی آنے دی؟'' بشیر احمد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ابو جان! میرے انکار کرنے سے حقیقت نہیں بدلے گی کہ، میری بہت ساری خواہشات وسائل کی کمی کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔ امی جان اور آپ نے مجھے اتنی محبت دی کہ شاید ہی کسی کے والدین نے دی ہو۔ مگر یہ بات آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ہم غریب ہیں۔ اور غربت جاب کرنے سے کم نہیں ہو سکتی؟''

''تمھارے کہنے کا مطلب ہے، میں تمھاری بہت ساری خواہشات پوری کرنے میں ناکام رہا ہوں۔'' بشیر احمد کے لہجے میں دکھ جھلک رہا تھا۔

''ہاں، مگر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے، کیونکہ یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا۔''

''احسان ہے تمھارا؟'' بشیر احمد طنزیہ لہجے میں بولا۔

عمار اس کے طنز کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔ ''اچھا پتا ہے، میرے چند کلاس فیلوز ایسے ہیں جو اپنی کار میں

یونیورسٹی آتے ہیں۔ ان کے ذاتی اکاونٹ میں لاکھوں روپے جمع ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ہر ماہ آؤٹنگ کے لیے بیرون ملک جاتے ہیں اور.....''

''ٹھیک ہے۔ ان کے والدین اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ انھیں یہ سہولیات بہم پہنچائیں۔ میں اپنی محدود آمدن میں یہ سب کیسے کرتا۔''

''میرے کہنے کا بھی یہی مقصد تھا اور میں نہیں چاہتا کہ اپنی اولاد کو بھی مجھے یہی کہنا پڑے۔''

''محترم! .....اس گھر کی قیمت چند لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے اور یہ رقم کسی بھی کاروبار کے لیے ناکافی ہے۔''

باپ کے لہجے میں مفاہمت کی بو محسوس کرتے ہی وہ مسکرایا۔ ''ابو جان! .....میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں مگر میں محدود پیمانے پر کاروبار شروع کروں گا اور پھر آہستہ آہستہ اسے ترقی دوں گا۔''

''تم سوائے اس گھر سے ہاتھ دھونے کے اور کچھ نہیں کرو گے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کے بعد یہ گھر مجھے ہی ملے گا۔''

''تو .....؟''

''تو .....میری چیز ہے میں آج بیچوں یا کل۔''

''پھر کوئی خیمہ وغیرہ تو لے آؤ نا، رہیں گے کہاں؟''

عمار اطمینان سے بولا۔ ''آپ کو سرکاری کوارٹر الاٹ ہو سکتا ہے۔''

بشیر احمد نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ ''ایک شرط پر۔''

''جی؟''

''اصل بات بتاؤ۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمار آہستہ سے بولا۔

''اس کا نام اسوہ ہے۔ اسلم شکور خان کی اکلوتی اولاد ہے.....'' اس نے مختصر لفظوں میں والد کو تمام قصہ دہرا دیا تھا۔ پولیس کی بات بھی بے جھجک دہرا دی تھی۔

''تم شاید مجھے دوست نہیں سمجھتے اس لیے مجھ سے یہ ساری بات چھپائے رکھی۔''

''نہیں آپ میرے باپ بھی تو ہیں اور میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''دکھ تو اب بھی پہنچا ہے۔''

''یقیناً پہنچا ہوگا، مگر اب تو میں نے اپنے مسائل سے نبٹنے کا منصوبہ سوچ لیا ہے۔''

بشیر احمد نے منہ بنایا۔ ''جو کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔''

عمار نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے والوں کو وہی ملتا ہے جو کوشش کرنے والوں سے بچ جائے۔''

''مطلب ہمارا بے گھر ہونا طے ہو گیا۔''

''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے نا ابو جی۔''

''بس باتیں کرنا ہی سیکھی ہیں۔ خیر! .....کل میں کوارٹر کے لیے درخواست دے دوں گا اور الاٹ منٹ میں ہفتا ایک لگ جائے گا۔ اس کے بعد تم گھر کا سودا کر لینا۔'' یہ کہہ کر بشیر احمد اٹھنے لگا۔

''یقیناً آپ خفا ہو کر جا رہے ہیں۔''

بشیر احمد مسکرایا۔ ''ہر چیز تمھاری اپنی ہے۔ آج روک بھی دیا، تو کل بیچ دو گے۔''

''شکریہ ابو جان! ان شاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''واہ! بڑی بات ہے جی۔'' بشیر احمد مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

(جاری ہے)

فکر

اپنی ہی قوم اور ملک کے سوداگر

جن دس لاکھ شہیدوں نے اس ملک کو بنانے میں اپنا خون بہایا ان کی روحیں بھی خدائے بزرگ و برتر سے اس کے قائم دائم رہنے کی التجا کر رہی ہوں گی

☆ محمد صدیق
گلاسگو۔ یو کے

لیڈر کے درجہ پر وہ شخص فائز ہوتا ہے جو قوم کی خاطر کسی مقصد کے حصول کے لئے بے لوث جدوجہد کرتا ہے خواہ اس جدوجہد کے بدلے اسے کسی قسم کا مالی فائدہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ کامیابی کی صورت میں اعلیٰ ترین عہدہ پر بیٹھنے کی تمنا بھی اس کے دل میں نہیں ہوتی۔ ملک بنانے والے چھوٹے لیڈر سے لے کر بڑے تک اپنی خصوصیات کی حامل شخصیات تھیں۔ انہی میں سے ایک شخصیت جس نے انگریز سے آزادی کی خاطر باقی ساری زندگی مسلمانوں کے لئے نئی مملکت کے قیام میں صرف کر دی، مولانا حسرت موہانی کی تھی جنہیں ملک بننے کے بعد بڑے سے بڑے عہدے کی پیشکش کی گئی لیکن اس مرد قلندر نے ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی کہ اگر میں پاکستان چلا آیا تو ہندوستان میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کا پُرسان حال کون ہو گا۔

انہی شخصیات کی انتھک جدوجہد کی بدولت نئی مملکت کے قیام کا خواب پورا ہو سکا۔ ملک بننے کے بعد اسے محفوظ تر بنانے کے لئے ملت اسلامیہ کی عظیم شخصیت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی بے لوث اور مخلصانہ جدوجہد رنگ لائی اور اللہ تعالیٰ نے اس جدوجہد کے نتیجے میں انہیں ایٹم بم کا خالق بنایا لیکن حیرت کی بات ہے بلکہ اس پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے کہ 80ء-90ء کی دہائی اور اس کے بعد آنے والے سیاستدان اور حاکم ملک و قوم سے مخلص ثابت نہ ہوئے اور قوم کے قدم آگے کی طرف بڑھانے کی بجائے پیچھے کی طرف لے کر جاتے رہے۔ صرف اور صرف اپنی جھولیاں بھرنے اور لوٹی دولت ملک سے باہر منتقل کرنے پر سارا زور صرف کرتے رہے۔ جب جمہوریت کا نام استعمال کر کے غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کرنے والے ان جمہوری چمپئن کو اقتدار سے

الگ کیا جاتا تو بیرون ملک اپنے ہی ملک کے خلاف بیٹھے سازشیں کرتے پائے جاتے۔

بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے الگ کیا گیا تو نائن الیون کے بعد مشرف دشمنی میں وہ امریکہ یورپ میں جا کر پاکستان کی امداد بند کرنے کا راگ الاپتی رہیں۔ پاکستان پر دہشت گردوں کی پشت پناہی کا الزام عائد کرتی رہیں۔ اس نازک دور میں امریکہ و دیگر ممالک کے پاکستان پر لگائے الزامات کا دفاع کرنے کی بجائے خود ایسے ہی الزامات مشرف حکومت پر لگاتے وقت محترمہ نے ملک اور قوم کو پہنچنے والے نقصان کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔ یہی وطیرہ ملک کی اعلیٰ عدالت سپریم کورٹ کی طرف سے نااہل قرار دیئے جانے والے نواز شریف کا بھی رہا جو بے لفظوں میں دھمکیاں دیتے رہے کہ ملک کو (میری برطرفی کے بعد) کوئی بھی بڑا سانحہ پیش آ سکتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں لیڈروں کی حکومت کرپشن میں ملوث ہونے کی وجہ سے ختم کی گئی تھی۔ اس سے ہمارے لیڈروں کی مفاد پرستانہ، خودغرضانہ فطرت کا اندازہ آپ خوب لگا سکتے ہیں۔

یہ ساری تمہید اس لئے باندھی گئی کہ ایک تو ہمارے نام نہاد لیڈروں کا اصل روپ سامنے آ سکے کہ اپنے اقتدار اور مفاد کی خاطر وہ ملک و قوم کا سودا کرنے میں بھی کسی قسم کی شرم محسوس نہیں کرتے۔ ستمبر کے مہینے میں ہی روزنامہ ''جنگ'' کے ایک کالم نگار مظہر برلاس نے ایک اہم انکشاف کرتے ہوئے تحریر کیا کہ 2015ء میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے دوران اس وقت کے آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے کچھ آڈیو ویڈیو ثبوت پیش کئے جو ناقابل تردید تھے۔ اجلاس کی حساسیت کی وجہ سے اس میں آرمی چیف، چیف آف جائنٹ سٹاف، ڈی جی آئی ایس آئی اور وزیر داخلہ نے شرکت کی لیکن اس وقت کے وزیر دفاع تک کو اس اجلاس میں شریک نہ ہونے دیا گیا (یہ لوگ ہی اسی قابل ہیں)۔

اجلاس میں یہ حیرت انگیز انکشاف کیا گیا کہ تین ہمسایہ ممالک پاکستان پر حملہ آور ہوں گے اور ملک کے اندر دہشت گردی کا گھناؤنا کھیل بھی تیز تر کر دیا جائے گا۔ اسی دوران ملکی معیشت کو کمزور کرنے کے بعد سیاسی اور معاشی عدم استحکام کا بہانہ بنا کر پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کو انٹرنیشنل قوتوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ عین اسی دوران پشاور کے پبلک سکول میں دہشت گردوں نے معصوم جانوں کو اپنی مذموم حرکت کا نشانہ بنایا جس کے فوراً بعد اس وقت کے آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے پشاور سے لے کر کراچی خصوصاً قبائلی علاقہ میں سخت ترین مسلسل آپریشن کا آغاز کر کے دہشت گردوں کی کمر توڑ کے رکھ دی اور دشمنان پاکستان کی مکروہ چال کو ناکام بنا کے رکھ دیا۔

یہ آج کل کی بات ہی نہیں، ہمسایہ ملک تو شروع دن سے ہی پاکستان کو مٹانے کے درپے ہے۔ عالمی طاقتیں خصوصاً ایٹمی قوت بننے کے بعد سے پاکستان کو پانچ چھ حصوں میں تقسیم کرنے کے منصوبہ کی کئی بار ناکام کوشش کر چکی ہیں جس میں پنجاب کو انڈین پنجاب کے ساتھ، سندھ کو انڈین راجستھان کے ساتھ، خیبر پختونخوا کو افغانستان کے ساتھ اور بلوچستان کو ایران و افغانستان کے ساتھ ملا کر اس ملک کے حصے بخرے کرنے کی سازش کا پلان کئی مرتبہ بنا چکی ہیں۔ کہوٹہ کو تباہ کرنے کے لئے بھی اسرائیلی اور انڈین طیاروں کو ناکامی کا سامان کرنا پڑا کیونکہ ہر مرتبہ کئی طاقتور ممالک کے اس وار سے قدرت پاکستان کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال باہر کرتی رہی ہے۔

اس ملک کے سیاست دانوں، قوم پرست لیڈروں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے ذاتی اور سیاسی مفاد کے

خلوص اور اچھائی اپنے الفاظ میں نہیں اپنی نیت اور فطرت میں پیدا کرو تاکہ تم لوگوں کے عیب نہیں ان کی خوبیاں دیکھ پاؤ۔ بے شک یہ عمل تمہاری عزت اور بخشش کا وسیلہ ہے۔

جواد حیدر۔ تلہ گنگ

لئے، ہر صورت اقتدار کے حصول کی خاطر وہ اس ملک کے حصے بخرے کرنے کی سازش میں مہرہ بننے کے لئے تیار رہتے ہیں اور اگر اس ملک کی فوج ملک کے تحفظ کے لئے اپنی ذمہ داری پوری نہ کرتی تو یہ مفاد پرست اور خودغرض لوگ اس ملک کے حصے بخرے کر کے بیچ کھاتے۔ انہیں اس سے کبھی غرض نہیں رہی کہ ان کے اس مکروہ عمل سے ملک کو کتنا ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ قوم کس تباہی سے دوچار ہو گی۔ نااہل ہونے والے نواز شریف بیرون ملک بلوچی علیحدگی پسندوں اور کالعدم جماعتوں کے لیڈروں سے بھی ملتے رہے ہیں تبھی آرمی یہ واضح بیان دینا پڑا کہ سمندار پار بیٹھے سازشی عناصر جلد قانون کی گرفت میں ہوں گے۔

پاک فوج نے ملک کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ پاکستان کا دشمن ہمارا دشمن ہے۔ کچھ لوگ اور دشمن کی ایجنسیاں ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن پاک فوج دشمنوں کے ناپاک عزائم کامیاب نہیں ہونے دے گی اور اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے قوم کے ساتھ کھڑی ہے۔ جن دس لاکھ شہیدوں نے اس ملک کو بنانے میں اپنا خون بہایا ان کی روحیں بھی خدائے بزرگ و برتر سے اس کے قائم دائم رہنے کی التجا کر رہی ہوں گی اور ان شاء اللہ ان شہیدوں کی لازوال قربانیوں کے طفیل اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس ملک کو قائم دائم رکھے گا۔

RTM 234574
پولو فین
سیلنگ فین
پیڈسٹل فین
ایگزاسٹ فین
اے، جے پنکھے
سیلنگ فین پیڈسٹل فین
ایگزاسٹ فین
اے۔ جے الیکٹرک انڈسٹری
محلہ نور پور شرقی گجرات
053-3521165, 3601318

غزل

ہما طاہر

بغیر وجہ کے پتّا کوئی بکھر نہیں جاتا
گلاب شاخ سے یونہی اتر نہیں جاتا

تیرے بغیر بھی دنیا میں جی رہا ہے کوئی
وہ جس سے تجھ کو پیار نہیں، مر نہیں جاتا

ہر ایک زخم کو رہنا ہے خونچکاں جب تک
جو گھاؤ تُو نے لگایا ہے بھر نہیں جاتا

یہ اب کے دَور ہے کیسا، یہ کیسا زمانہ ہے
پلٹ کے رات کو بھی کوئی گھر نہیں جاتا

مرے حال پہ ہنستی رہیں گی دیواریں
یہ لمحہ نیند کا جب تک گزر نہیں جاتا

سکون کیسے ملے مجھ کو جب تک ہما
چڑھا ہوا ہے جو دریا اتر نہیں جاتا

غزل

حیابٹ کشمیری

مت پوچھ کیسا سفر ہے کیسی کہانی میری
کوئی آفت ہو جیسے موت ناگہانی میری

لکھنے والوں نے لکھی ایسی کہانی میری
دیکھتے رہ گئے خنجر بھی روانی میری

خاک و خون میں ہوئے غلطاں تو کئی شہر گماں
ہو گئی راکھ، معصوم سی جوانی میری

دور تک لشکرِ اعدا کا تھا سیلاب کھڑا
پھر بھی جی دار نے چھوڑی نہ نشانی میری

پتھر کی طرح دل تھا، تو اس شخص نے
رائیگاں کر دی بستی میں جوانی میری

دیکھتی رہ گئی میں آپ سراپا اپنا
مل گئی خاک میں سب شعلہ بیانی میری

کیوں بھٹکتی ہوئی سرشار، کیلی گھر گھر
ڈھونڈتی پھرتی ہے کیا نس مکانی میری

جرم و سزا

ماں، محبت اور موت

''ہم نیچی ذات کے ضرور ہیں''۔ موچی کے بیٹے نے کہا۔ ''لیکن بے غیرت نہیں ہیں۔ تم پہلے اپنی ماں کو دیکھو پھر ہماری ذات اور حیثیت کی بات کرنا''۔

☆ احمد یار خان

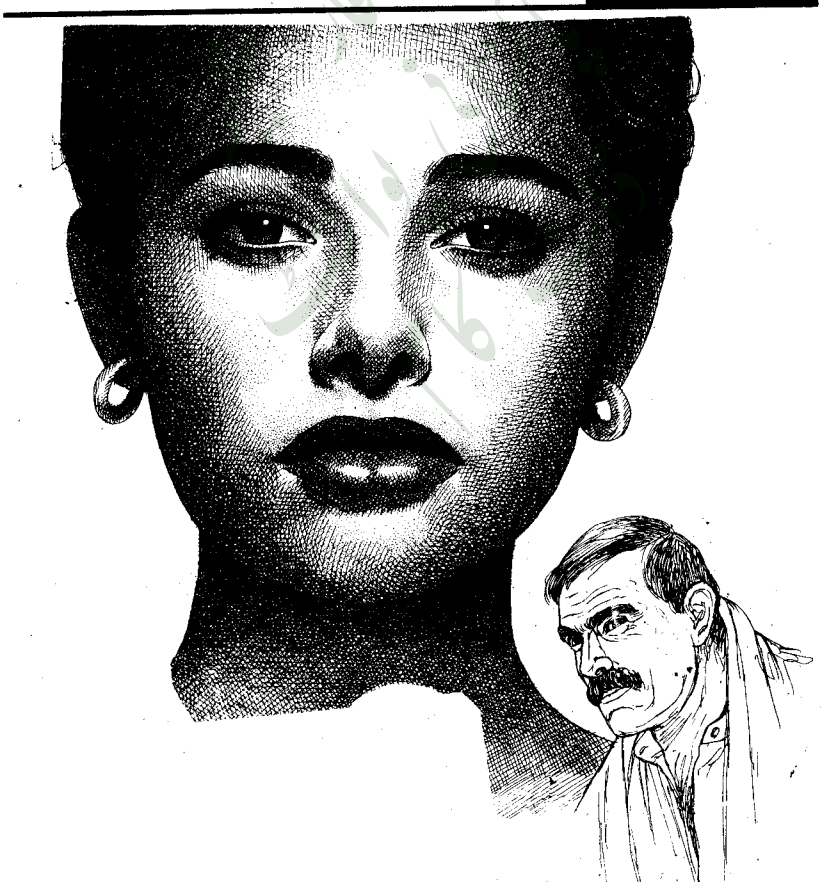

واردات اگر پاکستان کی نہ ہوتی تو میں متعلقہ شہر کا نام اور گاؤں کا نام اور اس واردات میں شامل تمام کرداروں کے نام بالکل ٹھیک ٹھیک لکھتا لیکن میں حسبِ روایت کسی کا نام لے کر بدنامی والی باتیں نہیں سناؤں گا۔ ویسے بھی ان باتوں سے کہانی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

میں نے اپنی ڈیوٹی پکے مسلمانوں کی طرح ایمانداری سے انجام دی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ایسے کیس بھی حل کر لئے جو آج کل کے جدید تعلیم یافتہ اور جدید سہولتوں کے ساتھ بھی نہیں کر سکتے۔ شاید کرتو سکتے ہوں لیکن دیانتداری اور محنت سے کام نہیں لیتے۔

اب میں اپنے دور کی تعریفیں کرنے کی بجائے دوہرے قتل کی واردات کی تفتیش سناتا ہوں۔ یہ واقعہ پنجاب کے ایک بڑے شہر سے پانچ میل دور کے ایک گاؤں کا ہے۔ یہ گاؤں میرے علاقے کے تھانے میں آتا تھا۔ میں اس تھانے کا انچارج تھا۔

ایک روز صبح منہ اندھیرے مجھے جگا کر بتایا گیا کہ قتل کی واردات کی رپورٹ آئی ہے۔ پاکستان کا ابتدائی دور تھا اور آج کل والی قتل وغارت شروع نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے ابھی یہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا کہ قتل یا ڈاکے کی واردات ہوگئی ہے تو وہ اپنی مرضی سے جائے واردات پر جائے گی۔ قتل کی واردات پر فوراً جائے وقوعہ پر نہ پہنچنا قانوناً اور اخلاقاً جرم ہے۔ یہ وجہ تھی کہ میں فوراً جائے واردات پر پہنچا کرتا تھا۔

اس وقت بھی یہی ہوا اور قتل کی واردات کا سن کر مجھے کرنٹ سا لگا اور میں ساری سستی، بھول کر فوراً تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔ وہاں اس گاؤں کا نمبر دار ایک اور دیہاتی آدمی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کو بیٹھنے کو کہا اور پوچھا کہ کون قتل ہو گیا ہے۔

''شادو ہے جی اس کا نام!''۔ نمبر دار نے جواب دیا۔ ''اپنے گاؤں کی عورت تھی۔ اس کی لاش گاؤں کے باہر اینٹوں کے پرانے بھٹے کے پاس پڑی ہے''۔

''لاش کس نے دیکھی تھی؟''۔ میں نے نمبر دار سے پوچھا۔

اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دیہاتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ صبح منہ اندھیرے اپنے کھیتوں میں جانے کے لیے وہاں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر لاش پر پڑ گئی۔ اس نے گاؤں واپس آ کر نمبر دار کو نیند سے جگا کر لاش کے متعلق بتایا۔ نمبر دار سرکاری آدمی تھا، اس نے فوراً اس دیہاتی کو ساتھ لیا اور تھانے آ پہنچا۔

میں نے اسی وقت دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور جائے واردات پر جا پہنچا۔ راستے میں، میں نمبر دار سے مقتولہ شادو کے متعلق پوچھتا گیا۔ نمبر دار نے بتایا کہ شادو قریبی شہر سے بیاہ کر اس گاؤں میں آئی تھی۔ اس کا اصل نام دلشاد بیگم تھا لیکن دیہات کی روایت کے مطابق گاؤں کی عورتوں نے اسے شادو کہنا شروع کر دیا تھا۔

شادی کے پانچ چھ سال بعد اللہ نے اسے ایک بیٹا دیا تھا۔ اس کی اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بیٹا ابھی دو سال کا ہی تھا تو شادو کا خاوند فوت ہو گیا۔ معمولی بخار چڑھا تھا جو بگڑتے بگڑتے بڑے بخار (ٹائیفائیڈ) میں بدل گیا اور جان لے کر ہی ٹلا۔

شادو بھری بہار میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ جوانی کی عمر میں تو تھی ہی، اوپر سے اللہ نے اسے سراپا اتنا حسین دیا تھا کہ بہت سے مردوں نے اشارے کنائے میں اسے عقدِ ثانی کے لیے پیغام بھجوائے اور کچھ نے لوٹ کا مال سمجھے ہڑپ کرنا چاہا مگر اس نے سب کو ٹھکرا دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ بھی نہیں

پڑنے دے گی۔

اب اس کا وہی بیٹا اٹھارہ انیس سال کا جوان ہو چکا تھا مگر شادو کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ نمبردار نے بتایا کہ چالیس سال کی عمر میں بھی وہ جوان ہی لگتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ چوری چھپے دوستیاں لگاتی ہے۔ خاص طور پر دو آدمیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ شادو کے ان سے تعلقات ہیں۔ ان میں سے ایک زمیندار تھا جو خاصا خوش حال تھا اور عورتوں کے معاملے میں بدنام تھا..... دوسرا آدمی سبزیوں کا ایک بیوپاری تھا جو گاؤں سے سبزیاں شہر میں سپلائی کرتا تھا۔

میں نے تفتیش میں یہ سب باتیں معلوم کرنی تھیں۔ اس لیے میں نے ان باتوں کو اپنے ذہن میں رکھ لیا۔

ہم جائے واردات پر پہنچ گئے۔ یہ اینٹوں کا ایک پرانا بھٹہ تھا جو نہ جانے کب سے بند پڑا تھا اور ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ درمیان میں کھڑی اس کی بلند چمنی بھی ٹوٹ کر گر چکی تھی۔ اس کے اطراف میں اینٹیں پکانے کے لیے گہرائی میں جگہ بنی ہوئی تھی۔ نمبردار کے ساتھ آنے والے دیہاتی نے ہماری رہنمائی کی تو میں نے سب کو اسی جگہ رکنے کو کہا اور خود آگے چلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دوسروں کی بے احتیاطی سے جائے واردات پر موجود کھرے ضائع ہوں۔ یہ چونکہ عام راستہ نہیں تھا، اس لیے مجھے یقین تھا کہ کھرے محفوظ ہوں گے۔

میں تھوڑا آگے چلا گیا۔ وہاں بڑی اچھی اوٹ سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں ایک عورت کی لاش کروٹ کے بل پڑی تھی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ اس نے پھولدار شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور پاؤں میں چمڑے کی مہنگی جوتی تھی۔ ایسی جوتیاں گاؤں کی عورتیں استعمال نہیں کرتی تھیں، وہ یقیناً شہر سے لائی ہوگی۔ اس کا دوپٹہ اس کے گلے میں اس طرح پڑا تھا کہ صاف پتہ چل رہا تھا مقتولہ کو گلے میں دوپٹے کا پھندہ ڈال کر گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔

مقتولہ کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں اور دوپٹے کے پھندے کی وجہ سے اس کا منہ کھل گیا تھا اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ مرنے کے باوجود اس کے چہرے کی دلکشی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی گوری چٹی رنگت اور جسم کی بناوٹ اپنے اندر بے حد کشش رکھتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے نمبردار کی باتیں سچ لگنے لگیں۔

میں نے بڑی باریک بینی سے لاش کا اور اس کے اردگرد کی زمین کا جائزہ لیا۔ لاش کے جسم پر کہیں بھی کسی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں تھا بلکہ ایک خراش بھی نہیں تھی۔ اس کی موت گلا گھونٹنے سے ہوئی تھی۔ اس کا دوپٹہ اس کے گلے میں ڈال کر گردن کے پچھلی طرف سے بل دے کر اسے قتل کیا گیا تھا۔

اردگرد کی زمین پر تین قسم کے کھرے نظر آ رہے تھے۔ ایک کھرا تو زنانہ جوتی کا تھا جو مقتولہ شادو نے پہن رکھی تھی اور دوسرے دو کھرے مردانہ جوتوں کے تھے۔ مردانہ کھرے دو مختلف قسم کی جوتیوں کے تھے اور الگ الگ صاف پہچانے جا رہے تھے۔ ایک کھرا تو دیسی جوتی کا تھا جو دیہات میں عام طور پر پہنی جاتی ہے اور اسے کھسہ بھی کہتے ہیں۔ جبکہ دوسرا کھرا خاص قسم کا تھا۔ ایسے جوتے دیہات میں کم ہی لوگ پہنتے تھے لیکن بعض شوقین مزاج دیہاتی ایسے جوتے استعمال کرتے تھے۔ یہ چمڑے کے بنے ہوئے مکیشن تھے۔ اس کے تلوے پر ایک ڈیزائن سا بنا ہوا تھا جو کچی مٹی پر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ تینوں کھرے گاؤں کی طرف سے آئے تھے اور ایک کھرا پچھلی طرف کو جا رہا تھا جبکہ دوسرا گاؤں کی طرف ہی واپس آ رہا تھا۔

میں نے ان دونوں کھروں کو محفوظ کرنے کے لیے مولڈ بنوانے تھے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے

کانسٹیبلوں اور نمبردار کو اپنے پاس بلا لیا۔ کھروں کے مولڈ بنوائے اور نمبردار کو کہا کہ لاش لے جانے کے لئے چار پائی اور آدمیوں کا بندوبست کردے۔ اس کے بعد میں نے نقشہ صورتِ حال مرتب کیا اور موقعہ کی ضروری کارروائی کرلی۔

اتنی دیر میں نمبردار نے گاؤں سے چند آدمی اور چارپائی منگوالی تھی۔ لاش کو چار پائی پر ڈال کر ہم گاؤں میں آگئے۔ سارے گاؤں میں شادو کے قتل کی خبر پھیل گئی تھی اور لوگ اکٹھے ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ ایک نوجوان روتا ہوا آیا اور لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگا۔ نمبردار نے بتایا کہ یہ مقتولہ شادو کا بیٹا ہے۔ اس کا نام صفدر علی بتایا گیا۔ وہ بڑا خوبصورت اور صحت مند نوجوان تھا اور شکل وصورت میں اپنی ماں پر گیا تھا۔

نمبردار نے اپنی بیٹھک میں میرے بیٹھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے ابتدائی پوچھ گچھ شروع کی دی تھی۔ سب سے پہلے میں نے شادو کے قتل کی وجہ معلوم کرنی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر عورت تھی اس لیے کسی سے عشق وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دشمنی کے بارے میں غور کیا تو یہی سوچ سامنے آئی کہ ایک عورت کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔ ایک ہی بات ہوسکتی تھی کہ مقتولہ کے کسی کے ساتھ تعلقات ہوں گے اور وہ چوری چھپے اس سے ملتی ہوگی۔ اس کا کوئی اور بھی امیدوار ہوگا جس نے رقابت کی وجہ سے شادو کو قتل کر دیا۔

بہر حال یہ تو میرے مفروضے تھے۔ اصل بات تفتیش کے بعد ہی سامنے آنی تھی۔ میں نے صرف نمبردار کی رپورٹ پر ہی بھروسہ نہیں کرنا تھا۔ میں نے نمبردار کو کہا کہ وہ مقتولہ شادو کے بیٹے صفدر کو بلوا دے۔ نمبردار نے اپنا آدمی بھیجا اور اس کو کہا کہ وہ صفدر کو یہاں لے آئے۔ وہ آدمی چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد صفدر کو ساتھ لے آیا۔ میں نے صفدر کے ساتھ رسمی اظہار افسوس کیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ اس کے چہرے سے اتنا غم ظاہر نہیں ہو رہا تھا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا لیکن اب اس کے چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا۔ آنکھیں بھی ایسی تھیں جیسے رویا ہی نہ ہو۔

میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس سے پوچھا کہ ان لوگوں کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں ہے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''ہمارا کسی کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا یا خاندانی دشمنی نہیں ہے''۔

''جائیداد کا کوئی جھگڑا ہوگا؟''۔ میں نے پوچھا۔

''نہیں، بالکل نہیں''۔ اس نے کہا۔ ''میرے باپ کا کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ اس وجہ سے ایسے کسی مسئلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا''۔

''دیکھو صفدر!''۔ میں نے اسے کہا۔ ''میں نے تفتیش کرنی ہے اور تمہاری ماں کے قاتل کو پکڑنا ہے۔ اس کے لیے مجھے تم سے کچھ ایسے سوال بھی پوچھنے پڑیں گے جو ایک بیٹا برداشت نہیں کرسکتا لیکن یہ میری مجبوری ہے..... مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد کئی لوگ تمہاری ماں سے شادی کے امیدوار تھے لیکن تمہاری ماں نے سب کو جواب دے دیا۔ اب اتنے عرصے بعد بھی میں نے سنا ہے کہ دو ایسے آدمی ہیں جو تمہاری ماں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے کسی نے غصے میں آکر تمہاری ماں کو قتل کر دیا ہو؟''

وہ منہ سے کچھ نہ بولا اور خالی خالی نظروں سے میرا منہ دیکھتا رہا۔

''کیا تمہارے علم میں ایسا کوئی آدمی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ سب بکواس ہے''۔ اس نے غصے سے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ غالباً مجھ سے نظر نہیں ملانا چاہتا تھا۔

میں نے اس کو کہا کہ وہ میری طرف دیکھ کر بات کرے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس نے چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھا پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ میں اس کی حالت کو سمجھ رہا تھا۔ ایک بیٹا بھلا اپنی ماں کے بارے میں ایسی بات کیسے کر سکتا ہے۔

''جیسے آپ نے سنا ہے، ویسے میں نے بھی سنا ہے''۔ بالآخر اس نے نظریں جھکائے جھکائے بڑی مشکل سے کہا۔ ''لوگ میری ماں کے بارے میں ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں''۔

''کیسی باتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ اس کے عباس شاہ سے تعلقات ہیں''۔ اس نے کہا اور پھر یکدم بھڑک کر ایک ننگی گالی دے کر بولا۔ ''بھونکتے ہیں سب..... سب کتے ہیں''۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''یہ عباس شاہ کون ہے؟''۔ میں نے پوچھا۔

''ہمارے گاؤں کا آدمی ہے''۔ اس نے کہا۔ ''شہر کی منڈی میں سبزیوں پھلوں کا کام کرتا ہے''۔

مجھے یاد آ گیا کہ سبزیوں کے بیوپاری کے متعلق مجھے نمبردار نے بھی بتایا تھا۔ مجھے یہی سوچ آ رہی تھی کہ عباس شاہ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ شادو کو قتل کر دے۔ ایک اور سوال یہ تھا کہ شادو بھٹے کے کھنڈر میں کس کو ملنے گئی تھی، عباس شاہ سے یا کسی اور سے؟ اگر وہ عباس شاہ سے ملنے گئی تھی تو پھر دوسرا آدمی کون تھا جس کے کھرے جائے واردات پر پائے گئے تھے۔ شادو کو عباس شاہ نے قتل کیا یا اس دوسرے آدمی نے؟ سب سے اہم بات یہ معلوم کرنا تھی کہ دوسرا آدمی کون ہو سکتا ہے جس کے کھرے لاش کے پاس پائے گئے ہیں۔

میں نے بہت سوچا مگر فوری طور پر کوئی تسلی بخش جواب ذہن میں نہ آیا۔ میں نے مقتولہ کے بیٹے صفدر علی کو جانے کی اجازت دے دی اور کچھ ضروری کارروائیاں کر کے تھانے چلا آیا۔ لاش کو میں نے پہلے پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دیا تھا۔ شام تک اس کی رپورٹ بھی مل جانی تھی۔

منہ بولی بہن

میں نے تھانے میں آ کر فوراً اپنے مخبروں کو طلب کر لیا جن میں دو عورتیں بھی تھیں۔ میں نے ان کو سمجھا دیا کہ میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ عورتیں اور مرد تھے جو گھروں کے اندر کی وہ باتیں بھی معلوم کر لاتے تھے جو سات پردوں میں چھپ کر کی جاتی تھیں۔

فوری طور پر دو شخص میری نظر میں مشتبہ تھے اور میں انہی سے تفتیش کا آغاز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان میں ایک تو عباس شاہ تھا اور دوسرا وہ زمیندار جو شادو کا عاشق بنا ہوا تھا۔ اس کا نام مجھے سلامت علی بتایا گیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے پوسٹمارٹم رپورٹ کا انتظار تھا اور مجھے یہ امید تھی کہ شام تک مخبر اپنی اپنی رپورٹ لے کر آ جائیں گے۔

پچھلے پہر تک پوسٹمارٹم رپورٹ آ گئی۔ ڈاکٹر نے موت کا باعث وہی لکھا تھا جو میں پہلے بتا چکا ہوں یعنی سانس رکنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ ایک اور خاص بات جو میں نے معلوم کرنے کے لیے ڈاکٹر کو لکھ کر بھیجا تھا، اس کا ڈاکٹر نے الگ نوٹ لکھ کر جواب دیا تھا۔ اس نوٹ کے مطابق قتل سے پہلے مقتولہ کی مرضی سے یا زبردستی جنسی فعل کیا گیا تھا۔ یہ بات میں نے لاش کو دیکھتے ہی بھانپ لی تھی مگر میں اس کی

مزید تصدیق چاہتا تھا۔ اب پوسٹمارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے باقاعدہ تصدیق کر دی تھی۔

یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی۔ انسانی فطرت کو دبانا بڑا مشکل کام ہے۔ شادو جوانی کے عالم میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ ازدواجی زندگی گزار چکی تھی۔ ان حالات میں جب اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا اور تنہا اپنے بیٹے کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی جبکہ باہر اس کے لیے گناہ کی ترغیب بھی موجود تھی، اس کا بہک جانا کوئی انہونی نہیں تھی۔ وہ جذبات میں آ کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر تو بیٹھی تھی لیکن اپنی فطری ضرورت کو دبا نہیں سکتی تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیتی اور یوں ویرانے میں قتل نہ ہوتی۔

میں نے اسی وقت سلامت علی اور عباس شاہ کو تھانے بلانے کا فیصلہ کر لیا اور دو کانسٹیبلوں کو بھیج دیا کہ وہ ان کو تھانے لے آئیں۔ ابھی کانسٹیبلوں کو گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میرے دو مخبر آ گئے۔ ان میں ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ انہوں نے جو رپورٹ دی اس سے میرا شک عباس شاہ اور سلامت پر پختہ ہو گیا۔

مخبروں نے بتایا کہ خاوند کے مرنے کے بعد کچھ عرصہ تو شادو ڈٹ کر رہی اور اس نے اپنی پوری توجہ بیٹے کی پرورش پر لگا دی۔ اس دوران شادو کے امیدواروں کی امیدیں ٹوٹ گئیں اور وہ مایوس ہو گئے۔ صرف دو آدمی مستقل مزاجی سے جمے رہے جو عباش شاہ اور سلامت علی تھے۔ وہ شادو کی مدد کرنے کے بہانے اس سے تعلقات بڑھاتے رہے۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ عباش شاہ کا شادو کے گھر آنا جانا بڑھ گیا اور وہ گاؤں سے باہر بھی کہیں نہ کہیں اکٹھے نظر آنے لگے۔ دیہات میں ایسی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ جب لوگ باتیں بنانے لگے اور شادو بدنام ہونے لگی تو عباس شاہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کو وہ اپنی بہن سمجھتا ہے اور ان کا ایسا ویسا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری طرف سلامت علی نے شادو سے دوستی کرنے میں ناکام ہو کر عباس شاہ کو دھمکی دی کہ وہ شادو سے دور رہے ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ عباس شاہ کسی کا محتاج نہ تھا جو وہ دب جاتا۔ اس نے بھی دھمکی کا جواب دھمکی سے دیا اور سلامت علی کو پیغام بھجوایا کہ اگر اس نے شادو اور اس کے بیچ ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو وہ اس کی ٹانگیں توڑ دے گا۔

مخبر نے یہ بھی بتایا کہ ایک دو مرتبہ سلامت علی اور عباس شاہ کی آپس میں تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ سلامت علی نے عباس شاہ کو کہا تھا کہ وہ اور شادو بدکاری سے باز آ جائیں ورنہ دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر قتل کر دے گا۔

میں نے دونوں سے کچھ اور باتیں پوچھا کہ ان کو جانے کو کہا۔

وہ دونوں چلے گئے تو میں ان کی معلومات پر غور کرنے لگا۔ مخبروں کی رپورٹ کے مطابق قتل کا سارا شک سلامت علی پر جاتا تھا۔ اس طرح ہوا ہو گا کہ عباس شاہ اور شادو بھٹے کے کھنڈر کے اندر ملاقات کے لیے گئے ہوں گے اور اس ملاقات کا علم کسی طرح سلامت علی کو ہو گیا۔ وہ موقعہ پر پہنچ گیا۔ اس کو آتے دیکھ کر عباس شاہ وہاں سے کھسک گیا اور سلامت علی نے رقابت کے جوش میں آ کر شادو کا دوپٹہ اس کے گلے میں ڈال کر اس کو قتل کر دیا۔

یہ محض میرا قیاس تھا اور میں نے اس پر غور کیا تو مجھے خیال آیا کہ اگر سب کچھ ایسے ہی ہوا ہے جیسے میں نے سوچا ہے تو اس صورت میں عباس شاہ کو تھانے میں آ کر سلامت کے خلاف بیان دینا چاہتے تھا۔ وہ موقعہ کا گواہ تھا اور اس کی گواہی سلامت علی کو پھانسی کے تخت تک پہنچا سکتی تھی۔

پھر عباس شاہ تھانے کیوں نہیں آیا؟

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب عباس شاہ ہی دے سکتا تھا۔ اب مجھے بے چینی سے سلامت علی اور عباس شاہ کا انتظار تھا۔

بدکاری سے باز آجاؤ

پہلے وہ کانسٹیبل آیا جو سلامت علی کو لینے گیا ہوا تھا۔ وہ سلامت علی کو ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سلامت کو میرے پاس بھیج دے اور اگر اس دوران دوسرا کانسٹیبل عباس شاہ کو لے کر آجائے تو اس کو الگ کمرے میں اس طرح بٹھا دے کہ سلامت علی کا اس سے آمنا سامنا نہ ہو سکے۔ کانسٹیبل میری بات سمجھ گیا اور پھر سلامت علی کو میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

سلامت علی اونچے لمبے قد کا جوان تھا۔ اللہ نے اس کو گٹھا ہوا جسم اور اچھی صحت دی تھی۔ مگر ایک خامی ایسی تھی جو اسے دوسروں سے کمتر بنا دیتی تھی۔ وہ یہ کہ اس کے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے داغ تھے جن کی وجہ سے اس کا چہرہ خاصا بدنما لگتا تھا۔ فوراً ہی مجھے اس بات کی سمجھ آگئی کہ شادو نے اس کو ٹھکرا کر عباس شاہ سے دوستی کیوں کی تھی۔

میں نے اس کو کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ وہ ذرا بھی پریشان نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کیں پھر میں نے بات کا رخ شادو کی طرف پھیر دیا اور کہا کہ بے چاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔

''برے کاموں کا بُرا ہی نتیجہ ہوتا ہے سرکار!'' سلامت علی نے فوراً کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ساری دنیا کو معلوم ہے جی!'' اس نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''وہ اور عباس شاہ بدکاری کرتے تھے''۔

''سچ سچ بتاؤ، عباس شاہ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی دشمنی نہیں سرکار!'' اس نے چونکنے انداز میں جواب دیا۔

''پھر تم نے اسے دھمکی کیوں دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''کون سی دھمکی سرکار؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''بدکاری سے باز آجاؤ''۔ میں نے کہا۔ ''ورنہ میں رنگے ہاتھوں پکڑ کر دونوں کو قتل کر دوں گا..... یہی دھمکی دی تھی ناں تم نے؟''

وہ گھبرا کر میری صورت دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ جیسے اس کے حلق میں اٹک گئے ہوں۔ وہ تھوک نگلنے لگا۔

''پھر تم نے اپنی دھمکی پر عمل کر کے دکھا دیا''۔ میں نے اسے کمزور پا کر اور دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''عباس شاہ کیسے بچ نکلا؟''

''وہ تو..... وہ تو.....'' اس نے ہکلاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔ ''میں نے ویسے ہی اسے ڈرانے کے لیے کہا تھا''۔ پھر اس نے ذرا سنبھل کر کہا۔ ''اگر قتل ہی کرنا ہوتا تو میں عباس شاہ کو کرتا''۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے''۔ میں نے کہا۔ ''جب تم وہاں پہنچے ہو تو عباس شاہ وہاں ابھی پہنچا ہی نہ ہو اور تم نے شادو کو اکیلا پا کر زبردستی کرنے کی کوشش کی ہو۔ جب وہ تمہارے قابو نہیں آئی تو تم نے اس کے دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا تاکہ وہ کسی کو کچھ بتا نہ سکے''۔

میری یہ بات سن کر وہ تڑپنے لگا اور قسمیں کھا کھا کر مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ شادو کو اس نے قتل نہیں کیا اور وہ بے گناہ ہے۔ میں اس کی قسموں اور واویلے پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے حالات و

واقعات اور پھر ثبوت کے سہارے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانا تھا۔

میں نے اس کے جوتوں کو غور سے دیکھا۔ وہ دیہاتیوں والا کھسہ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے ابھی اس کو کچی زمین پر چند قدم چلا کر اس کے کھرے بھی دیکھنے تھے۔ واردات والی جگہ پر پائے جانے والے دونوں کھرے میرے دماغ میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ واردات والی رات وہ کہاں تھا۔

''میں اپنے گھر میں تھا سرکار!'' اس نے جواب دیا۔

''یہاں جو بھی کہو، سوچ سمجھ کر کہو''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیونکہ تم جو بھی کہو گے میں اپنا آدمی بھیج کر اس کی تصدیق کراؤں گا''۔

ابھی میں سلامت علی سے تفتیش کر رہا تھا کہ کانسٹیبل نے آ کر مخصوص اشارے سے بتایا کہ عباس شاہ بھی آ گیا ہے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ سلامت علی کو حوالات میں بند کر دے اور دوسرے بندے کو لے آئے۔

حوالات کا نام سن کر سلامت علی میری منت سماجت کرنے لگا کہ میں اس کو حوالات میں نہ بھیجوں لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور کانسٹیبل اسے کھینچ کھانچ کر وہاں سے لے گیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ عباس شاہ کو میرے پاس لے آئے۔

عباس شاہ آیا تو اسے دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ پختہ عمر آدمی تھا۔ رنگ سرخ و سفید اور انتہائی جاذب نظر نقوش۔ میرے دماغ نے اسے دیکھتے ہی فیصلہ دے دیا کہ اس کی خاطر کوئی عورت پاگل ہو سکتی ہے اور اس پاگل پن میں قتل کر بھی سکتی ہے اور خود قتل ہو بھی سکتی ہے۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔

میں نے اس کو بیٹھنے کو کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ میں نے بلا تمہید اس کو کہا کہ وہ سمجھ گیا ہو گا کہ میں نے اس کو کیوں بلایا ہے۔

''لوگوں نے مجھے شادو کے ساتھ بدنام کر رکھا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''اب وہ بے چاری قتل ہو گئی ہے تو پوچھ گچھ کے لیے آپ کا مجھے بلانا قدرتی بات ہے''۔

وہ چونکہ شہر میں کاروبار کرتا تھا اور اس کا واسطہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا رہتا تھا اس لیے اس کے لہجے خاصا اعتماد تھا۔

''تو کیا لوگ غلط کہتے ہیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''لوگوں کا کیا ہے جی!'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''لوگ تو پیغمبروں کو بھی نہیں چھوڑتے''۔

''نہ تم پیغمبر ہو نہ میں لوگوں میں سے ہوں''۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کو یہ چکر دے سکتے ہو کہ تم نے شادو کو منہ بولی بہن بنا رکھا ہے لیکن میں کبھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا اور کتنی ہی بیوہ عورتیں ہوں گی اور ضرورت مند بھی ہوں گی، تم نیان میں سے کسی کو کیوں نہیں بہن بنا لیا..... صاف بات یہ ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھی اور تم نے اس کے ساتھ دوستی لگالی جو بڑھتے بڑھتے ناجائز تعلقات میں بدل گئی۔ سیدھی سیدھی بات کرو، تمہاری مقتولہ کے ساتھ دوستی تھی یا نہیں؟''

اس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن اس انداز میں سر جھکا لیا جیسے اعتراف کر رہا ہو۔ اس کی ساری چالاکی اور تیزی غبارے سے ہوا کی طرح نکل چکی تھیں۔

''قتل والی رات تم اس کے ساتھ تھے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ کچھ سوچنے لگا اور اس کے چہرے پر کشمکش سی

نظر آنے لگی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کیا جواب دے۔

''جھوٹ نہ بولنا عباس شاہ!'' میں نے اس کو گومگو کے عالم میں دیکھ کر کہا۔ ''مجھے سچ کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جائے گا اور پھر میں تم کو چھوڑوں گا نہیں..... میں تم پر قتل کا الزام نہیں لگاتا، تم نے کوئی جرم نہیں کیا..... سچ بولو، فائدے میں رہو گے''۔

''ہاں، میں اس کے ساتھ تھا''۔ اس نے کہا اور اس کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ مر جائے گی، ورنہ میں کبھی اسے چھوڑ کر نہ آتا''۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

میں اس کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا ردعمل تھا ہی حیران کن۔ مقتولہ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ بس دوستی تھی اور وہ بھی ناجائز تعلقات۔

انسانی فطرت بھی ایک عجوبہ ہے۔ اس بات کا زندہ ثبوت میرے سامنے تھا۔ میں نے عباس شاہ سے کہا کہ وہ تفصیل سے ساری بات مجھے سنائے۔ اس نے جو بات سنائی، وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔

قاتل سایہ

شادو شہر سے بیاہ کر گاؤں میں آئی تو اس کا حسن دیکھ کر عورتیں رشک کرنے لگیں اور مرد اس کی آرزو کرنے لگے۔ یہ بات آرزو کرنے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے تک ہی محدود رہی کیونکہ وہ کسی کی بیوی تھی۔ یہی بیوی جب بیوہ ہوئی تو چند مردوں کے دل میں سوئی ہوئی شادو کو حاصل کرنے کی خواہش نے انگڑائی لی اور انہوں نے خود کو شادو کے سہارے کے لیے پیش کر دیا۔ ان میں عباس شاہ اور سلامت علی بھی شامل تھے۔ شادو نے سب کو کورا جواب دے دیا مگر عباس شاہ اس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔

وہ عباس شاہ سے شادی پر تیار ہو گئی تھی لیکن اسے اپنے گھر والوں اور بھائی کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔ وہ اس کی شادی اپنی ہی برادری میں اور اپنے قریب کے ایک رشتے دار سے کرنا چاہتے تھے لیکن شادو کو وہ آدمی بالکل پسند نہیں تھا۔ اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی اور اپنے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گی۔

دوسری طرف عباس شاہ نے اپنی کوشش جاری رکھی اور شادو سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کی یہ دوستی بڑھتے بڑھتے تمام حدود پھلانگ گئی۔ عباس شاہ اور شادو کا تعلق اگرچہ ناجائز تھا اور اس کو کسی بھی صورت میں محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا لیکن عباس شاہ نے محسوس کیا کہ وہ شادو کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور شادو سے اس کا تعلق محض جسمانی ہی نہیں بلکہ روحانی بھی بن گیا ہے۔ وہ شادو کی دوری ذرا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کئی بار شادو سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ باقاعدہ نکاح کر لے مگر شادو نہ مانی۔

شادو کا کہنا تھا کہ اب اس کا بیٹا بڑا ہو رہا ہے اور ہر بات کو سمجھتا ہے اور پھر اس کے ماں باپ اور بھائی اس سے ناراض ہو جائیں گے۔ شادو نے عباش شاہ کو اصل بات بتائی جس کی وجہ سے وہ عباس شاہ یا کسی اور آدمی سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ بات یہ تھی کہ برادری کے جس آدمی کے لیے شادو کا رشتہ مانگا جا رہا تھا وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ اس کی بیوی مر گئی تھی۔ شادو کی چھوٹی بہن اس آدمی کے چھوٹے بھائی سے بیاہی ہوئی تھی اور اپنے گھر بہت خوش تھی۔

وہ آدمی عمر میں بھی شادو سے خاصا بڑا تھا اور شکل وصورت بھی بس ایسی ویسی ہی تھی۔ شادو کسی صورت اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی کہ وہ ساری عمر دوسری شادی نہیں

کرے گی۔ اب اگر وہ کہیں اور شادی کرتی تو اس آدمی کے گھر والے انتقامی کارروائی کرتے اور شادو کی چھوٹی بہن کا ہنستا بستا گھر اجاڑ سکتے تھے۔

بہر حال ان کی دوستی جاری رہی اور انہوں نے دل کو تسلی دینے کے لیے اور احساسِ گناہ سے بچنے کے لیے خدا کو گواہ بنا کر ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا جس کی کوئی قانونی اور شرعی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اکثر اینٹوں کے بھٹے کے کھنڈر میں ملاقاتیں کرتے تھے اور کبھی عباس شاہ شادو کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔

واردات والی رات بھی وہ کھنڈر میں اکٹھے ہوئے تھے جب اچانک سوکھے پتوں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ کوئی اس طرف آرہا تھا۔ عباس شاہ نے اوٹ میں سے دیکھا، اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ایک سایہ کھنڈر کی طرف آرہا تھا۔ شادو نے عباس شاہ سے کہا کہ وہ دوسری طرف سے نکل جائے اور شادو سامنے سے گاؤں چلی جائے گی۔ آنے والا یہی سمجھے گا کہ وہ ضروری حاجت سے فارغ ہو کر آرہی ہے۔

عباس شاہ نے کچھ بھی نہ سوچا اور گھبراہٹ میں پچھلی طرف سے کھنڈر سے نکلا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر گاؤں آگیا۔ صبح ہوئی تو گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ پرانے بھٹے کے کھنڈر میں شادو کی لاش پڑی ہے۔

یہ خبر سن کر عباس شاہ کی جذباتی حالت بہت بُری ہو گئی اور وہ پچھتانے لگا کہ کیوں شادو کو اکیلا چھوڑ کر وہاں سے بزدلوں کی طرح نکل آیا تھا۔

''تم نے اس سائے کو پہچانا نہیں تھا؟'' میں نے عباس شاہ کی ساری بات سن کر سوال لیا۔

''اندھیرا بہت تھا''۔ عباس شاہ نے کہا۔ ''ابتدائی راتوں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ ایک تو چاندنی کم تھی اور پھر چاند آنے والے کے پچھلی طرف تھا جس کی وجہ سے اس کے خدوخال نظر نہیں آرہے تھے''۔

''تمہیں کسی پر شک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں خواہ مخواہ کسی کا نام نہیں لوں گا''۔ عباس شاہ نے کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ قتل کس نے کیا ہے تو اپنے ہاتھوں شادو کا بدلہ لوں گا''۔

''کیا یہ کام سلامت علی کا ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس نے تم دھمکی دی تھی کہ وہ تم دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر قتل کر دے گا''۔

''اس میں اتنی ہمت نہیں ہے''۔ عباس شاہ نے یقین سے کہا۔ ''ویسے بھی سلامت علی کا قد خاصا لمبا ہے جبکہ وہ سایہ اتنا طویل قامت نہیں تھا''۔

میں نے عباس شاہ سے بہت سارے سوال اور بھی پوچھے مگر وہ کام کی کوئی مزید بات نہ بتا سکا۔ اس کے بیان سے ایک بات طے ہو گئی تھی کہ سلامت علی بے گناہ ہے۔

میں نے عباس شاہ کو یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ اپنے طور پر سراغ لگانے کی کوشش کرتا رہے اور جونہی کوئی کام کی بات معلوم ہو تھانے آکر مجھے بتائے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سلامت علی کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔ عباس شاہ کے بیان کے بعد اس کو رکھنا نہیں تھا۔

عباس شاہ اور سلامت علی کے جانے کے بعد میں غور کرنے لگا کہ واردات والی رات عباس شاہ نے جس سائے کو کھنڈر کی طرف آتے دیکھا تھا وہ کون ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ کیا واقعی قاتل وہی ہے یا پھر عباس شاہ نے مجھے بھٹکانے کے لیے کوئی کہانی گھڑی ہے اور شادو کو اس نے خود ہی قتل کیا ہو۔

یہاں تک آکر میں خود ہی اپنے اس خیال کی تردید کرنے لگتا کہ عباس شاہ قاتل ہو سکتا ہے۔ مجھے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ یہ قتل عباس شاہ نے کیا ہے۔

سوچ سوچ کر میرا سر گھومنے لگا لیکن کچھ سمجھ نہ آئی۔ میں نے باقی کی کارروائی اگلے دن پر ڈال دی اور آرام کرنے کے لیے تھانے سے نکل آیا۔

غیرت مندوں والا کام

اگلا دن خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ میرے مخبر جو اطلاعیں لے کر آئے تھے وہ میری تفتیش کو ایک نیا راستہ دکھا رہی تھیں۔ ان اطلاعات کے مطابق شادو کے والدین یا بھائی کبھی کبھار شادو سے ملنے آتے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار شادو سے کہا بھی تھا کہ وہ ان کے پاس شہر آجائے مگر شادو نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ گاؤں میں اس کے مرحوم خاوند کی اچھی خاصی زمین اور اتنا بڑا مکان ہے جو وہ لاوارث چھوڑ کر نہیں آسکتی۔

جب لوگوں نے عباس شاہ کے سلسلے میں شادو کو بدنام کرنا شروع کیا تو یہ باتیں شادو کے بھائی رفیق کے کانوں میں بھی پڑیں اور اس نے بڑی سختی شادو سے پوچھ گچھ کی تھی۔ شادو نے قسمیں کھا کھا کر رفیق کو یقین دلایا تھا کہ لوگ ویسے ہی جھوٹی باتیں کرتے ہی اور اس کا عباس شاہ سے کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں ہے۔

قتل سے ایک دن پہلے بھی شادو کا بھائی رفیق اس سے ملنے آیا تھا اور دونوں کے درمیان خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ رفیق نے شادو سے کہا تھا کہ اگر اسے معلوم ہوگیا کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے تو وہ اپنے ہاتھوں شادو کا گلا گھونٹ دے گا۔

اور پھر اگلی رات ہی شادو کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔ اس سے بجا طور پر رفیق پر شک کیا جا سکتا تھا کہ اس نے غیرت کے جوش میں آکر بہن کو قتل کر ڈالا اور چپکے سے شہر واپس چلا گیا۔

میں جتنا اس امکان پر سوچتا گیا میرا شک پختہ ہوتا گیا۔ میں نے رفیق کو بھی شاملِ تفتیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شادو کے ماں باپ، رفیق اور دیگر رشتہ دار ابھی گاؤں میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے شادو کے بیٹے صفدر کی مرضی پر شادو کو گاؤں میں ہی دفن کر دیا تھا اور اب قل وغیرہ کے لیے رکے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ مقتولہ شادو کے بھائی کو تھانے لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد رفیق کو ساتھ لے کر آگیا۔

میں نے رفیق کے ساتھ اس کی بہن کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔

''میں نے تو کئی بار اس کو کہا تھا''۔ اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''کہ گاؤں کو چھوڑ دے اور ہمارے پاس شہر آجائے مگر وہ مانتی ہی نہیں تھی۔ آخر گاؤں میں ہی ماری گئی''۔

''تم کو کسی پر شک ہے؟''۔ میں نے پوچھا۔ ''کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا یا خاندانی دشمنی؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں''۔ اس نے جواب دیا۔ ''ہماری کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں کہ قتل تک نوبت آ پہنچے..... اور کوئی ایسا مشکوک فرد بھی نہیں ہے جس پر شبہ کیا جا سکے کہ اس نے شادو کو قتل کیا ہوگا''۔

''مرحومہ کے متعلق کچھ ایسی ویسی بات کرنا مناسب نہیں''۔ میں نے محتاط انداز میں اس سے کہا۔ ''لیکن میں چونکہ تفتیش کر رہا ہوں، اس لیے کچھ ایسے سوال بھی کروں گا جو تمہیں ناگوار گزریں گے..... میں نے سنا ہے کہ مقتولہ کی کسی آدمی ساتھ دوستی تھی''۔ میں نے ناجائز تعلقات کی بجائے دوستی کا نرم لفظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''سنا تو میں نے بھی تھا''۔ اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مقتولہ کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا تھا''۔ میں نے کہا۔ ''اور قتل سے ایک دو دن پہلے تم نے اپنی بہن کو

قتل کرنے کی دھمکی دی تھی، کیا یہ سچ ہے؟''

اس نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھا پھر اعتراف کے انداز میں سر ہلا دیا۔

''تم نے غیرت مندوں والا کام کیا ہے رفیق!''۔ میں نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔''اب بہادروں کی طرح اپنے جرم کا اقبال بھی کرلو''۔

میری یہ بات سن کر وہ بیٹھا بیٹھایوں اچھلا جیسے کرسی نے اسے کھاٹ کھایا ہو۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب!'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''وہ تمہارے سمجھانے کے بعد بھی باز نہیں آئی تھی''۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کو کسی طرح علم ہوگیا کہ وہ عباس شاہ کو کھنڈر میں ملنے جاتی ہے، تم نے اس پر نظر رکھنی شروع کردی۔ آخر تمہیں موقع مل گیا اور تم رات کو آئے اور چپکے سے اسے قتل کر کے واپس شہر چلے گئے تمہارا خیال تھا کہ تم کو کسی نے نہیں دیکھا''۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔''لیکن گاؤں کے چوکیدار نے تم کو گاؤں سے نکلتے دیکھ لیا تھا''۔

وہ تڑپ اٹھا اور قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ چوکیدار کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

''آپ چوکیدار کو یہاں بلا لیں''۔ اس نے کہا۔

''میں تو اس روز ایک دوست کی شادی میں گیا ہوا تھا۔ میں آپ کو اس کا نام پتہ لکھوا دیتا ہوں، آپ کانسٹیبل بھیج کر تصدیق کرالیں''۔

میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر خطا گیا تھا۔ مجھے اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے بتائے ہوئے دوست کے گھر کانسٹیبل بھیج کر تصدیق کرانے کا فیصلہ کرلیا اور اسی وقت ایک کانسٹیبل کو شہر بھجوا دیا۔ شہر زیادہ دور نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے جلد ہی واپس آ جانا تھا۔ اس کے بعد میں نے رفیق کو جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ وہ میری اجازت کے بغیر گاؤں سے باہر نہ جائے۔ وہ چلا گیا تو میں بڑی بے چینی سے اس کانسٹیبل کا انتظار کرنے لگا جس کو شہر بھیجا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ کانسٹیبل آ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ رفیق کے بیان کی تصدیق کر کے آیا ہے۔ اس کا بیان بالکل ٹھیک ہے۔

میں نے کانسٹیبل کو بھیج دیا اور خود سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کیس میں میں تفتیش کرتا ہوا جس راستے پر بھی آگے بڑھتا تھا، وہ راستہ آگے جا کر بند ملتا تھا۔

میں ایک بار پھر نئے سر سے اس کیس پر غور کرنے لگا۔ اس وقت تک میرے سامنے تین مشتبہ آئے تھے اور حالات و شواہد تینوں کو بے گناہ ثابت کر رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خاص بات نظر انداز کر گیا ہوں۔ میں جوں جوں غور کرتا گیا، میرا ذہن اور الجھتا گیا۔ قتل کو دوسرا دن تھا اور میری تفتیش ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہ دن بھی گزر گیا۔

لاش اور ٹوٹی چوڑیاں

رات سونے کے لیے لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار ذہن میں کیس کے متعلق ایک کھچڑی سی پک رہی تھی۔ میرا ذہن گھن چکر بن گیا تھا۔ اس کیس نے میری نیند اُڑا دی تھی۔ جانے رات کے کس وقت میری آنکھ لگ گئی اور میں ایسا بے خبر ہو کے سویا کہ کچھ خبر نہ رہی۔

اس روز اگر تھانے سے ہیڈ کانسٹیبل مجھے بلانے نہ آجاتا تو میں دوپہر تک سوتا ہی رہتا۔ میں بڑی مشکل سے اٹھا۔ نیند کا خمار ابھی تک طاری تھا۔ وقت دیکھا تو ابھی صبح کے سات ہی بجے تھے۔ بڑی کوفت ہوئی۔

میرا خیال تھا کہ شادو کے کیس کے متعلق کوئی اہم اطلاع ملی ہوگی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کانسٹیبل کی بات سن کر دوبارہ سو جاؤں گا اور تازہ دم ہو کر ہی تھانے پہنچوں گا۔ مگر کانسٹیبل نے جو خبر مجھے سنائی، اس نے میری ساری سستی اور نیند اڑا دی۔

اس نے بتایا کہ نمبردار یہ اطلاع لے آیا ہے کہ مقتولہ شادو کا بیٹا صفدر علی اپنے گھر میں مردہ پڑا ہوا ہے۔ کسی نے اس کا گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔ میں ساری سستی بھول کر اسی وقت تھانے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے نمبردار سے تفصیل پوچھی تو نمبردار نے بتایا کہ مقتولہ شادو کے قتل وغیرہ کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ شادو کے ماں باپ یعنی مقتول کے نانا، نانی اور ماموں نے اس کو کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلے مگر اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ بعد میں آئے گا ابھی وہ یہیں رہے گا۔

صفدر کی عادت تھی کہ گاؤں کے نوجوان لڑکوں کے ساتھ صبح سویرے کسرت کے لیے کھلی جگہ پر جاتا تھا۔ اس صبح بھی اس کا ایک دوست اسے گھر سے بلانے کے لیے آیا۔ اس نے پہلے تو آوازیں دیں اور دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو اسے تشویش ہوئی۔ اس نے دروازے کو دھکا دے کر دیکھا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ شاید صفدر باہر نکل گیا ہوگا۔ اس کو معلوم تھا کہ صفدر گھر میں اکیلا ہے، اس لیے وہ اندر چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے دیکھا کہ صفدر علی مرا پڑا ہے۔ ڈر گیا اور سیدھا نمبردار کی حویلی میں چلا گیا اور ساری بات نمبردار کو بتائی۔

نمبردار نے اس کے ساتھ جا کر اپنی آنکھوں سے صفدر کی لاش دیکھی اور پھر باہر سے گھر کے دروازے کو کنڈی لگا کر تھانے چلا آیا۔

نمبردار سے ساری تفصیل سن کر میں نے دو کانسٹیبلوں اور اے ایس آئی کو ساتھ لیا اور گاؤں چلا گیا۔ صفدر کا دوست جس نے پہلے لاش دیکھی تھی، وہ ہمارے ساتھ تھا۔ ابھی گاؤں کے لوگوں کو اس تازہ واردات کا علم نہیں ہوا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر وہ ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگے۔

مطلوبہ مکان پر پہنچ کر نمبردار نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھولی۔ میں نمبردار کے ساتھ اندر چلا گیا۔ نمبردار نے بتایا کہ لاش اندر کمرے میں پڑی ہے۔ میں احتیاط سے اندر چلا گیا۔ ویسے تو پورے گھر میں فرش کچا تھا لیکن کمروں کے اندر گندھی ہوئی مٹی سے لپائی کی گئی تھی جس کی وجہ سے کسی قسم کے کھرے کا نشان نہیں نظر آرہا تھا۔

میں لاش کے قریب چلا گیا۔ جس طرح ماں کو قتل کیا گیا تھا، بیٹے کو بھی بالکل اسی طرح قتل کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مقتولہ شادو کو قتل کرنے کے لیے اسی کا دوپٹہ گلے میں ڈال کر بل دے کر قتل کیا گیا تھا اور صفدر علی کے گلے میں بڑا رومال پڑا ہوا تھا۔ ایسے بڑے رومال آپ لوگوں نے اکثر لوگوں کو کندھوں پر ڈالے یا سر پر لپیٹے دیکھا ہوگا۔ ایسا ہی ایک رومال صفدر کے گلے میں ڈال کر گردن کے پچھلی طرف بل دے کر اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔

جس چیز نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی تھی، وہ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے جو اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر وہ ٹکڑے اکٹھے کر کے رومال میں ڈالے اور رومال جیب میں رکھ لیا۔

اس کے بعد میں نے بڑی باریک بینی سے لاش کا اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی تھی اور ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی نظر آرہی

تھی۔ مقتول کے جسم پر بھی کسی ضرب یا زخم کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ صفدر بے خبری میں مارا گیا ہے اور اسے قاتل کے خلاف کسی قسم کی جدوجہد یا مزاحمت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو کمرے میں ایسے آثار ضرور نظر آتے۔

میں نے نقشہ صورتِ حال مرتب کیا اور ضرور کاغذی کارروائی کے بعد لاش کو باقاعدہ قبضے میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادیا۔

اس کے بعد میں نے بڑی توجہ اور غور سے صحن کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں بھیجو کھرے نظر آئے ان کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ یہ کھرے بالکل ویسے ہی تھے جیسے میں نے شادو کی لاش کے پاس دیکھے تھے۔ یہ بڑی اہم بات تھی اور اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ دونوں قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں۔

اس واردات میں جو نئی بات سامنے آئی تھی وہ یہ تھی، اب اس میں ایک عورت بھی شامل ہوگئی تھی۔ جائے واردات سے ملنے والی چوڑیوں کے ٹکڑے اس بات کو ثابت کررہے تھے کہ قتل کے وقت کوئی عورت بھی موجود تھی۔ اس نئے انکشاف سے تفتیش کا رخ ہی بدل گیا تھا۔

مقتول کے دوست نے بتایا کہ جب صبح وہ آیا تھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر اور باہر سے تمام دیواروں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ کہیں بھی کوئی ایسا نشان یا رگڑ وغیرہ نظر نہ آئی تھی جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا کہ قاتل دیوار پر چڑھ کر اندر کودا ہو۔ قاتل دروازے سے ہی واپس گیا تھا اس سے مجھے یہ خیال آیا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، مقتول اسے جانتا تھا اور اسے خود اندر لے کر گیا تھا۔

ضروری کارروائیوں کے بعد فارغ ہوکر میں ایک بار پھر نمبردار کی بیٹھک میں جا بیٹھا۔ اس واردات میں ایک لڑکی کی موجودگی سے مجھے یہ امید ہو چلی تھی کہ میں جلد ہی اس لڑکی کا سراغ لگا لوں گا۔ ہوسکتا تھا کہ مقتول کا کسی لڑکی سے دوستانہ ہو اور لڑکی کے والی وارثوں کو اس دوستی کی علم ہوگیا ہو۔ لڑکی رات کو چوری چھپے مقتول سے ملنے آئی ہو اور لڑکی کا بھائی یا باپ پیچھے آگیا ہو اور اس نے غیرت کے جوش میں صفدر علی کو قتل کردیا ہو۔

میں نے یہ سب کچھ سوچ تو لیا مگر پھر یہ خیال آیا کہ شادو کے قتل کو کس خانے میں فٹ کروں گا۔ اگر قاتل ایک ہی شخص تھا جیسا کہ ایک جیسے کھروں سے ظاہر ہو رہا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے مقتول کی ماں کو کیوں مارا؟

اپنی ماں کو سنبھالو

بہر حال میں نے مقتول صفدر کے دوست سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ میں نے اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر کے اس کی جھجک اور پولیس کا خوف دور کیا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس کے دوست کے قتل ہونے کا بہت افسوس ہے اور یہ کہ میں اس کے قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ اس دوست کا نام ارشد تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہارا دوست کسی لڑکی کے چکر میں مارا گیا ہے۔ تم اس کے بے تکلف دوست ہو تم کو ضرور معلوم ہوگا کہ اس کا کسی لڑکی سے چکر تھا''۔

''یہ میرا اور اس کا راز تھا''۔ ارشد نے کہا۔ ''میں کبھی بھی یہ راز فاش نہ کرتا، اب چونکہ میرا یار ہی نہیں رہا تو راز رکھنے کا کیا فائدہ۔ گاؤں کے جلاہوں کی لڑکی پروین اس پر مرمٹی تھی اور دونوں چوری چھپے ملتے تھے۔

صفدر پروین کے ساتھ مخلص نہیں تھا اور محض وقت گزاری کے لیے اس کو محبت کا فریب دے رکھا تھا۔ دوسری طرف پروین بڑی سنجیدگی سے مقتول کے ساتھ محبت کرتی تھی اور اس سے شادی کے خواب دیکھ رہی تھی''۔

مقتول کے دوست ارشد نے مجھے مقتول اور پروین کی ملاقاتوں کے قصے سنانے شروع کر دیئے جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف اپنے کام کی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کام کی بات یہ تھی کہ صفدر پروین کو چکر دے رہا تھا اور محبت کے نام پر اس کے ساتھ گناہ کا کھیل، کھیل رہا تھا۔

ارشد نے بتایا کہ پچھلے ایک مہینے سے پروین نے مقتول کو کہا تھا کہ ان کے گناہ کی وجہ سے وہ کنواری ماں بننے کے مراحل میں داخل ہو گئی ہے اور ابھی ابتدائی علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔ وہ مقتول کی منت سماجت کرتی تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے، اس کے ساتھ شادی کر لے تاکہ وہ بدنامی سے بچ جائے۔ ایک بار تو وہ مقتول کے پیروں پر بھی گر پڑی تھی۔ مقتول اسے مسلسل ٹالتا آ رہا تھا۔ اس کا پروین کے ساتھ شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ذرا غور کریں، ماں نے محبت کے نام پر ایک غیر مرد سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے اور بیٹا بھی اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک لڑکی سے دوستی لگا کر شیطانی کھیل کھیل رہا تھا۔ مجھے شک ہی نہیں بلکہ پکا یقین تھا کہ دونوں اسی چکر میں مارے گئے ہیں۔

''کیا پروین کے گھر والوں کو اس بات کا علم تھا؟'' میں نے ارشد سے پوچھا۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا''۔ ارشد نے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے انہیں شک ہو گیا ہو''۔

میں نے یہ سوال اس لیے پوچھا تھا کہ دیہات میں ایسی بے غیرت قسم کی محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسی جھوٹی یا سچی محبتوں کا انجام زیادہ تر لڑکے اور لڑکی دونوں کی موت یا صرف لڑکے موت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس سارے معاملے میں بھی مجھے مقتول صفدر کے قتل کی یہی وجہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے ارشد سے اور بہت سے سوال بھی پوچھے۔ میں ہر امکان کو سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ارشد سے یہ بھی پوچھا تھا کہ مقتول کا کسی کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں تھا۔ اس کے جواب میں ارشد نے ایک واقعہ سنایا جو تقریباً ایک ہفتہ پہلے کا تھا۔

ہوا یوں کہ سارے لڑکے اکٹھے ورزش کر رہے تھے۔ ان میں ایک لڑکا گاؤں کے موچی کا بھی تھا جو بڑا صحت مند تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی جو اس کی اوقات سے بڑھ کر تھی اور اونچی ذات کے لڑکوں نے اس کا بُرا بھی منایا مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ صفدر خاموش نہ رہ سکا اور اس نے موچی کے بیٹے کو طنزیہ انداز میں کہا کہ وہ اپنی ذات اور حیثیت دیکھ کر بولا کرے۔

''ہم نیچی ذات کے ضرور ہیں''۔ موچی کے بیٹے نے کہا۔ ''لیکن بے غیرت نہیں ہیں۔ تم پہلے اپنی ماں کو دیکھو پھر ہماری ذات اور حیثیت کی بات کرنا''۔

اس بات پر صفدر آگ بگولہ ہو گیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ موچی کا بیٹا بھی کمزور نہیں تھا۔ اس نے برابر کا جواب دیا۔ دوسرے لڑکوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ صفدر نے کہا کہ وہ اس کمین ذات کو زندہ نہیں چھوڑے گا، اس نے میری غیرت کو للکارا ہے۔

''بڑے غیرت مند بنے پھرتے ہو''۔ موچی کے بیٹے نے کہا۔ ''اگر غیرت ہے تو پہلے اپنی ماں اور عباس شاہ کو قتل کرو ورنہ ڈوب کے مر جاؤ''۔

موچی کے بیٹے نے بڑی سخت بات کہہ دی تھی لیکن اس کا صفدر پر الٹا اثر ہوا۔ وہ جتنا بھڑکا ہوا تھا، اتنا ہی ٹھنڈا پڑ گیا اور منہ سے کچھ بولے بغیر وہاں سے چلا

گیا۔ اس دن کے بعد سے اسے چپ سی لگ گئی تھی۔

ارشد کی یہ بات سن کر اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنی ماں شادو کو مقتول صفدر نے خود قتل کر دیا ہو۔ اس مفروضے میں خاصا وزن تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر ایسا ہی ہوا ہے جیسے کہ میں سوچ رہا ہوں تو پھر صفدر کو کس نے قتل کیا؟ جو کھرے مقتولہ شادو کی لاش کے پاس پائے گئے تھے، وہی مقتول صفدر کے گھر کے صحن میں بھی موجود تھے۔ ماں اور بیٹے دونوں کو ایک ہی طریقے سے قتل کیا گیا تھا یعنی گلے میں دوپٹہ اور رومال ڈال کر پیچھے سے بل دے کر گلا گھونٹا گیا تھا۔

ان حالات و شواہد سے تو ایک ہی بات ثابت ہو رہی تھی کہ دونوں وارداتیں ایک ہی شخص نے کی ہیں۔ یہ شخص کون تھا؟ قتل کا محرک کیا تھا؟ یہ وہ سوال تھے، جن کا جواب میں نے تلاش کرنا تھا۔

میں نے مزید سر کھپانے میں بجائے پہلے پروین سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ کسی عورت کو بھیج کر پروین کو بلا لے۔ نمبردار نے حویلی میں کام کرنے والی ایک عورت سے کہا کہ وہ پروین کو کہے اسے نمبردارنی نے حویلی میں بلایا ہے۔ وہ عورت اسی وقت چلی گئی۔

میں بڑی بے چینی سے پروین کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے امید تھی کہ پروین کوئی سنسنی خیز انکشاف کرے گی۔

بھید کھل گیا

تھوڑی دیر بعد وہ نوکرانی واپس آ گئی۔ اور اس نے بتایا کہ وہ پروین کو ساتھ لے آئی ہے اور وہ اندر زنان خانے میں ہے۔ نمبردار نے اس کو کہا کہ وہ پروین کو بیٹھک میں لے آئے۔ نوکرانی چلی گئی اور پروین کو ساتھ لے آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ صاف رنگت کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ عمر سے سولہ سترہ سال کی لگ رہی تھی۔ چہرے پر معصومیت اور خوف ایک ساتھ نظر آ رہا تھا۔ معصومیت عمر کا تقاضا تھا اور خوف ایک باوردی پولیس انسپکٹر کا تھا۔

میں نے نمبردار کو بیٹھک سے باہر جانے کو کہا تو وہ اندر زنان خانے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پروین کو اپنے پاس بلایا تو وہ بڑی مشکل سے یوں چلتی ہوئی میرے پاس آئی جیسے قدم گھسیٹ رہی ہو۔ میں نے اس کو بیٹھنے کو کہا مگر وہ کھڑی رہی جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں اس کو بیٹھنے کو کہا تو وہ گھبرا کر فوراً بیٹھ گئی۔

وہ کوئی خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ بس عام سی شکل و صورت اور نین نقش کی مالک تھی۔ اگر اس میں کوئی خوبی یا کشش والی بات تھی تو صرف یہ کہ وہ جوانی کی عمر میں تھی اور جوانی چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔

میں نے سب سے پہلے اس کی کلائیوں کو دیکھا جن میں کچھ چوڑیاں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ اپنی کلائیاں آگے کر کے مجھے دکھائے۔ اس نے ذرا جھجک کر کلائیاں آگے کر دیں۔ میں جو دیکھنا چاہتا تھا وہ نظر آ گیا۔ اس کی گوری گوری کلائیوں پر چند سرخ سرخ خراشیں نظر آ رہی تھیں جو ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نوکیلے سروں سے لگی تھی۔

''چوڑیاں بڑی پیاری پہن رکھی ہیں''۔ میں نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی بے تکلف سہیلی دوسری سہیلی سے کہتی ہے''۔ لگتا ہے کہیں گرنے سے ٹوٹ گئی ہیں''۔

وہ ایک دم گھبرا سی گئی پھر سنبھل کر بولی۔ ''ہاں، میں گر گئی تھی''۔ پھر اپنی کلائیوں کو دیکھ کر کہنے لگی۔ ''چوٹ بھی لگی اور چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں''۔

''کہاں گری تھیں تم؟''۔ میں نے پوچھا۔

''وہ..... وہ.....''۔ ایک دم گڑبڑا سی گئی اور جلدی

سے بولی۔ ''ایک سہیلی کے گھر گر پڑی تھی''۔

''کون سی سہیلی؟''۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس کا نام بتاؤ''۔

وہ سوچ میں پڑ گئی اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ کوئی چالاک ہوشیار لڑکی نہیں تھی، سیدھی سادی دیہاتی لڑکی تھی۔ اگر وہ ذرا بھی چالاک ہوتی تو کوئی بھی نام بتا دیتی۔

''میں تمہاری سہیلی کا نام بتا دیتا ہوں''۔ میں نے کہا۔ ''جس کے گھر تمہاری چوڑیاں ٹوٹی تھیں''۔ یہ کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رومال میں لپٹے ہوئے چوڑیاں کے ٹکڑے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے اور کہا۔ ''یہ دیکھو، میں وہاں سے تمہاری ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اٹھا لایا ہوں''۔

چوڑیاں کے ٹکڑے دیکھ کر اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے ابھی غش کھا کر گر پڑے گی۔ پھر اس نے باقاعدہ کانپنا شروع کر دیا جیسے اس کو لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو۔ میں نے اسے تسلی دلاسہ دیا اور کہا کہ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کس سے ملتی ہے اور کیا کرتی ہے اور نہ ہی یہ کوئی جرم ہے۔ اس کی حالت کچھ سنبھل گئی۔

''صفدر قتل ہو گیا ہے''۔ میں نے کہا۔ ''اور میں نے اس کے قاتل کو پکڑنا ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ تمہارا باپ یا بھائی وہاں آ گیا تھا؟''

''ان میں سے کوئی نہیں آیا تھا''۔ اس نے کہا۔ ''ان کو تو اس معاملے کی خبر بھی نہیں ہے''۔

''پھر کون آیا تھا؟''۔ میں نے پوچھا۔

''عباس شاہ''۔ اس نے کہا۔ ''وہ پہلے سے وہاں موجود تھا''۔

پروین کا جواب سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عباس شاہ یہ قتل کر سکتا ہے۔ مجھے ایسی کوئی وجہ اور جواز نہیں ملا تھا کہ میں عباس شاہ پر شک کر سکتا کہ یہ کام اس کا ہو سکتا ہے لیکن انسانی فطرت ایک ایسا گہرا سمندر ہے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ کب اس کی تہہ سے کیا ابھر کر سامنے آ جائے۔

''مجھے تفصیل سے پوری بات سناؤ''۔ میں نے پروین سے کہا۔ ''تم نے کیا دیکھا؟''

اس کے جواب میں پروین نے مجھے ساری بات سنا دی۔ اس نے کچھ بھی نہ چھپایا اور اپنے اور مقتول صفدر علی کے ناجائز تعلقات کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ سب کچھ مجھے صفدر کے دوست ارشد نے بھی بتایا تھا۔

میں آپ کو پروین کا بیان مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔

پروین اکثر چوری چھپے مقتول صفدر سے ملتی رہتی تھی۔ چونکہ اب مقتول کی ماں شادو بیگم قتل ہو گئی تھی اور صفدر گھر میں اکیلا ہی ہوتا تھا، اس لیے پروین اس سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔ یہ واردات والی رات تھی۔

وہ جب صفدر کے گھر کے دروازے پر پہنچی تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا دروازے پر دستک دے مگر پھر یہ سوچ کر نہ دی کہ خواہ مخواہ دوسرے لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ وہ اندر چلی گئی۔ اس کو کمرے کی طرف سے کچھ عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ آگے گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی جھکا ہوا ہے اور صفدر زمین پر گرا پڑا ہے۔ اس آدمی کی پروین کی طرف پشت تھی۔ پھر وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو گیا اور پروین نے دیکھا کہ صفدر زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہے اور اس کی گردن میں کپڑا پڑا ہوا ہے۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر پروین کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چیخ کی آواز سن کر اس آدمی نے پلٹ کر دیکھا تو وہ

Pakistanipoint
Waqar Azeem

عباس شاہ تھا۔ عباس شاہ کو دیکھ کر پروین نے پلٹ کر بھاگ جانا چاہا لیکن اس کی ٹانگوں سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ دروازے کی طرف مڑی تو عباس شاہ نے اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا تو پروین کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

اس کے بعد عباس شاہ نے پروین کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اور پوری قوت سے دبانے لگا۔ پروین کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کے لیے زور لگانے لگی اور اس نے اپنے ناخن عباس شاہ کی کلائیوں پر مارے مگر عباس شاہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ موت پروین کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگی اور وہ سمجھ گئی کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔

پھر یکایک عباس شاہ نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ پروین بے دم ہو کر صفدر علی کی لاش پر گر پڑی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

''یہ صرف نمونہ تھا''۔ عباس شاہ نے پروین سے کہا۔ ''تم کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ موت کتنی تلخ ہوتی ہے۔ تم کو اپنی زبان بند رکھنی ہو گی۔ اگر تم نے کسی کو اشارہ بھی دیا تو میں پھر اسی طرح تمہارا گلا دبا کر مار دوں گا''۔

پروین اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اشاروں میں عباس شاہ کو بتایا کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔

''ایک بات یاد رکھنا پروین!''۔ عباس شاہ نے کہا۔ ''اگر تم نے میرے خلاف زبان کھولی تو پھر میری زبان بھی کھل جائے گی۔ سارے گاؤں والوں کو بتاؤں گا کہ تم صفدر علی کے ساتھ کون سا کھیل کھیلتی رہی ہو..... قتل کا الزام بھی تم پر لگا دوں گا۔ خود ہی سوچو تمہارے باپ اور بھائیوں کی کتنی بے عزتی ہو گی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ زیادہ غیرت مند ہوئے تو ڈوب مریں گے''۔

مختصر یہ کہ عباس شاہ نے پروین کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ اب وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی۔

میں نے پروین سے اپنی ضرورت کی کچھ اور باتیں بھی پوچھیں اور اس کو کہا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے اور کسی کو نہ بتائے کہ اس نے مجھے کوئی بات بتائی ہے۔ پھر میں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی۔

وہ چلی گئی اور میرے سارے مسئلے حل کر گئی۔ میں نے اب فوراً عباس شاہ کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں سے بھی تھانے آ گیا اور اپنے اے ایس آئی کو دو کانسٹیبل دے کر عباس شاہ کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا۔

محبوبہ کا انتقام

یہ دوہرا قتل میرے لیے ذہنی عذاب بننے والا تھا اور قاتل ایسا شخص نکلا تھا جس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے خلاف عینی شاہد گواہ مل جانے کے باوجود بھی مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ عباس شاہ نے آخر ان ماں بیٹے کو کیوں قتل کیا؟

عباس شاہ تو شادو کو دیوانہ وار چاہتا تھا اور اسی حوالے سے اس کے بیٹے صفدر علی سے بھی پیار محبت کرتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شادو نے عباس شاہ کو ٹھکرا کر کسی اور آدمی سے دوستی لگا لی ہو۔

میں بڑی دیر تک قیاس کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ خود ہی ایک بات سوچتا اور پھر اس پر اعتراض نکالتا اور پھر اپنے مفروضے کو خود ہی رد بھی کر دیتا۔ تنگ آ کر میں نے سوچا کہ جو بھی حقیقت ہو گی، عباس شاہ کے آنے پر

معلوم ہو جائے گی خواہ مخواہ سر کھپانے سے کیا فائدہ؟

کوئی دو گھنٹوں کے بعد اے ایس آئی عباس شاہ کو گرفتار کر کے لے آیا۔ اس نے عباس شاہ کو باقاعدہ ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ یہ میرا یہ حکم تھا۔ عباس شاہ خاصے غصے میں نظر آ رہا تھا لیکن بے بس تھا۔

میں نے اسے ایس آئی کو اپنے ساتھ ہی رکھا اور اس کو کہا کہ وہ عباس شاہ کو لے کر بیٹھ جائے۔ اے ایس آئی نے عباس شاہ کو بٹھایا اور اس کی ساتھ والی کرس پر خود بیٹھ گیا۔

''یہ زیادتی ہے میرے ساتھ''۔ بیٹھتے ہی عباس شاہ نے شکایتی انداز میں مجھے کہا۔ ''مجھے حکم دیا ہوتا میں حاضر ہو جاتا''۔

''کوئی زیادتی نہیں عباس شاہ!'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''قاتلوں کو اسی طرح تھانے میں لایا جاتا ہے''۔

''لگتا ہے آپ کا شک ابھی تک دور نہیں ہوا''۔ عباس شاہ نے مسکرا کر کہا۔

''شک نہ کہو عباس شاہ!'' میں نے کہا۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قتل تم نے کئے ہیں۔ کہو تو ثبوت پیش کر دوں..... بہتر ہے خود ہی اقبالی بیان دے دو''۔

میری بات سن کر پہلے تو وہ گھبرایا لیکن پھر ہر مجرم کی طرح مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ بے گناہ ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی آستینیں اوپر کر کے اپنی کلائیاں مجھے دکھائے۔ اس نے جب کلائیاں ننگی کیں تو مجھے ان پر پروین کے ناخنوں کی لگی ہوئی خراشیں صاف نظر آ گئیں۔

''یہ کیا ہوا ہے؟''۔ میں نے پوچھا۔

''یہ..... وہ.....'' اس سے کچھ کہنا چاہا مگر اٹک سا گیا۔

''جھوٹ نہ بولنا عباس شاہ!''۔ میں نے سختی سے کہا۔ ''پروین نے مجھے بیان دے دیا ہے..... بولو، اقبالی بیان دو گے یا نہیں؟''

عباس شاہ کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا اور وہ اس طرح ڈھیلا پڑ گیا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔

''میں اس بات پر حیران ہوں''۔ میں نے عباش شاہ سے کہا۔ ''کہ تم نے پہلے شادو اور پھر صفدر کو کیوں قتل کیا؟''

''میں نے صرف صفدر کو قتل کیا ہے''۔ عباس شاہ نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شادو کو میں کس طرح مار سکتا ہوں''۔ اس کی آواز رندھ گئی۔

''پھر شادو کو کس نے قتل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بیٹے صفدر نے''۔ عباس شاہ نے کہا۔ ''وہ میری اور اپنی ماں کی دوستی کو پسند نہیں کرتا تھا''۔

اس کی یہ بات سن کر سارا معاملہ مجھے سمجھ میں آ گیا۔ جوان بیٹا ماں کی بے راہروی برداشت نہ کر سکا۔ پھر مجھے وہ بات یاد آ گئی جو مقتول کے دوست ارشد نے سنائی تھی کہ موچی کے بیٹے نے اس کو اس کی ماں کے متعلق طعنہ دیا تھا۔

میں نے عباس شاہ سے کہا کہ وہ پوری تفصیل سے اپنا اقبالی بیان دے دے۔ اس نے بڑی تفصیل سے ہر بات مجھے بتائی۔ میں آپ کو اس کا بیان اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔

عباس شاہ اور شادو کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں۔ جب تک صفدر علی چھوٹا تھا تب تک تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر وہ بڑا ہو گیا اور ہر بات سمجھنے لگا تو عباس شاہ نے محسوس کیا اور شادو نے بھی اس کو بتایا کہ صفدر علی ان دونوں کے تعلقات کو پسند نہیں کرتا۔ پھر اس دوران وہ واقعہ ہو گیا جب اس کو

موچی کے بیٹے نے طعنہ دیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو سنبھال کر رکھے۔ اس کے بعد سے وہ چپ چپ رہنے لگا تھا۔ شادو نے عباس شاہ کو بتایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ دو تین مرتبہ لڑا بھی ہے اور بڑی بدتمیزی کی ہے۔

واردات والی رات شادو اور عباس شاہ بھٹے کے کھنڈر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ صدر علی اس طرف آ گیا۔ عباس شاہ نے مجھے جھوٹ بتایا کہ اس نے آنے والے کو پہچانا نہیں تھا۔ اس نے اندھیرے میں بھی صاف پہچان لیا تھا کہ آنے والا شادو کا بیٹا صفدر علی ہے۔

شادو نے عباس شاہ سے کہا کہ وہ پچھلی طرف سے نکل جائے اور وہ اپنے بیٹے کو سنبھال لے گی۔ عباس شاہ وہاں سے نکل کر گاؤں آ گیا اور پھر صبح خبر ملی کہ شادو قتل کر دی گئی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ غیرت مند بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا ہے۔ اسے شادو سے بے پناہ محبت تھی۔ اسے شادو کے مرنے کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے انتقامی کارروائی کا فیصلہ کر لیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

آخر ایک رات اس نے صفدر علی کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا اور صفدر کے گھر چلا گیا۔ صفدر اسے دیکھ کر حیران ہوا لیکن عباس شاہ نے اس کو کہا کہ وہ اس سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ صفدر علی کو معلوم نہیں تھا کہ عباس شاہ کے روپ میں موت کا فرشتہ اس کے پاس آیا ہے۔

وہ عباس شاہ کو لے کر اندر چل پڑا۔ صفدر آگے آگے چل رہا تھا۔ عباس شاہ نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بڑا رومال پیچھے سے اس کی گردن میں ڈالا اور فوراً ہی کھینچ کر رومال کو بل دینے لگا۔ صفدر بڑا تڑپا اور اچھلا کودا لیکن عباس شاہ بہت طاقتور تھا، اس نے صفدر کو اٹھنے نہیں دیا اور اس کی کمر پر ایک پاؤں رکھ کر اسے زمین دبائے رکھا، آخر صفدر کی جان نکل گئی اور عباس شاہ نے رومال اس کی گردن میں ہی رہنے دیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی شادو کا انتقام بالکل اسی طرح لیا تھا جس طرح اس کی شادو کو مارا گیا تھا۔ یعنی اس کا دوپٹہ گلے میں ڈال کر پھندا اپنا کر قتل کیا گیا تھا۔

وہ صفدر علی کو قتل کر کے اٹھا تو اسے پروین نظر آئی۔ وہ پروین کو جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دونوں کے کس قسم کے تعلقات ہیں۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں پروین کے بیان میں سنا چکا ہوں۔

اپنا بیان دینے کے بعد عباس شاہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کو شادو سے بہت پیار تھا اور وہ اس کے بیٹے سے بھی پیار کرتا تھا۔ میں اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ وہ بہت بڑے جذباتی حادثے سے گزرا تھا۔

میں نے کیس مکمل کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ عباس شاہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ میں نے عینی شاہد کے طور پر پروین کی گواہی بھی دلوائی تھی۔ اس وجہ سے پروین پورے علاقے میں بدنام ہو گئی تھی۔

عدالت نے عباس شاہ کو سزائے موت سنائی۔ اس کے وکیل نے اس کو کہا کہ وہ اپیل کرے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ دراصل اسے شادو کے بغیر زندہ رہنے کی کوئی خواہش ہی نہیں رہی تھی۔

اس واقعہ کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ پروین نے صفدر کی موت اور پھر بدنامی سے دلبرداشتہ ہو کر نہر میں کود کر خودکشی کر لی۔ اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا لیکن یہ میری مجبوری تھی کہ اس کی گواہی مجرم کو سزا دلانے کے لیے بہت اہم تھی اور میں نے ہمیشہ قانون کو مقدم سمجھا تھا۔

❁❁❁

ایک تاثر ایک کہانی

ندامت

خالہ بی کے من میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں، ندامت کے یہ موتی ان کے سفید ململ کے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔

☆ تسنیم کوثر

گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی..... چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں..... خالہ بی ڈھیر ساری عورتوں میں گھری ہمدردیاں سمیٹ رہی تھیں..... سکندریہ کالونی میں ہلچل مچی تھی..... گھر کی چاردیواری میں مقید رہنے والی عورتوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لی تھیں اور مرد..... باہر ٹولیوں کی صورت سرگوشیوں میں مصروف تھے..... سرگوشیوں کی یہ بھنبھناہٹ ثمینہ کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی..... مگر وہ چپ تھی..... مجرم بنی بیٹھی تھی..... بنا کسی جرم کے.....

من میں طوفان امڈ رہے تھے۔

آنسو چھلک رہے تھے۔

وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی..... انسان کے اندر کوئی چیز ٹوٹ جائے تو اسے سمیٹنا مشکل ہوتا ہے۔

ثمینہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ بکھر گئی تھی۔

شک کی ظالم ہوا یقین کے خیمے اکھاڑ گئی تھی۔

کون تھا جو اس کی سنتا؟

کون تھا جو اس کی بے گناہی کا یقین کرتا؟

اسے عمر بھر شاید اسی طرح بے یقینی کی پگڈنڈی پہ برہنہ پا چلنا تھا۔

اپنی بے بسی پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سال بھر پہلے کے حسین دن ثمینہ کی آنکھوں سے اشک بن کر بہنے لگے تھے۔

پچھلے برس، انہی دنوں وہ اس گھر میں آئی تھی، غریبوں کی کچی بستی میں ماربل ٹائلز لگا یہ دو منزلہ مکان دور سے ہی سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔ اسی گھر کے ایک خوبصورت سجے سجائے کمرے میں جب وہ گٹھڑی بنی بیٹھی تھی تو جعفر نے اسے زندگی کی خوبصورتیوں کا احساس دلایا تھا، نرم گرم گفتگو میں لپیٹ کر بہت سے حسیں جذبے ثمینہ کے دل میں جگا دیئے تھے۔ جعفر جب اسے چھوتا، موسیقی کی لہریں اس کے پورے وجود میں پھیل جاتیں۔ جعفر کی سرگوشیاں جب الوہی سُروں کو جنم دیتیں تو ثمینہ کی آنکھوں میں خمار

کے رنگ بکھر جاتے اور وہ سوچتی۔

اگر زندگی کے یہ رنگ مجھے نہ ملتے تو کتنی ادھوری سی رہ جاتی میں، جعفر کی چاہت نے اسے مکمل کر دیا تھا۔

اپنے گھر میں تو اس نے بھوک ننگ دیکھی تھی، ہوش سنبھالا تو کچی آبادی میں، بدبودار جوہڑ کے داہنی طرف والی جھگی میں خود کو پایا تھا۔ تھانہ نواں کوٹ کے عقب میں، یتیم خانہ چوک کے قریب آباد یہ کچی بستی محنت کشوں کی جنت تھی، دن بھر یہاں ننگ دھڑنگ بچے مکھیوں کی طرح، مکھیوں کے ساتھ بھنبھناتے پھرتے اور رات کو مچھروں کی یلغار انہیں دبوچ لیتی۔ ثمینہ اسی بستی میں پلی بڑھی تھی، ثمینہ کا باپ کرم داد پھلوں کی ریہڑی لگاتا۔ صبح سے شام تک وہ گلیوں گلیوں پھل بیچتا اور رات کو بیوی پر حکمرانی کرتا۔ اس کی یہی حکمرانی بہت سی رعایا کو وجود میں لے آئی تھی مگر جب مہنگائی بڑھی، رعایا بڑھی تو جھگی کا بے تاج بادشاہ یہ بوجھ نہ سہار سکا اور ایک رات ایسا سویا کہ پھر اٹھا ہی نہیں۔ دس بچوں کی وراثت چھوڑ گیا تھا جس کا سارا بوجھ ثمینہ کی ماں پر آ پڑا تھا۔ بچوں کا یہ ڈھیر اسے سنبھالنا تھا، گھر چلانا تھا۔

اس نے حکمت عملی سے کام لے کر ثمینہ کو قریب کے سلائی سکول میں سلے ستارے کا کام سیکھنے بھیج دیا اور خود لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی۔ ثمینہ کو حالات نے بچپن میں ہی بڑا کر دیا تھا، اس نے اپنا بچپن ستارے، موتی اور مقیش کی دنیا میں قید کر لیا اور کام سیکھ کر آرڈر کا کام کرنے لگی۔ ماں مارکیٹ جا کر کام لے آتی، کام تیار ہو جاتا تو دکاندار سے رقم وصول کرتی اور نیا آرڈر اٹھا لاتی۔ ثمینہ کو باہر کی دنیا کی خبر ہی نہ تھی۔ بڑی لگن سے وہ اپنا کام کرتی تھی، اس کے ہاتھ میں اتنی نفاست تھی کہ آرڈر ختم ہی نہ ہوتے تھے۔

ایک دن جب ماں تیار مال دکاندار کو پہنچا کر پیسے وصول کر رہی تھی تب ایک فیشنی سی عورت بھی وہاں بیٹھی تھی، اس عورت نے باہر نکل کر ماں سے گھر کا پتہ پوچھا تو ماں ڈر گئی، تب اس عورت نے بتایا کہ مجھے تم سے آرڈر پر کام کرانا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم صرف میرا کام کرو، میں پیسے بھی دکاندار سے زیادہ دوں گی۔ ماں نے اسے گھر کا پتہ سمجھا دیا کیونکہ اس نے ثمینہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے ڈریس میڈم کی گاڑی میں دیکھ لئے تھے۔

اُس روز ثمینہ ساڑھی پر کٹ دانہ بکھیر کر اسے آخری ٹچ دے رہی تھی کہ بستی میں بچوں کے شور وغل نے اسے چونکا دیا، اس نے پیوند زدہ پردے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا، سفید رنگ کی گاڑی اس کے گھر کے باہر کھڑی تھی اور ایک اونچی لمبی فیشنی سی عورت آنکھوں پر کالی عینک چڑھائے بچوں کے غول کے ساتھ اس کے دروازے پر موجود تھی۔ گاڑی کی آواز اور بچوں کے شور سے ہر گھر کے بوسیدہ پردوں میں سرسراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ عورتوں نے تاک جھانک شروع کر دی تھی، سب حیرت سے میڈم کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ وہی میڈم تھی جو ماں سے آرڈر پر کام کروانا چاہتی تھی، اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر ماں کو یقین ہی نہ آیا تھا۔ وہ ثمینہ کے لئے ڈھیر سارا کام لے کر آئی تھی، وہ دکاندار کو بیچ میں ڈالے بغیر یہ کام کروانا چاہتی تھی، پیسے بھی زیادہ دے رہی تھی۔ ماں نے جھٹ ہامی بھر لی، وہ بار بار مارکیٹ جانے کی زحمت سے بچ گئی تھی، گھر بیٹھے کام مل رہا تھا اور رقم بھی۔ میڈم شانزے یہ ڈریس تیار کروا کر جرمنی بھیجتی تھی۔ ثمینہ نے دیکھا۔ میڈم کی عمر اس کی ماں کے برابر ہی تھی مگر وہ کتنی خوبصورت، کتنی جوان لگ رہی تھی۔ ثمینہ کو اپنی ماں کی بے چارگی پر دُکھ ہونے لگا جس نے ساری عمر، ساری

جوانی اس کچی بستی اور پکی غربت کے ساتھ گزار دی تھی۔

کچھ دنوں سے گھر میں کچھ ہلچل سی تھی، ماں کسی الجھن میں تھی، پکے گھر والی خالہ بی آتیں اور اکثر ماں کے ساتھ گھسر پھسر کرتی رہتیں۔ خالہ بی اسی بستی میں رہتی تھیں، جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جعفر، وہ پچھلے دس برسوں سے مڈل ایسٹ میں تھا۔ اس مڈل ایسٹ نے غریبوں کو خاصا دولتمند کر دیا تھا، آسائش کی ہر چیز ان کے گھروں میں آ گئی تھی، خالہ بی کے ہاں بھی سب کچھ موجود تھا۔ یہ جو خوبصورت گھر اس کچی بستی میں تاج محل کی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا، جعفر نے ہی بنوایا تھا۔ خالہ بی کی اس کچی آبادی میں بڑی عزت تھی، اس گھر کی بڑی دھوم تھی۔ وہ اکیلی رہتی تھی، خود کو مصروف رکھنے کے لئے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتیں۔ عورتوں کو درس دیتیں، سفید بالوں والی خالہ بی، جگت خالہ بی تھیں اور پھر ان کے آنے کی وجہ ثمینہ کو سمجھ آ گئی، خالہ بی اسے اپنے بیٹے کے لئے مانگ رہی تھی اور ماں حیرتوں میں گم تھی۔

ثمینہ کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔

سپنے لڈی ڈالنے لگے۔

نئی زندگی کا خواب ہر لڑکی کے دل میں بسا ہوتا ہے۔

اچھا ساتھی ہر لڑکی کی خواہشوں میں چھپا ہوتا ہے۔

اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا، پیوندزدہ پردے سے نکل کر کالے بڑے گیٹ تک پہنچنا، ثمینہ کا مقدر بن رہا تھا۔

خالہ بی نے اسے انگوٹھی پہنا کر پوری بستی میں مٹھائی بانٹ دی، ثمینہ کی ماں واری صدقے جا رہی تھی، بیٹی کو اچھا گھر، اچھا بر مل گیا تھا۔ خالہ بی نے مختصر میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر ثمینہ کی ماں کا دل جیت لیا تھا، وہ چاہتیں تو بیٹے کے لئے کسی اچھے، کسی اونچے گھر سے رشتہ مانگ لیتیں مگر وہ جہاندیدہ تھیں، جانتی تھیں، ان کا بڑھاپا کسی غریب گھر کی بیٹی کے ہاتھوں میں ہی عزت سے گزر سکتا ہے۔ ثمینہ نے جب سے جعفر کے نام کی انگوٹھی پہنی تھی، من میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا، اَن دیکھی چاہتیں سر اٹھانے لگی تھیں۔

گھر بسانے کی تمنا جاگتی ہے تو سوئے سوئے جذبے جاگنے لگتے ہیں۔ مندی مندی خواہشیں بھی انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔

کام سے اس کا جی، اوب گیا تھا۔ اسے یوں کھویا کھویا دیکھتی تو چھوٹی شرارت سے کہتی، مینو آپا تم گئیں کام سے۔

کل جعفر پاکستان آ رہا تھا، ہفتے بعد شادی تھی اور ثمینہ گلنار ہوئی جا رہی تھی۔ کتنے حسیں دن ہوتے ہیں یہ، جب دل میں چھپے جذبے چہرے پر دھنک رنگ بکھیر دیتے ہیں، تن من کو مہکا جاتے ہیں۔ جعفر جب خالہ بی کے ساتھ اس کی ماں کو سلام کرنے آیا تو کمرے میں چھپی ثمینہ نے کھڑکی کی ٹوٹی ہوئی جالی سے آنکھ لگا کر، جعفر کا خوبصورت سراپا اپنے دل میں اتار لیا تھا۔ کیسا شرمایا شرمایا سا بیٹھا تھا وہ، بالوں کی لٹ ماتھے پہ ڈھلکتی تو انگلیوں سے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی متلاشی نگاہیں کمرے کی دیواروں کے آر پار ہونے کی کوشش کرتیں۔ ثمینہ کو ڈھونڈنے لگتیں تب ثمینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں اَن چھوئی اَن دیکھی چاہتیں یونہی من میں ہلچل مچانے لگتیں۔

جاتے وقت جب خالہ بی اسے پیار دینے کمرے میں داخل ہوئیں تو جھٹ سے ثمینہ نے آنکھوں پہ دوپٹہ ڈال لیا اور سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی تھی حالانکہ

اس کے کان میں جھولتی ہوئی بالی، اس کے جھوٹ کا پول کھول رہی تھی۔ شادی میں تین دن رہ گئے تھے، ثمینہ نے تقریباً سارا کام مکمل کرلیا تھا۔ بس آخری قمیص ختم ہونے کو تھی، وہ ہر ستارے کے ساتھ اپنے خواب ٹانک رہی تھی۔ ہر موتی کے ساتھ اپنی آرزوئیں پرو رہی تھی، اتنے میں چھوٹی نے اسے بازو سے تھاما اور دروازے تک لے آئی، آپا دیکھو تو ذرا، کہہ کر جونہی اس نے پردہ ہٹایا سامنے جعفر کھڑا تھا، وہ ساکت سی ہوگئی۔

الٹے پیروں بھاگی اور دھم سے بستر پر آ گری، مصنوعی غصے سے چھوٹی کو ڈانٹا مگر، من میں لڈو پھوٹ رہے تھے، دل پل پل یہی کہہ رہا تھا۔ چھوٹی پھر اس کا ہاتھ پکڑے، اسے دوبارہ دروازے تک لے جائے پردہ ہٹائے تو سامنے پھر وہی جلوہ دکھائی دے۔

معصوم چاہتوں کی خواہشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں؟

اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، جعفر نے دل کھول کر خرچ کیا، خالہ بی نے من کے سارے ارمان پورے کئے، سب ہی اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ پیوندزدہ پردے والی جھگی سے وہ محل نما گھر میں آ گئی تھی جس کے کمروں میں دبیز پردے لگے تھے۔ ان پردوں کی اوٹ میں اس کی زندگی کے ریشمی، سرسراتے ہوئے دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

ہائے کاش! وقت رک جائے۔

بارہا اس نے یہ بے وقوفانہ دعا کی تھی۔

بارہا اس نے ان حسین لمحوں کو تھامنا چاہا تھا۔

مگر، چاہت کی یہ گدگداتی گھڑیاں تو جھٹ پٹ گزرتی جا رہی تھیں اور ہر بیتنے والی ساعت اسے جعفر سے جدائی کا سندیسہ دے رہی تھی، پیار کی شبنمی پھوار میں بھیگنے والی ہر رات ثمینہ کا دل ہولا رہی تھی۔ وہ تو ان لمحوں کے سحر سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جعفر اسے لے کر باہر گھومنا پھرنا چاہتا مگر وہ چپ سی ہو جاتی۔ حیا کے قفل اس کے لبوں پر لگ جاتے، وہ اسے کیسے کہتی؟

مجھے کہیں نہیں جانا، مجھے کہیں نہیں گھومنا، مجھے تو بس تمہاری پناہوں میں رہنا ہے۔

تمہاری باہوں میں جھولنا ہے۔

تمہیں دیکھنا ہے۔ تمہیں سامنے بٹھا کر پوجنا ہے۔

لب خاموش رہتے مگر اس کی جھکی جھکی نگاہیں جعفر کو سب کچھ بتا دیتیں تب جعفر اس کی ریشمی زلفوں میں الجھ جاتا، اس کی دلفریب خوشبو میں گم ہو جاتا۔

خالہ بی خوش تھی، خوبصورت، خوب سیرت بہو ملی تھی۔

جعفر خوش تھا، من موہنی چاہتوں والی بیوی ملی تھی۔

اور ثمینہ بھی خوش تھی، چاہت کی جھلملیاں، محبت کی پھواریں پا کر، زندگی بہت حسیں ہوگئی تھی۔ جب سے اس نے پیار کے رنگ چکھے تھے، وہ دوریوں پر آمادہ ہی نہ تھی۔ جعفر کے جانے پہ راضی ہی نہ تھی مگر جعفر کو جانا تھا اور پھر جعفر کا جی کب چاہ رہا تھا جانے کو مگر روزگار کے سلسلے عجیب ہوتے ہیں، محبتوں کی قربانی مانگتے ہیں، چاہتوں سے جدائی پردیسیوں کا مقدر ہوتی ہے، بس اچھے مستقبل کے لئے جعفر کو جانا تھا۔ اس کے جانے پر خالہ بی ممتا کے ہاتھوں اداس تھیں اور ثمینہ چاہت سے دوری پر نمناک تھی، رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں اس نے۔

کتنی پاگل ہوتی ہیں لڑکیاں؟

بیاہی جائیں، تب روتی ہیں۔

شوہر سے دور ہوں، تب روتی ہیں۔

آنسوؤں سے جذبوں کی ترجمانی کرتی ہیں، ان کی حکومت آنسوؤں پر ہوتی ہے۔

جعفر چھ ماہ رہ کر گیا تھا اور ان ایک سو اسّی دنوں میں ثمینہ یوں اس کے پیار میں رنگی گئی تھی کہ کوئی بھی رنگ، چھٹنے کو تیار نہ تھا، پیار سے دوری نے ثمینہ کو گم صم کر دیا تھا۔ ماتا جعفر کے دیئے ہوئے موبائل نے ہزاروں میل کے فاصلے پاٹ دیئے تھے، اب قربتیں نہ تھیں مگر سرگوشیاں تو تھیں۔ ہر رات جعفر کی چاہتیں اس کے کانوں میں رس گھولتیں، ہر لفظ اس کے پیار کی گواہی دیتا۔ ہر سانس جدائی پر آہ و فغاں کرتی اور ثمینہ بہتے ہوئے اشکوں کو بانکڑی لگے دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے ہوئے، جی کو سنبھالتے ہوئے کہتی۔

''بس جی، تم دل لگا کر اپنا کام کرو، میں ٹھیک ہوں''۔

مگر وہ ٹھیک کب تھی؟ اس کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی، دل مالش کرنے لگا تھا اور پھر جس دن اسے ابکائی آئی، خالہ بی جھٹ سربسجود ہو گئیں، شکرانے کے نفل ادا کر ڈالے، بہار ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور یہ خبر وہ پوری کالونی کو سنا آئی تھیں۔ جعفر کو بھی فون کر دیا تھا۔

جعفر کا فون آیا تو ڈھیروں نصیحتیں کر ڈالیں اس نے۔

مینو! اپنا خیال رکھنا۔

دیکھو کوئی کام نہیں کرنا۔

پریشان نہ ہونا مینو! دور رہ کر بھی میں اپنی جان کے پاس ہوں۔

ثمینہ یوں لجا جاتی جیسے جعفر اس کے پہلو سے لگا یہ مدھر سرگوشیاں کر رہا ہے۔

ماں بننے کا خواب ہر عورت دیکھتی ہے، ثمینہ بھی آج کل یہی خواب دیکھ رہی تھی۔ خالہ بی اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھیں مگر ثمینہ کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ عجیب بے رونق سی ہو گئی تھی وہ، ممتا کا حسن تو

اس پر کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک روز جب بیٹھے بیٹھے ثمینہ بے ہوش ہو گئی تو خالہ بی نے اس کی ماں کو ساتھ لیا اور لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے چیک کیا، تفصیل پوچھی اور کچھ ٹیسٹ کرانے کو کہا۔ بس، یہیں سے ثمینہ کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ شروع ہو گیا۔

رپورٹس آ گئی تھیں مگر سب کچھ توقع کے برعکس تھا۔ پریگننسی رپورٹ نیگیٹو تھی اور HIV پازیٹو۔ لیڈی ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا تھا اس نے خالہ بی کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی، دادی بننے کا خواب تو ٹوٹ ہی گیا تھا، بیٹے کا گھر بھی ٹوٹتا دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں پچھتاوا ہونے لگا۔

وہ کیسی لڑکی اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بیاہ لائی تھیں۔ خالہ بی خود کو کوس رہی تھیں، توبہ توبہ کر رہی تھیں، ثمینہ کو بہو بنانے پر خود سے نادم تھیں، بیٹے سے شرمسار تھیں، پوری کالونی سے شرمندگی محسوس کر رہی تھیں، ثمینہ حیران تھی۔ خالہ بی جو کالونی کے ڈھیر سارے بچوں کی معلمہ تھیں، عورتوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتی تھیں، دوسروں کے عیبوں پر چردہ ڈالنے کی تلقین کرتی تھیں، آج خود بھرے مجمعے میں اس کے ناکردہ گناہوں کے پول کھول رہی تھیں، اس کی بیماری کو کسی ناجائز تعلق کے ساتھ جوڑ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''اے، یہ جو بھولی صورت والی ہووے ہیں نا، پوری حرافتہ ہوویں ہیں یہ۔ کرتب باز، پردے میں زردے پکاویں۔ چپکے چپکے گل کھلاویں ہیں یہ کم بخت۔ ہائے میرے بیٹے کی تقدیر پھوٹ گئی کیوں میں اسے بیاہ لائی۔ نامراد نے کہیں یہ مرض اسے بھی نہ لگا دیا ہو''۔

خالہ بی اندیشے ظاہر کر رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی۔

چلو خالہ بی تو ساس ہیں مگر ماں کو کیا ہوا؟ وہ کیوں چپ ہے، مجھے خطاوار سمجھ رہی ہے۔ کیا ماں نہیں جانتی میرے بھرپور سراپے نے، میری الہڑ جوانی نے جعفر کے سوا کسی کی قربت نہیں پائی، کسی کی طرف دیکھا ہی نہیں؟ میں نے تو قربتوں کے سارے رنگ جعفر کی سنگت میں ہی دیکھے تو پھر کیوں سب مجھے مجرم جان رہے ہیں، کیوں مجھے اچھوت سمجھ رہے ہیں؟

مگر کون سنتا اس کی آہ وزاری؟

اب تو وہ مجرم تھی، اپنے پرائے سب کی نظروں میں مجرم ہو گئی تھی، وہ مجرم تھی اس جرم کی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔

وہ خطاکار تھی، اس خطا کی جو اس سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔

ثمینہ وقت کی ظالم موجوں کے بے رحم تھپیڑوں کی زد میں تھی۔

خالہ بی اسے اپنے پاس رکھنے کو راضی نہ تھیں اور ماں اپنے ساتھ اسے لے جانے کو تیار نہ تھی۔

جانے کس کی نظر لگی گئی تھی اس کی خوشیوں کو؟

جعفر کا فون آیا تو وہ بلک بلک کر بچوں کی طرح رونے لگی، جعفر اسے تسلیاں دیتا رہا، سب ٹھیک ہو جانے کا یقین دلاتا رہا مگر شک کی دشمن ہوائیں ثمینہ کو بے یقین کر گئی تھیں۔

اپنے کرچی کرچی وجود کو سنبھالے وہ کس طرح جعفر کے ''سب ٹھیک ہو جانے'' کا یقین کر لیتی؟

یقین کسی اسٹامپ پیپر پر تو لکھ کر نہیں دیا جاتا۔

جعفر کے یقین دلانے کے باوجود ثمینہ بے یقینی کی ہچکولے کھاتی کشتی میں سوار تھی۔ اس بگڑتی صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے کچھ روز تک جعفر آ رہا تھا اور جب جعفر آیا تو پوری کالونی ہمہ تن گوش تھی، ہر کوئی کان لگائے کسی ہنگامے کا منتظر تھا۔ خالہ بی کی دھاڑیں جعفر

کے قدم ڈگمگا رہی تھیں لیکن ثمینہ کی معصومیت کسی مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ خالہ بی ممتا کے جذبے سے مجبور جعفر کو ثمینہ کے سائے سے بچانے کی کوشش میں تھیں اور جعفر چاہت کے جذبے سے معمور، ثمینہ سے ملنے، اسے سنبھالنے کو مچل رہا تھا۔ ممتا کے پل صراط سے گزر کر جب وہ کمرے میں آیا تو لرزتی، کانپتی، نظریں چراتی خوفزدہ سی ثمینہ، اس کے دل میں گھاؤ کر گئی۔ تڑپتی سسکتی ثمینہ کو اس نے بڑے لاڈ سے سنبھالا، بڑے چاؤ سے سمجھایا، کیسی کیسی قسمیں کھائیں ساتھ نہ چھوڑنے کی مگر بے یقینی جیسے ثمینہ کی رگ رگ میں سرایت کر گئی تھی۔ خوف اس کی نس نس میں اتر گیا تھا۔ جعفر ثمینہ کے دکھ کو محسوس کر رہا تھا۔ لوگوں کے بہکانے اور ماں کے سمجھانے کے باوجود وہ ثمینہ سے رشتہ توڑنے کو تیار نہ تھا، وہ اس مسئلے کا حل چاہتا تھا، اس بیماری کا تدارک چاہتا تھا۔ ڈاکٹر سے مل کر اس کی بیماری کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ سو بنا کسی جھجک کے وہ اپنے دوست کو ساتھ لے کر لیڈی ڈاکٹر سے ملا، اس بیماری کی تفصیل پوچھی، ڈاکٹر نے جعفر سے بھی ٹیسٹ کروانے کو کہا۔

جعفر کا رزلٹ بھی پازیٹو تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل ہول گیا مگر پھر کڑے دل سے اس نے حقیقت کو مان لیا۔ اس نے جان لیا کہ اصل مجرم وہ خود ہے۔ دس برسوں سے پردیس میں رہتے ہوئے جانے کب اس کے قدم ڈگمگا گئے تھے، وہ بہک گیا تھا، غلطی اس نے کی تھی اور خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ بے چاری ثمینہ کو، وہ نادم تھا ثمینہ سے، شرمسار تھا خالہ بی سے۔ پھر اس نے بڑی ہمت سے خالہ بی کو ساری حقیقت بتا دی تھی۔ خالہ بی تو جیتے جی مر گئی تھی، الزام بہو پر تھوپ دیا تھا مگر قصور بیٹے کا نکلا تھا۔ ہائے یہ کیا ہو گیا تھا؟

جعفر نے ہمت نہیں ہاری تھی، دل نہیں چھوڑا تھا، وہ جینا چاہتا تھا، ثمینہ کو بچانا چاہتا تھا، ہر اچھے ڈاکٹر سے مشورے کر رہا تھا، اس مرض پر کام کرنے والی فلاحی تنظیموں سے رابطے کر رہا تھا، وہ جب سے آیا تھا انہی کوششوں میں تھا۔ اسے اپنی کم علمی کا اندازہ تھا، تبھی تو وہ چاہتا تھا۔ وہ لوگ اس بیماری کے بارے میں زیادہ جان سکیں جو ان پڑھ ہیں، روزی روٹی میں الجھے ہوئے یہ لوگ نہ اخبار پڑھتے ہیں نہ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ سٹار پلس نے سب کو اپنے چنگل میں پھنسا رکھا ہے، ایسے میں بیماری کے اشتہار پر کون توجہ کرتا ہے۔ آج اسی سلسلے کی ایک میٹنگ سکندریہ کالونی میں ہو رہی تھی، بڑے سے شامیانے تلے دریوں پر پوری بستی کی عورتیں جمع تھیں۔ ڈاکٹر غزالہ لیکچر دے رہی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں۔

''یہ وائرس صرف جنسی تعلقات سے نہیں پھیلتا، انتقال خون، استعمال شدہ سرنجیں اور ایک ہی ریزر کا بہت سے لوگوں میں استعمال بھی اس بیماری کا سبب بنتا ہے۔ اسے صرف جنسی بے راہ روی سے منسوب کر کے کسی معصوم عورت کی زندگی قابلِ نفرت نہ بنائیں، اسے جیتے جی نہ ماریں، ایسے مریضوں پر زندگی کے دروازے بند نہ کریں۔ اپنے پیار سے، اپنے رویے سے ان کی کٹھن راہیں آسان کریں، ان میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کریں''۔

ڈاکٹر غزالہ کا لیکچر جاری تھا اور خالہ بی کے من میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں، ندامت کے یہ موتی ان کے سفید ململ کے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ اپنے اللہ سے نادم تھیں ایک معصوم، بے گناہ پر الزام تراشی کی معافی مانگ رہی تھیں، توبہ توبہ کر رہی تھیں۔

❁❁❁

کچھ یادیں کچھ باتیں

وعدہ معاف گواہ

ہمارے اس وقت کے حکمران اپنی محافل میں برملا کہتے تھے۔ ''ہم ان حرامی بنگالیوں کو اقتدار کبھی نہیں دیں گے''۔ یوں ملک دولخت ہوگیا اور پاک افواج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

محترم عارف محمود صاحب! ''حکایت'' میں ''ہماری شکست کی کہانی'' کے عنوان سے سانحہ مشرقی پاکستان کا جائزہ پیش کیا گیا، جب اس کی دوسری قسط شائع ہوئی تو آئی ایس پی آر میں کھلبلی مچ گئی۔ مضمون بڑا چشم کشا اور انکشاف انگیز تھا۔ اس وقت صدیق سالک آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے تمام یونٹوں میں ''حکایت'' کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا اور یہ بھی کہا کہ عنایت اللہ نے جنرل نیازی کے کہنے پر یہ سب لکھا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اُن دنوں عنایت اللہ صاحب کا قلم تلوار بن چکا تھا۔ جنرل ٹکا خان، میجر جنرل فضل مقیم ڈیفنس سیکرٹری اور میجر صدیق سالک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر نے انفارمیشن منسٹری سے کہا کہ ''حکایت'' کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا جائے مگر اللہ زبردست نے بچالیا۔

☆ ملک محمد ساجد گل اعوان (پرسنل اسسٹنٹ جنرل نیازی) 0305-5690119

پاک وطن دو لخت ہوا، پاک افواج کی تذلیل ہوئی، عوامی حکومت برسراقتدار آئی، حمود الرحمٰن کمیشن تشکیل پایا، رپورٹ ضبط اور ضائع کر دی گئی۔ جنرل نیازی اور پاک افواج متعینہ مشرقی پاکستان کے خلاف پراپیگنڈہ مہم جس میں بعض سابقہ فوجی افسران نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں سرفہرست صدیق سالک تھے جنہوں نے حکومت کی سرپرستی میں کئی ایک کتب لکھ ماریں جبکہ وہ جنرل نیازی کے پی آر او تھے۔ پاک افواج کی یونیفارم تو وہ ضرور پہنتے تھے مگر فن حرب وضرب سے اسی طرح ناواقف تھے جیسے یونیفارم میں نرسیں، ان کی ڈیوٹی صرف رپورٹیں لکھنا ہوتی تھی۔

بھٹو کی خوشنودی میں انہوں نے جس طرح اپنی ہی افواج کی تذلیل کی ہے کوئی بھی پاکستانی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ دوران قید میجر جنرل محمد جمشید نے انہیں جرنیلوں کے کیمپ میں بلا لیا تھا۔ نامعلوم انہیں کون سا خطرہ لاحق تھا۔ ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں لکھتے ہیں۔

''مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا، میرا میزبان (بنگالی ایڈیٹر) اور اس کی نوبیاہتا بیوی ساتھ والے صوفے پر براجمان ہوئے۔ میزبان چند لمحوں کی مہلت مانگ کر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے کسی مہمان کو لانے کے بہانے چلا گیا اور میں حسین کمرے میں حسین تر حسینہ کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ میں نے سوچا لمحوں کو خاموشی کی نذر کر دینا کفرانِ نعمت ہو گا، کیوں نہ چند میٹھی میٹھی باتیں ہو جائیں''۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ملٹری ایکشن کے نام سے باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی اور پاکستان سیدھا شکست و ریخت کی طرف جا رہا تھا اور یہ ایک بنگالی کے حسین کمرے میں حسین تر حسینہ کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے جا بیٹھے تھے۔ اندازہ کریں اس افسر کی غیر ذمہ دارانہ روش کا۔ عوامی حکومت میں خوب نوازے گئے پھر ضیاء الحق کے دور اقتدار میں ان کے خاص الخاص درباریوں میں شمار ہونے لگا۔

صدیق سالک مرحوم نے ٹھنڈا اور گرم ایک ہی برتن میں ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی پہلی غیر فرمائشی کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں جنرل نیازی کا ذکر کسی اور انداز میں کیا ہے جبکہ حکومت کی سرپرستی میں لکھی جانے والی اپنی فرمائشی کتاب میں جنرل نیازی مرحوم کو اپنی شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے مگر پھر بھی ان کا قلم احوالِ واقعی لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں ایک ہی برتن میں ٹھنڈا اور گرم۔ میں یہاں چند اقتباسات پیش کروں گا جس سے ثابت ہو گا کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے''۔

20 دسمبر کو صبح آٹھ بجے کے قریب جنرل نیازی اپنی مخصوص قیام گاہ سے اپنے سابقہ ٹیک ہیڈ کوارٹر کی طرف آئے جہاں انہیں جو افسر اور جوان دستیاب ہو سکے ان سے الوداعی باتیں کیں۔ گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے جنگ بندی کا معاہدہ کیا ہے، عزت کا سودا نہیں۔ لہٰذا اپنی عزت اور وقار کو برقرار رکھنا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے دشمن کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنا اور ڈھاکہ سے روانگی کے وقت جس چیز کی وہ اجازت دیں ساتھ لے لینا ورنہ ادھر ہی پھینک جانا۔ چیزوں سے بلاضرورت چمٹنے کی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ۔ (ہمہ یاراں دوزخ صفحہ 40)

اپنی فرمائشی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' جہاں اپنی توپوں کا منہ جنرل نیازی اور پاک افواج ایسٹرن کمان کی طرف موڑ دیا اور خوب تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا وہاں ان کی ایسی بھی تحریریں ملتی ہیں جو جنرل نیازی کے حق میں جاتی ہیں اور جنہیں وہ

جھٹلا نہیں سکے۔ مثلاً میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا میں صفحہ نمبر 100 پر لکھتے ہیں:

ماہ اپریل میں تین میجر جنرل، جنرل نیازی کی اعانت کے لئے ڈھاکہ پہنچے۔ میجر جنرل رحیم 14 ڈویژن کے جی او سی مقرر ہوئے جبکہ میجر جنرل شوکت رضا اور میجر جنرل نذر حسین کو 9 ڈویژن اور 16 ڈویژن دیئے گئے۔ جنرل نیازی نے اپنے تازہ وسائل کے پیش نظر مشرقی پاکستان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی سرحد جنرل شوکت رضا کو شمال مغربی علاقہ جنرل نذر حسین شاہ کو اور باقی علاقہ جنرل رحیم کو سونپ دیا۔ اس اضافہ طاقت کے ذریعے سارے مشرقی پاکستان میں حکومت کو کنٹرول بحال کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ بڑے بڑے شہروں سے باغیوں کو نکالا جا چکا تھا اور وسط مئی تک ہر قابلِ ذکر جگہ پر پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی۔

مشرقی پاکستان ڈاکٹر مالک اور جنرل نیازی کے سپرد کر دیا گیا۔ یکم ستمبر شام کو آفیسرمیس میں الوداعی پارٹی دی گئی۔ جنرل نیازی نے ٹکا خان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جوابی تقریر میں جنرل ٹکا خان نے کہا میری خواہش تھی جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر جاؤں مگر بڑوں کی مرضی۔

بہرحال آپ حوصلہ رکھیں آپ کے کمانڈر جنرل نیازی بڑے تجربہ کار ہیں، وہ آپ کی مناسب راہنمائی فرمائیں گے۔ اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دینا ورنہ یہاں آپ کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

(میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ 100)

ان کا کام پایۂ تکمیل پر پہنچ چکا تو انہیں فوراً واپس بلا لیا گیا اور ان کی جگہ جنرل نیازی کو اس دلدل میں دھکیل دیا گیا۔ اپنے اور پرائے ان پر پتھر برسانے لگے، کسی کو یاد ہی نہیں رہا کہ اصل مجرم کون ہے۔ نہ تو ''البدر'' اور ''الشمس'' کے کارکنوں کا خون کسی کے ہاتھ پر نظر آیا اور نہ ٹکا خان کے ملٹری ایکشن میں مارے جانے والے بے گناہ شہریوں کے خون کا حساب و کتاب ہوا کیونکہ اسلام آباد میں موجود ہر اہم شخصیت نے چہرے پر نقاب اور ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھے تھے۔ البتہ مسٹر بھٹو کے منہ سے ایک بات نکل گئی کہ میں نے سرمایہ داروں کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی، اب دوبارہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے۔ (راقم)

آگے جا کر صفحہ 126 پر لکھتے ہیں: جیسور، سلہٹ اور رنگ پور سیکٹر میں جھڑپوں کے بعد جنرل نیازی وہاں تشریف لے گئے۔ میں (صدیق سالک) بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے پسپا ہونے والی یونٹوں کو بُرا بھلا کہا اور یہ فیصلہ صادر فرمایا۔ آئندہ کوئی فوجی دستہ یا پلٹن اس وقت تک پسپا نہیں ہو گی جب تک اس کی تین چوتھائی نفری زخمی یا شہید نہ ہو جائے۔ ایسی صورت حال میں بھی پسپائی جی او سی کی ذاتی اجازت کے بغیر نہیں ہو گی۔ جنرل نیازی 22 نومبر سے 2 دسمبر (دوران جنگ) تک تقریباً ہر روز سرحدی علاقوں کے دورے پر جاتے رہے۔

جنرل نیازی 27 نومبر کو بلی گئے جہاں غیر ملکی صحافیوں کی ایک جماعت بھی پہنچی ہوئی تھی۔ وہاں ایک غیر رسمی اخباری کانفرنس شروع ہو گئی جو آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ جنرل نیازی سے ایک غیر ملکی صحافی نے پوچھا، آپ کے خیال میں بھرپور جنگ کب شروع ہو گی تو انہوں نے جواب دیا۔ میرے لئے بھرپور جنگ تو پہلے ہی سے شروع ہو چکی ہے۔ صحافیوں کی یہ جماعت جب تباہ شدہ بھارتی ٹینک دیکھنے روانہ ہوئی تو جنرل نیازی نے ڈھاکہ روانگی کا ارادہ کیا۔ انہیں ہرگز خدشہ نہ تھا کہ ان کے ہیلی کاپٹر پر کہیں بھارتی جیٹ نہ جھپٹ پڑیں۔

(صفحہ 127)

پھر صفحہ 139 پر لکھا ہے: جس وقت میں آپریشن روم میں داخل ہوا جنرل نیازی چیدہ چیدہ افسروں سے خطاب کر رہے تھے انہوں نے ٹھنڈی پتلون اور سلیٹی رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ریشمی رومال (سکارف) تھا ان کی پشت دیوار کی طرف تھی۔ 30، 35 حاضرین میں میجر جنرل راؤ فرمان علی اور ایڈمرل محمد شریف بھی شامل تھے۔ جنرل نیازی گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ محدود سی جگہ میں ٹہلتے بھی جاتے تھے، ان کے چہرے پر پریشانی یا بحران کے کوئی آثار نہ تھے۔ البتہ ماحول اتنا گمبھیر تھا کہ ان کے منہ سے جو لفظ نکلتا سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ ان کے خطاب کا لب لباب یہ تھا کہ اب تمام بندشیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب ہمیں بین الاقوامی سرحدیں پار کرنے کی آزادی ہے۔ اب بادل چھٹ چکے ہیں۔

تقریر کے بعد جنرل نیازی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اعلانِ جنگ کے موقع پر ان کی طرف سے آرڈر آف دی ڈے تیار کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے افسروں اور جوانوں پر واضح کر دیا کہ اب دشمن جہاں بھی ملے سرحدوں کا خیال کئے بغیر اسے تہس نہس کر دیں۔ آخری دم تک دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں کیونکہ جان بچا کر بھاگنے کی تمام راہیں مسدود ہیں۔ (صفحہ 140)

مجھے یاد ہے کہ دو فوجی افسر جن کے کندھوں پر آدھ آدھ پاؤ پیتل چمک رہا تھا، یکے بعد دیگرے میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ تمہیں جنرل نیازی کا قرب حاصل ہے، تم اسے کیوں نہیں کہتے کہ حقیقت پسندی سے کام لے ورنہ ہم سب کتوں کی موت مر جائیں گے۔ میں نے ان سے معذرت کی کہ پی آر او کا کام نہیں کہ وہ جنگی معاملوں میں کمانڈر کے فیصلوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ میں نے جنرل نیازی سے تو اس موضوع پر کوئی بات نہ کی البتہ 8، 9 دسمبر کی درمیانی شب کو جب جنرل فرمان علی مجھے ایسٹرن ہیڈ کوارٹر سے باہر مل گئے تو انہوں نے کہا ہاں گورنر بھی اس بارے میں فکرمند ہیں مگر جنرل نیازی کا اپنا زاویۂ نگاہ ہے۔ بہرکیف ہم اس سلسلہ میں کچھ کریں گے۔ اگلے روز گورنر مالک نے صدر کو ایک تار دیا جس میں صورتِ حال کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا کہ میں ایک مرتبہ پھر آپ پر زور دوں گا کہ آپ جنگ بندی اور سیاسی تصفیے پر غور کریں۔ (صفحہ نمبر 197)

جنرل نیازی 11 دسمبر کو سی ایم ایچ ڈھاکہ گئے جہاں ان کے سامنے نصف درجن نرسیں پیش کی گئیں جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے جنرل صاحب سے درخواست کی ہمیں مکتی باہنی کے درندوں سے بچانے کی تدبیر کی جائے کیونکہ مارچ اپریل (جنرل یعقوب خان اور جنرل ٹکا خان) کے دور میں جو عورتیں ان کے ہتھے چڑھ گئی تھیں ان سے عبرتناک سلوک کیا گیا۔ جنرل نیازی نے انہیں تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں کمک آنے والی ہے (جیسے کہ جنرل گل خان کی طرف سے سفید اور پیلی کمک کی بذریعہ فون جنرل نیازی کو طفل تسلیاں) کل شام تک انتظار کریں اگر حالات خراب ہو گئے اور صورت حال بے قابو ہونے لگی تو ہم آپ کو مکتی باہنی کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے خود ختم کر دیں گے۔ (صفحہ نمبر 202)

جنرل نیازی ہسپتال سے ائرپورٹ چلے گئے جہاں انہوں نے طیارہ شکن توپوں کا معائنہ کیا اور جوانوں کو ہر وقت چوکنا رہنے کی ہدایت کی صحافیوں نے ان کے عزائم کے بارے میں استفسار کیا تو کہنے لگے۔ میں آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑوں گا اور ڈھاکہ پہنچنے کے لئے میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔ انہیں یہاں سے (اپنی چھاتی ٹھونکتے ہوئے) اپنے

ٹینک گزارنے ہوں گے۔

جنرل نیازی کی یہ سب ویڈیوز اب نیٹ پر باآسانی دستیاب ہیں۔(صفحہ نمبر 202)

بانی ''حکایت'' عنایت اللہ مرحوم اپنی کتاب ''ہماری شکست کی کہانی'' کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔''جس کتاب نے زیادہ شہرت حاصل کی وہ ہے صدیق سالک مرحوم کی کتاب "Witness to Surrender" جو''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کے عنوان سے اردو میں بھی چھپی ہے۔ یہ کتاب بھٹو مرحوم کے دور میں لکھی بلکہ لکھوائی جا رہی تھی اور یہ ثابت کیا جا رہا تھا کہ سقوط مشرقی پاکستان کی ذمہ دار صرف فوج ہے لیکن کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ بھٹو مرحوم کا دور حکومت تختۂ دار پر جا کر ختم ہو گیا اور فوج کی حکومت آ گئی پھر اسی کتاب کا رخ پھیر دیا گیا۔ اس طرح ایک غیر مستند کتاب کو شہرت اور مصنف کو دولت تو مل گئی لیکن حقائق پوشیدہ اور کردار نقاب پوش ہی رہے۔

ڈاکٹر اجمل نیازی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔صدیق سالک نے ایک کتاب لکھی تھی۔''وٹنس ٹو سرنڈر'' یہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھے صرف یہ پتہ نہیں چلا کہ سرنڈر کیوں ہوا؟ سانحہ بہاول پور میں سالک بھی جان ہار گیا اگر زندہ ہوتا تو ایک اور کتاب ضرور لکھتا۔

(وٹنس ٹو بلنڈر)

سراج منیر نے کہا کہ سالک کا جنرل ضیاء الحق کے ساتھ مرنا مشیت ایزدی کا ایک بامعنی اظہار ہے ورنہ اس سے ضیاء کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور لکھوا دیا جاتا۔ میں نے سالک کی زندگی ہی میں لکھا تھا ایک فوجی افسر کا اپنے ہی انچارج فوجی افسر کے خلاف لکھنا کچھ اچھا نہیں مگر شاید سالک پیشہ ورانہ دیانت اور مروت سے واقف ہی نہیں۔اس کی کتاب سے نہ قوم کا مورال بڑھا ہے اور نہ ہی اصل بات سے پردہ اٹھا ہے۔آخر خود سالک سرنڈر سے کتنا دور تھا جبکہ وہ جنرل اے اے کے نیازی کے قریب ترین افسروں میں سے ہے جس طرح آج کل جنرل ضیاء الحق کے ہر وقت ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے سالک سے یہ کتاب لکھوائی گئی ہے ورنہ یہ ابتدائی طور پر ایک ادیب ہے اندیشہ ہے کچھ مدت بعد وہ ''وٹنس ٹو بلنڈر'' نہ لکھ مارے۔ پھر بھی کیا پتہ چلے گا کہ بلنڈر کیسے ہوا؟ سالک جو کچھ دیکھتا ہے اس کے بارے میں بھی سن کر لکھتا ہے۔ ایسے میں اس کی حیثیت ''وعدہ معاف گواہ'' کی ہے۔

16 دسمبر 1971ء کو پاک افواج کے محض ایک فرد جنرل نیازی نے سرنڈر نہیں کیا تھا بلکہ اس نے تو اس وقت کے برسراقتدار ٹولے کی خواہشات کی تکمیل کی تھی اور ان کے سیاسی فیصلہ نہ کر سکنے کی اہلیت کے سامنے سرنڈر کیا تھا۔ پاک افواج کا ہر افسر اور جوان مشرقی پاکستان میں بھارت سے جرأتمندانہ لڑا لیکن جب ملک کے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے پاک افواج کو بنگالی مسلمانوں کے مدمقابل کھڑا کر دیا تو دوست اور دشمن کے امتیاز کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کے مقابلے میں ہماری افواج اپنی مرضی سے جا کر نہیں کھڑی ہو گئیں بلکہ اس وقت کے حکمرانوں نے ووٹ کی طاقت کو رائفل کی طاقت سے دبانے کی کوشش کی۔ جس کے پاس رائفلیں وافر تھیں وہ کامیاب ہو گیا۔

ہمارے اس وقت کے حکمران اپنی محافل میں برملا کہتے تھے۔''ہم ان حرامی بنگالیوں کو اقتدار کبھی نہیں دیں گے''۔ یوں ملک دولخت ہو گیا اور پاک افواج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

❁❁❁

سفرنامہ

آپ یقین کریں جب میں غار میں داخل ہوا تو میرا شراکت دار کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے بڑی تسلی سے جگہ بدل بدل کر نفل ادا کیے، اس کے بعد غار کی دیواروں، چھت اور فرش پر سینہ جسم اور جہاں تک ممکن ہو سکا چہرہ ملتا رہا اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

☆اعجاز حسین سٹھار 0302-3535383

آخری قسط

دیارِ حرم کو چلے

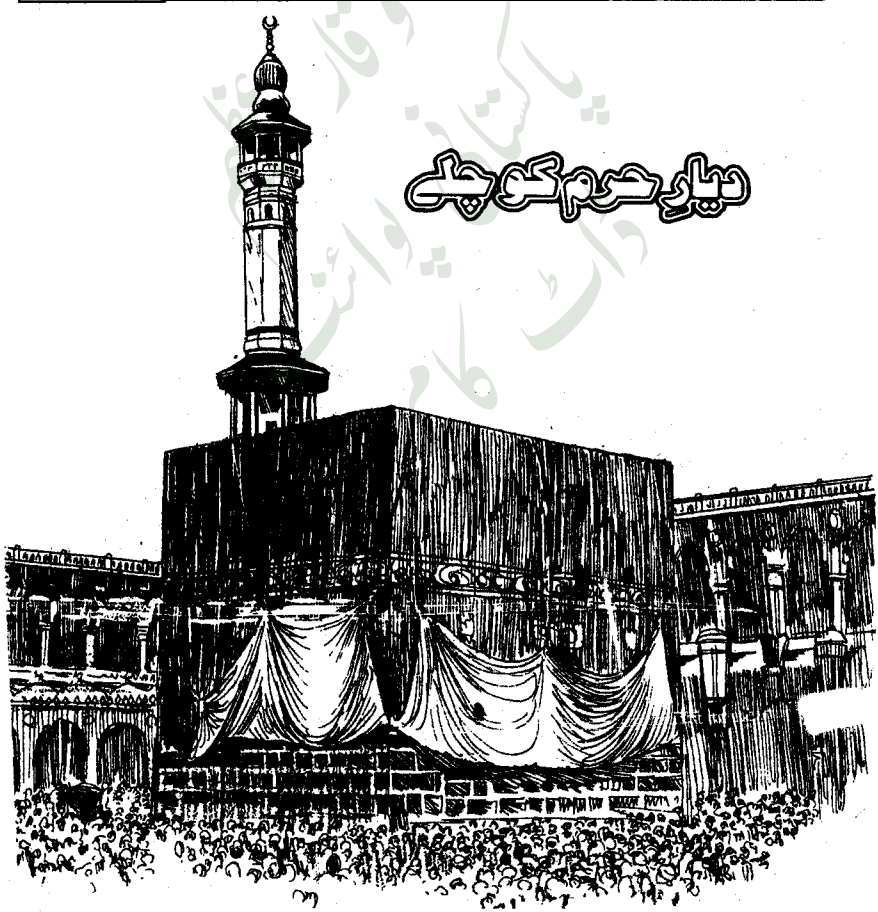

محترم عارف محمود صاحب! حج کے سفرنامہ کا آخری حصہ پیش خدمت ہے۔ میں نے اسے اپنے طور پر محنت اور قارئین کے مزاج کے مطابق لکھنے کی کوشش کی ہے اور کئی ضمنی حالات کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا۔ میں نے نیک نیتی کے ساتھ ہر بات سچ لکھی ہے۔ جن زیارات اور مقدس مقامات پر میں نے خود حاضری دی، وہی احوال احاطہ تحریر میں لایا ہوں۔ زیب داستان کے لئے سنی سنائی باتیں شامل نہیں کیں۔ کہتے ہیں خط نصف ملاقات ہوتی ہے اس طرح پڑھنے والے نصف حج کا لطف حاصل کرلیں گے۔ ''حکایت'' کے ہزاروں قارئین سے التماس ہے کہ وہ اپنی قیمتی آرا ضرور دیں تاکہ آئندہ میں جو بھی تحریر لکھوں تو سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہ ہو۔

مسجد جعرانہ

چند ساتھی عمرہ ادا کر آئے تھے، انہیں مبارک باد دی اور تین دن بعد سب مریض افاقہ محسوس کر رہے تھے تو ہم نے بھی مسجد جعرانہ سے عمرہ کا پروگرام بنا لیا۔ احرام باندھ کر سڑک پر آئے، جس گاڑی والے کو روکتے زیادہ رقم مانگتا، وہ دیکھ رہے تھے کہ جب احرام باندھا ہے تو عمرہ تو کریں گے اور میقات تک جانا ضروری ہے۔ ایک ٹیکسی ہمارے قریب رکی تو کچھ حوصلہ ہوا۔ ڈرائیور بنگلہ دیشی تھا، اس نے بھی زیادہ رقم مانگی، ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے، بھاؤ تاؤ کرتے رہے لیکن بات نہ بنی تو میں نے اسے بنگلہ دیش اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات پر لیکچر دیا جس کا مقصد کہ ہم آپس میں بھائی ہیں۔ وہ کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا لیکن باتوں کے ہیر پھر میں ضرور آ گیا شاید وہ بیچارہ دیہاڑی دار ڈرائیور تھا۔ اس نے معقول معاوضہ بتایا تو ہم نے سیٹوں پر بیٹھنے میں دیر نہ لگائی۔ اس نے خوشی میں گنگناتے ہوئے گاڑی کو ایسی سپیڈ پر رکھا کہ کئی پلوں کو پیچھے چھوڑا، دو تین سرنگوں میں سے گزرا اور آبادی سے نکل آئے۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا پھر سڑک کھلی اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے آدھ گھنٹے بعد مسجد جعرانہ کی پارکنگ میں اتار دیا۔

یہ مکہ المکرمہ سے طائف کی جانب چھبیس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ غزوہ حنین سے واپسی پر حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تیرہ دن قیام فرمایا اور عمرہ کا احرام باندھا اسی نسبت سے اس عمرہ کو ''بڑا عمرہ'' کہتے ہیں۔ یہاں سے سینکڑوں انبیائے کرام نے عمرہ کا احرام باندھا ہے۔ میں نے یہاں سے کئی بار عمرہ کا احرام باندھا ہے، بڑا پُرسوز مقام ہے۔ مسجد سے متصل کنواں کا پانی کڑوا تھا کہ جانور تک منہ نہ لگاتے تھے۔ بستی والوں کی استدعا پر حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈول پانی نکلوا کر اس میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور پورا ڈول کنویں میں ڈال دیا، جس سے پانی ہمیشہ کے لئے شیریں ہوگیا۔

گلاب کے پھول کی مانند خوبصورت گنبد والی اس مسجد کو جدید دور میں بھی سنوارا گیا ہے۔ نہانے اور وضو کے لئے معقول انتظام ہے۔ اس مقدس کنویں کا پانی مسجد میں استعمال ہوتا ہے۔ کنواں پیچھے دائیں طرف ہے لیکن تالہ لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ دائیں طرف چند قدم کے فاصلے پر چاردیواری کے اندر شہدا غزوہ حنین کی قبریں ہیں۔ نیچے پتھر رکھ کر اور چاردیواری سے لٹک کر فاتحہ خوانی کی یہاں ایک خشک نہر بھی دیکھی شاید یہ برساتی ہو۔ کناروں پر چند درخت بھی ہیں۔

مسجد اندر سے کھلی اور ائرکنڈیشنڈ ہے۔ میقات ہونے کی وجہ سے بند نہیں ہوتی۔ تفصیلی جائزہ لے کر دو نفل پڑھ کر عمرہ کی نیت کر لی اور تلبیہ پڑھتے ہوئے

گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اور کچھ دوسرے ساتھیوں نے اپنے مرحوم بزرگوں کی طرف سے عمرہ کی نیت کی تھی۔ واپسی سفر میں سڑک کے بائیں ہاتھ لائٹوں کے جھرمٹ میں سٹیڈیم دیکھا۔ گاڑی ڈرائیور نے فٹ بال کا اشارہ کیا تو میں سمجھ گیا، ہم حرم کے قریب اتر گئے۔ کرایہ ادا کر کے حرم میں داخل ہو کر طواف وسعی سے فارغ ہو کر باہر آئے راستے میں بال کٹوائے اور ہوٹل آئے تو اپنے بیڈ پر یوں لیٹے کہ تھکاوٹ کی وجہ سے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

سعودی عرب کے لوگ کاروبار کے ماہر ہیں۔ یہاں کوئی صنعت، فیکٹریاں اور دستکاری نہیں ہے لیکن تجارت کوئی ان سے سیکھے۔ بچے، جوان اور عمر رسیدہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ نماز کے بعد گلیوں میں حاجیوں کا رش ہوتا ہے۔ یہ سڑک کے کنارے یا خالی تھڑے پر چادر بچھا کر، مال سجا کر بیٹھ جائیں گے۔ تسبیح، جائے نماز، سلے سلائے کپڑے، رومال، چھتریاں، ٹوپی، کھلونے، کلاک، گھڑیاں، کھجور اور چھلے کے پیکٹ سجائے مختلف حربوں اور آوازوں سے گاہکوں کو متوجہ کریں گے۔ اگر آپ ہوٹل میں کمرہ لینا چاہتے ہیں بڑی خوش اخلاقی سے آپ کا ہاتھ پکڑ کر بغل میں دبا کر چلتے جائیں گے اور کھنڈر کمرے کی طویل صفات گنوانے کے ساتھ ''پاکستانی ہمارے بھائی'' کی رٹ لگائے رکھیں گے۔ کمرہ لے لینے کے بعد کسی شکایت کی صورت میں وعدہ پر ٹرخاتے کئی دن گزار دیں گے۔ ایسے حربے دکاندار بھی آزماتے ہیں۔ سامنے کاؤنٹر کی دراز میں کھجور کا پیکٹ رکھا ہوگا، آپ اندر داخل ہوئے تو جھٹ چند دانے رکھ کر کہیں گے بھائی کھاؤ یہ تحفہ اور کھانا سنت ہے۔

مجھے ایک ایسا ہی عربی ملا اور خوب ملا، ہم اسی دن مکہ المکرمہ پہنچے تھے۔ عمرہ کی ادائیگی کے بعد مروہ کے قریب دروازہ سے باہر نکلے کہ سامنے کی دکان سے سر منڈواتے ہیں۔ ابھی چند قدم چلے تو یہ بوڑھا عربی ہماری تاڑ میں کھڑا تھا، اشارے سے پوچھا کہ سر منڈوائیں گے؟ بس ہمارے سر ہلانے کی دیر تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور عام ریٹ سے ایک ریال کم بتایا۔ ہم بھی رعایتی نرخ کی وجہ سے ساتھ چل پڑے۔ اب وہ وقفے وقفے سے جیب میں ہاتھ ڈالتا اور دو دانے کھجور پکڑا دیتا۔ اسی آنکھ مچولی میں بازار سے ایک بغلی گلی میں مڑا تو دکان پر ''صالون'' لکھا نظر آیا تو سکھ کا سانس لیا۔ اب غور کیا تو ہم کافی فاصلہ طے کر آئے تھے اور مزے کی بات ہے ہم ننگے پاؤں تھے، چپل تو داخلی دروازہ کے قریب ریک میں رکھے تھے جو ہم نے واپسی پر اٹھانے تھے۔ ہم عربی کی بزرگی سے مار کھا گئے، اب اس کے داؤ کی داد رہے تھے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ایک بار ہماری رہائش محلہ الجیاد میں تھی۔ بلڈنگ کے مالک کا بیٹا جو ابھی نوعمر تھا، ظہر کے بعد ایک بڑے تھرماس میں چائے بیچتا تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں، وہ جوان ہو کر خود کسی جدید پلازہ کا مالک بن چکا ہوگا۔

میری یہ کوشش رہی ہے کہ ہر چکر میں سعودی عرب والے مجھ سے جو منافع کماتے ہیں کم از کم وہ سارا یا کچھ حصہ واپسی نکال لوں۔ میں نے یہاں کبھی عطر نہیں خریدا، جہاں بھی کوئی بیچنے والا نظر آتا ہے اس سے کپڑوں پر لگوا لیتا ہوں، خوشبو سونگھ کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ جب سبزی خریدنی ہو تو پہلے انگور کا ریٹ پوچھتا ہوں، چند دانے چکھنے کے بہانے کھائے اور مطلوبہ چیز خرید کر آگے بڑھ گیا۔ اتنے رش میں دکاندار ہماری چالاکی کیسے نوٹ کر سکتا ہے۔ کئی دوست مجھے سیانا جانتے ہوئے خریداری کرنے ساتھ لاتے ہیں۔ میں بھی شور شرابا کر کے، کئی حیلے اور واقفیت جتلا کر رعایت کرا دیتا ہوں لیکن مختلف کھانے کی چیزوں سے پیٹ بھر

لیتا ہوں۔ کھجور خریدنی ہے تو مٹھی بھر پستہ مغز منہ میں ڈال لوں گا، بادام کی گری، میوہ، الائچی کے بعد انجیر کی باری آئے گی۔ آخر میں کھجور خرید کر چل دیں گے اور وہاں کھجور خریدتے وقت وہ خود بھی پیش کرتے ہیں لیکن میں دکاندار کے سامنے اور کبھی نظر بچا کر کافی مقدار پیٹ میں اتار لیتا ہوں۔ وہ گاہکوں کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں، جھگڑا کریں گے تو دوسرے گاہک بھی ساتھ والی دکان پر چلے جائیں گے۔ کئی لوگ ثواب کمانے کی خاطر تسبیح، جائے نماز اور کھجور کے پیکٹ تقسیم کر رہے ہوتے ہیں تو دائیں پھر بائیں، آگے اور کبھی پیچھے جا کر زیادہ تعداد میں وصول کر لیتے ہیں۔ کبھی داؤ لگے تو چھین بھی لیتے ہیں۔ کسی چیز کے لینے میں ہمارا ہاتھ پیچھے نہیں ہٹا بس اللہ ہماری کوتاہیوں کو معاف کرے گا۔ چوری نہیں کرتا، جھوٹ نہیں بولتا اور ممکن حد تک کوشش ہوتی ہے کہ کسی کے ساتھ دھوکہ ہو نہ دل آزاری کروں لیکن بچوں جیسی عادتیں اور شرارتیں کہاں زیب دیتی ہیں۔

شرکۃ المکہ

مکہ المکرمہ اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔ آبادی کی ترتیب نہیں ہے بلکہ مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کئی ہوٹل اور عمارتیں سامنے کی طرف سے سڑک پر ہیں لیکن پچھلی طرف سے پہاڑ عمارت میں داخل ہو گیا ہے۔ یوں جانئے کہ دو تین منزلیں غائب ہیں اور پچھلی طرف سے تیسری منزل پر بغیر سیڑھی داخل ہو سکتے ہیں۔ پہاڑوں کو ہموار کر کے چند سال قبل یہ ہوٹل بنایا گیا ہے جس کی گراؤنڈ پر سولہ منزلیں ہیں۔ یہ اپنے وقت کی سب سے بڑی اور منفرد طرز تعمیر رکھنے والی عمارت ہے۔ وسیع زمین پر مستطیل پیمائش میں شاہین کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ غور سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک شاہین اڑان بھرنے کے لئے پروں کو پھیلا رہا ہے۔ انگریزی کے ''وی'' سے مشابہ ہے۔ درمیان میں سر کی جگہ ایک بڑا ہال بنایا گیا ہے جو خوبصورتی میں بے مثال ہے۔ چھت کے اوپر فوارے لگے ہیں جن کے اوپر طاقتور بلب سے روشنی کی جاتی ہے۔ رات میں پتھریلی زمین اور اونچے پہاڑوں کے درمیان جب فوارے پانی پھینکتے ہیں، اوپر بلب روشن ہو کر روشنی بکھیرتے ہیں تو اس مسحور کن منظر کو دیکھنے کے لئے قدم خود بخود رک جاتے ہیں۔ تمام کھڑکیاں لکڑی سے بنائی گئی ہیں جن پر پرانے طرز کی چترکاری ہے اور خاص انداز میں دیوار سے باہر ابھری ہوئی ہیں۔ آخر منزل کے قریب کلاک لگا ہے جس سے نیچے کھڑے ہو کر وقت دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے اوپر ہیلی پیڈ بنایا گیا ہے جس کا گولائی ڈیزائن کا شیڈ کلاک سے آگے تک بڑھا ہوا ہے۔ پارکنگ کے لئے تہہ خانہ مخصوص ہے۔

حج کے اگلے دن کئی بسیں ہوٹل کے سامنے قطار میں کھڑی تھیں اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں یہاں حاجی ٹھہرے ہوئے تھے جو ختم ہونے میں نہ آ رہے تھے۔ گراؤنڈ فلور میں چاروں اطراف میں دکانیں ہیں یہاں برگر، سیخ پر اونٹ کا بھنا گوشت اور آئس کریم بڑے مزے کی ملتی ہیں۔ میں آتے جاتے خرید کر چلتے پھرتے یا دکان کے سامنے برآمدہ میں کھڑے ہو کر کھا لیتا۔ سیکنڈ فلور پر مختلف کمپنیوں اور ائرلائن کے دفاتر ہیں۔ کئی بینکوں کی شاخیں ہیں۔ ہم نے قربانی کے لئے کوپن یہیں ایک بینک سے خریدا تھا۔ سعودی ائرلائن کا دفتر چوتھے فلور پر ہے۔ ایک بار ہم ایک ٹکٹ کینسل کروانے کے چکر میں آئے گراؤنڈ فلور سے لفٹ چوتھی منزل تک دستیاب ہے اوپر جانے کے لئے دوبارہ دوسری لفٹ میں سوار ہونا پڑے گا۔ یہاں چوتھے فلور پر بھی ایک الگ دنیا آباد تھی۔

کمروں کے درمیان گھاس کا سرسبز لان تھا، کناروں پر چھوٹے قد کے پودے لگائے گئے تھے جن کی نازک شاخوں کو تراش کر مختلف شکلیں دی گئی تھیں۔ لفٹس جو آخری منزلوں تک جاتی تھی، کیپسول کی شکل میں تھی جس میں بیرونی شیشہ استعمال کیا گیا تھا۔ آپ پانچویں منزل سے سولہویں منزل تک دور دور شہر کا نظارہ کرتے جائیں۔ ہم بے مقصد دو تین بار اوپر نیچے لفٹ پر سفر میں رہے، سامنے مسجد الحرام اور آخری منزل پر جا کر خانہ کعبہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ یہ چلتی پھرتی، اوپر نیچے آتی جاتی اور مزے کے ہچکولے دیتی ہے اور ساتھ مفت کی سیر ہے، تھکاوٹ اور بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عبادت کے وقت کا ضیاع ضرور ہوتا ہے۔ اب شرکتہ المکہ کے دائیں طرف جدید تعمیر میں ہوٹل ''دارالتوحید'' مکمل ہو کر کاروبار کے لئے کھل چکا ہے۔ اس کی تیئس منزلیں ہیں لیکن شرکتہ المکہ کی سج دھج کی الگ انفرادیت ہے جو اسے برتر بنائے ہوئے ہے۔ آپ شارع ابراہیم پر چلیں یا کبوتر چوک سے شارع ہجرہ کی طرف مڑ جائیں، اس ہوٹل کے دائیں بائیں سے گزرنا لازمی ہے۔

یہاں گاڑیوں کی بہتات ہے، دنیا کے جس ملک میں نیا ماڈل بنتا ہے تو سب سے پہلے سعودی عرب کو درآمد کی جاتی ہے۔ جدید سنگل سڑک جتنی چوڑی کاریں اور بلڈوزر نما لینڈ کروزر ساون میں پیدا ہونے والے مینڈکوں کی طرح سڑکوں پر رواں دواں ہیں اور دیہاتی گلیوں اور خالی کھیتوں میں آوارہ پھرتے گدھوں کی طرح بہتات ہے۔ سائیکل نہ ہونے کے برابر ہے، کوئی حبشی جوان موٹر سائیکل دوڑاتا نظر آ جاتا ہے البتہ پولیس کے پاس جس طاقت کے موٹر سائیکل ہیں ہمارے ہاں کی چھوٹی کاریں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ایک بار رکشہ جس میں دو افراد سوار تھے، بھی دیکھا تھا جو اونچائی سے ڈھلان کی طرف آیا اور میرے قریب سے تیز رفتاری سے گزر گیا جو اس ماحول میں عجیب الخلقت شے دکھائی دیا۔

ہمارے ہاں کی نسبت یہاں کے اخبارات بالکل بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں۔ سیاسی بیانات کی مار دھاڑ ہے، نہ فرقہ پرست مولویوں کی۔ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں اور فتوؤں کی بھرمار ہے نہ کہیں حکومت کے دعوؤں اور سیاسیوں کے اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے صفحات سیاہ کئے گئے ہیں۔ قتل، ڈاکہ زنی، لڑائی جھگڑا، اغوا، تاوان، دہشت گردی اور آبروریزی جیسی وارداتوں کے نام سے شاید لوگ وقف تک نہیں ہیں البتہ یہاں کبھی کبھار جیب تراشی کی واردات سننے کو مل جاتی ہے جس کے الزام میں اکثر غیر ملکی پکڑے جاتے ہیں۔ اخباروں میں سیاست دانوں اور وزیروں کے لئے بالکل تھوڑی جگہ ہوتی ہے۔ مجھے تو اس طبقہ پر بہت ترس آتا ہے، کسی کا بیان نہ کوئی الزام، دھمکیاں نہ شیخیاں کہ یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ حکمران بھی ایسے بیان جاری نہیں کرتے بلکہ عمل کرتے ہیں۔ سعودی حکومت نے حاجیوں کو سہولیات پہنچانے کے لئے جتنا زر کثیر خرچ کیا ہے اس کا سالانہ بجٹ کھربوں ریال ہے۔ مذہبی تعمیرات اور انتظامات پر اتنے بجٹ کی پوری دنیا میں مثال نہیں ملتی حالانکہ یہ زرعی اور صنعتی ملک نہیں ہے۔ واحد ذریعہ آمدن تیل ہے جس کے بدلے میں یہ ہر سہولت بیرونی دنیا سے حاصل کرتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں پڑھا کہ سمگلنگ کی اجازت نہیں دی جائے گی، عوام کو لوٹنے کی کھلی چھٹی نہ ہو گی اور چوروں ڈاکوؤں کو ہرگز برے کاموں کی اجازت نہ ہو گی۔

ہمارے ہاں تو یہ خبریں پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے متعلقہ افراد کو اجازت نامے تقسیم کئے جا رہے ہوں۔ سب سے زیادہ ہمدردی مجھے قاتلوں، لٹیروں اور اغوا

کاروں سے ہوئی۔ کئی دن تو ہماری آنکھیں ایسی خبریں پڑھنے اور کان سننے کو ترس گئے۔ یہاں ٹرینوں، بسوں اور ویگنوں کے حادثے بھی شاید نہیں ہوتے یا اخبار والے ایسی خبریں گول کر جاتے ہیں۔ اس کے بعد مظلوم ترین مخلوق وہاں کی پولیس ہے۔ تھانوں میں قتل اور ٹارچر نہ تھانے داروں کے نجی عقوبت خانے، فرار ہوتے ملزموں کے ساتھ پولیس مقابلے نہ کہیں تعریف و توصیف، تمغے، انعامات اور حتیٰ کہ تعریفی اسناد سے بھی محروم رہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ میں نے سڑکوں پر ٹریفک پولیس والوں کو ویگن، ٹرک اور بس والوں کو گھیر کر چالان کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حیف ہے ایسی پولیس پر، اس قدر بے اختیار بے کار پولیس بھلا کس کام کی؟ جب پولیس والوں کو دیکھا تو ان پر اور بھی رحم آیا، دبلے پتلے، سمارٹ، توند بڑھی ہوئی نہ سانس چڑھی ہوئی۔ دیکھنے میں شریف آدمی نظر آتے ہیں، عام حالات میں لوگوں پر رعب نہیں ڈالتے بلکہ رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہ ملازمت کر رہے ہیں اور خوش ہیں تو انہیں داد دینا چاہئے۔ کیونکہ تحفہ یا نذرانہ وہ لیتے نہیں ہیں تو اپنے اختیار میں تو یہی خالی دادرہ جاتی ہے جو دینے میں ہم کبھی کنجوسی نہیں کرتے۔

یہاں مختلف ملکوں کے حاجیوں سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے لیکن انڈونیشیا کے لوگ سب سے زیادہ پسند آئے ہیں۔ چھوٹے قد اور چپٹی ناک والے یہ لوگ بالکل بے ضرر ہیں۔ حجر اسود پر بوسہ لینے کے لئے جنگ کا منظر ہوتا ہے، یہ ایسے کسی ہنگامہ میں حصہ نہیں لیتے بلکہ بھاگ دوڑ، چھینا جھپٹی اور رش والی جگہ سے دور رہتے ہیں۔ یہ مختلف گروپ بنا کر چلتے ہیں۔ ہر گروپ کا الگ اور منفرد نشان ہوگا۔ عورتیں اپنی چادروں پر مختلف رنگ کی دھجیوں سے بنا پھول لگا کر رکھتی ہیں، کسی نے گلے میں رنگین ڈوری باندھ رکھی ہوگی اور مرد ایک رنگ کی شرٹ پہنے ہوں گے۔ جھکے کندھوں کے ساتھ اور اکثر ہاتھ پیچھے باندھ کر چلیں گے اور عورت مرد ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ جب آپ کے درمیان سے گزرنا چاہیں گے تو تھوڑا رک کر ہاتھ کے اشارہ سے راستہ مانگیں گے۔ آپ کی بے خبری میں بالکل نہیں گزریں گے۔ سیڑھی چڑھنا ہو یا حمام میں جانا ہو تو دوسرے کو پہلے موقع دیں گے۔ اگر کسی سے معمولی ٹکرا گئے ہیں تو معافی مانگ کر آگے بڑھیں گے۔ نماز کے بعد جہاں تک ہاتھ کی رسائی ہوگی، دونوں اطراف میں مصافحہ کریں گے۔ کبھی دوران سفر آپ کے ساتھ یا آگے پیچھے سیٹ پر بیٹھے ہیں تو کھانے پینے کی چیز، جوس یا چپس وغیرہ بھی دیں گے۔ ہمیشہ خوش اخلاقی اور مسکراتے چہرے کے ساتھ ملیں گے۔

آبِ زم زم

یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا معجزہ اور یادگار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیوی اور بیٹے کو ویران جنگل میں چھوڑ کر چلے گئے تو حضرت ہاجرہ علیہا السلام پانی کی تلاش میں نکل گئیں اور صفا مروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑتی رہیں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جو بچے تھے، فطری انداز میں زمین پر ٹانگیں چلاتے رہے جہاں آپؑ کی ایڑیاں لگتی رہیں وہاں سے اللہ نے چشمہ جاری کر دیا۔ ایک وقت آیا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے صدیوں بعد چشمہ گہرا اور بعد میں خشک ہو گیا تو پاٹ دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے مسلسل چار بار خواب میں زم زم کی جگہ کھودنے اور پانی نکلنے کے بارے دیکھا تو اپنے قبیلہ سے مشورہ کیا لیکن ہاتھ بٹانے کو کوئی تیار نہ ہوا تو تنہا اس

کام کا آغاز کر دیا۔ جب پانی نکل آیا تو پانی کی خوبی، شیرینی اور فراوانی نے ہلچل مچا دی۔ اس کے بے شمار فضائل ہیں۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زم زم کا گھونٹ ڈول میں ڈال کر پانی کے کنویں میں ڈال دیا، اس طرح یہ فیضانِ رسالت زم زم کی وساطت سے قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کو نکال کر چار بار زم زم سے دھویا گیا ہے۔ پہلی بار رضاعت میں جب عمر مبارک چار سال، دوسری بار دس سال، تیسری بار نزول وحی سے پہلے اور چوتھی بار لیلۃ الاسراء میں۔

زم زم ایک مکمل خوراک ہے جو بھوک میں مکمل کھانا اور ہر مرض میں شفا ہے۔ زم زم سے وضو کرنا مسنون ہے، ناپاک چیز دھونے سے منع فرمایا گیا ہے۔ ایک دوست کی معرفت حرم کے نیچے کام کرنے والے سلطان محمود سے تعارف ہوا اور اچھے خاصے تعلقات بن گئے۔ میں نے انہیں مجبور کیا کہ مجھے انڈر گراؤنڈ ورکشاپ دکھاؤ۔ وہ اپنی ذمہ داری اور ڈیوٹی کی وجہ سے مجبور تھے، وعدوں پر ٹرخا رہے تھے۔ تحقیق، جستجو اور تجسس میرے اندر بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے یوں میرے بار بار اصرار کو دیکھتے ہوئے اسے ہاں کہنا پڑی۔ فجر کی نماز کے بعد میں سلطان صاحب کے دفتر پہنچ گیا، وہ میرے انتظار میں تھے۔ ہم چھتہ بازار کے سامنے بنی لیٹرینوں کے دائیں طرف آ گئے۔ دیوار میں لوہے کا ایسا دروازہ فٹ تھا کہ فاصلے سے دکھائی تک نہ دیتا تھا۔ سلطان نے ایک ترچھی چابی گھمائی شاید کوئی کوڈ ورڈ بھی ہوں گے، سامنے کی طرف تنگ لوہے کی سیڑھی نیچے جا رہی تھی۔ ہم آگے پیچھے آہستہ روی سے بڑی احتیاط سے نیچے اتر گئے۔ اطراف میں مختلف شیڈز کے اندر کاریگر کئی مشینوں، بجلی کے آلات اور ٹونٹی، پیسوں کو سیٹ کر رہے تھے، ہم ایک کھلے کمرے میں بیٹھے رہے وہاں ہیٹر پر چائے کا پانی ابل رہا تھا۔ سلطان نے اپنی حاضری لگائی، وہاں موجود ساتھی سے آدھ گھنٹہ کی چھٹی لی اور باہر نکل کر چل پڑے۔ اب ہم مسجد الحرام کے نیچے ائر کنڈیشنگ کنٹرول روم کے پاس آ گئے تھے یہاں سے پورے حرم کا نظام کنٹرول کیا جا رہا تھا اور زم زم کو بڑے بڑے کئی ڈرموں میں سٹور کیا جا رہا تھا۔ یہاں سے بالکل تازہ زم زم پینے کا شرف حاصل ہوا۔ جسے ٹھنڈا کرنے کے لئے مشینوں کی طرف نہیں بھیجا گیا تھا۔ جیسے زمین سے باہر آیا میں نے پی لیا۔

ہم صفا مروہ کے نیچے پھرتے اور چہل قدمی کرتے رہے۔ کئی ایسی جگہوں تک گئے جہاں صرف متعلقہ عملہ مخصوص وردی میں جا سکتا ہے، حرم کو گیارہ ہزار وولٹ الیکٹرک سپلائی اور اس کا کنٹرول بھی یہیں ہے۔ اتنے طاقتور اوور فلو (پنکھے) لگے ہوئے ہیں کہ اکیلے آدمی کا جانا خطرناک ہے۔ کسی خرابی کی صورت میں چار آدمی اکٹھے ایک بیلٹ باندھ کر چلتے ہیں۔ دیو ہیکل بڑے پائپوں کا جال ہے جو دائیں بائیں جا رہے ہیں۔ اس وجہ سے کئی مقامات پر مینڈک کی طرح جھک کر جانا پڑا بلکہ ہتھیلیوں کی مدد لینا پڑی۔ مجھے سلطان نے کہا تھا کہ وہاں جانا خطرناک اور خلافِ قاعدہ ہے لیکن میں نے اس کی کوئی وضاحت اور بات سنی نہ ماننے کو تیار ہوا تھا۔ ہم کئی کاریگروں سے ملے، گپ شپ لگاتے رہے وہ میرے علاقہ، مصروفیات اور فصلوں کے بارے پوچھتے رہے۔ رستے میں روشنی کم ہونے کی وجہ سے اندھیرا بھی تھا۔ سلطان نے بتایا کہ یہاں صرف پاکستانی کاریگر کام کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، دوسرے کئی ممالک کے لوگ اتنی گہرائی اور پُر پیچ راستوں اور مشینوں کی موجودگی کے ساتھ شور میں کام کرنے سے گھبراتے ہیں۔ کئی چھوٹی بڑی سیڑھیاں آئیں، کبھی نیچے اور کبھی اوپر کا سفر جاری رہا۔ یہاں یوں لگتا ہے

جیسے کئی ملوں کے بڑے ڈرموں اور پائپوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ جگہ جگہ بڑے سائز کے کنٹرول وال، فائر سیکشن اور دوسرے کئی آلات کو چلانے کے لئے خودکار آلات فٹ ہیں۔ کہیں کسی خرابی کی صورت میں کنٹرول روم سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ آلات پر نمبر لگائے گئے ہیں یوں منٹوں میں خرابی کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

سلطان نے بتایا کہ تم غیر متعلقہ افراد میں شاید واحد آدمی ہو جس نے ان حساس مقامات کا وزٹ کیا ہے۔ اس کے لئے اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور ہم واپسی راستے سے باہر آ گئے، تھکاوٹ کی وجہ سے ہوٹل پر آیا اور خاموشی سے سو گیا۔ حالانکہ زم زم کا اصلی کنواں دیکھنے کی جس کی شاید ہی کسی پاکستانی نے زیارت کی ہو، خوشی بھی رکاوٹ نہ بن سکی۔ جاگنے کے بعد دوسرے ساتھیوں کو بتایا تو وہ بھی میری خوش قسمتی کے قائل ہو گئے کیونکہ حاجی صاحبان زم زم پلاسٹک کین میں بھرتے ہیں وہاں سے پیتے ہیں لیکن اس تہہ خانہ تک رسائی ناممکن بات ہے اور سچی بات ہے کہ میں نے تو بیسیوں بار زم زم سے وضو بھی کیا ہے۔ میں تو اسے بھی اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں۔ شاید کوئی اسے زم زم کا ضیاع اور بے حرمتی جانے لیکن مجھے جب بھی موقع ملا، فائدہ اٹھا لیتا ہوں اور مسجد الحرام کی چھت پر یہ سہولت میسر کی گئی ہے اور یہ ٹونٹیاں اور بیسن خصوصی طور پر اسی مقصد کے لئے ڈیزائن کئے گئے ہیں اس لئے یہاں کوئی ممانعت بھی نہیں ہے۔

جبلِ ابوقبیس

ہمارے ساتھی کسی سے جبل ابوقبیس کا ذکر سن آئے تھے، مجھ سے ذکر کیا اور دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں انہیں زیارت کے لئے لے کر چل پڑا۔ یہ مقدس پہاڑ بیت اللہ شریف کے بالکل سامنے جنوب کی طرف کوہِ صفا کے قریب واقع ہے۔ سعی کی جگہ کی توسیع کی وجہ سے زیادہ نزدیک ہو گیا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا پہاڑ ہے جو زمین پر اتارا گیا، ہجر اسود جیسا مقدس پتھر اسی پر نازل ہوا، ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہاڑ پر جلوہ افروز ہو کر چاند کے دو ٹکڑے فرمائے۔ مکہ مکرمہ والے اس پہاڑ پر کھڑے ہو کر چاند دیکھا کرتے تھے۔ اہل مکہ قحط سالی کے موقع پر یہاں دعا مانگا کرتے۔ مسجد بلال بھی اسی پہاڑ پر واقع تھی جو اب شہید کر دی گئی ہے۔ اس پر کئی عمارتیں تعمیر کر دی گئی ہیں جو شاہی خاندان کی ملکیت ہیں۔ سکیورٹی رسک کی وجہ سے اب عام پبلک کی آمد و رفت نہیں ہے اس لئے نیچے کھڑے ہو کر اسے چھو لیا۔ سب ساتھی اتنا مقدس ہونے کی وجہ سے بڑی حسرت سے دیکھ کر اور دعا مانگ کر واپس آ گئے۔

مکہ ٹاور

سعودی عرب والوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر عمارتیں، سڑکیں اور سرنگیں یوں بنائی ہیں جیسے پہاڑ ریت کے ٹیلے تھے۔ ان کا جب اور جہاں جی چاہا، پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیا۔ باب عبدالعزیز کے سامنے دو اڑھائی سو گز کی دوری پر اونچے پہاڑ پر شریف مکہ کا تاریخی قلعہ تھا، یہ وسیع رقبہ پر روایتی طرز تعمیر کا حامل تھا۔ اب اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس پہاڑ کو توڑنے اور ملبہ اٹھانے کے لئے لگتا ہے جنوں سے مدد لی گئی اور دن بدن پہاڑ گھٹتا گیا یہاں تک کہ اس کی جڑیں بھی کھود کر نکال لی گئیں۔ میرا بھی سال میں ایک چکر لگتا رہا اور یہاں کے بدلتے مناظر آنکھوں کے راستے ذہن میں قید ہوتے رہے۔ پھر یہاں جو آسمان کی بلندیوں کو چھوتی عمارت وجود میں

آئی جسے مکہ ٹاور کا نام دیا گیا، اس کی بنیاد کئی کنالوں پر رکھی گئی اور نوے کے قریب منزلیں ہیں۔ اس پر جو کلاک نصب کیا گیا ہے وہ تقریباً بیس منزلوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک پاکستانی نے بتایا کہ ایک سوئی کو کئی ٹائروں والا ٹرالر اٹھا کر لایا تھا۔ سوئی کی لمبائی پچیس میٹر کے قریب ہے۔ میں عصر کے بعد حرم پاک کی آخری چھت جسے آپ اوپن کہہ سکتے ہیں، پر چلا جاتا، مغرب اور عشاء کی نماز اوپر پڑھتا، زم زم سے وضو کرتا اور کبھی کسی مقام پر کھجور اور قہوہ بھی مل جاتا تھا، یوں موج ہی موج تھی۔ یہاں سے مکہ ٹاور کو دیکھنے کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔ اس کے گراؤنڈ فلور پر سینکڑوں مختلف دکانیں ہیں، سیکنڈ فلور پر بھی دکانیں اور سر منڈوانے (صالون) کی سہولت ہے پھر ہمیں سیر اور ونڈو شاپنگ کا موقع مل جاتا ہے۔ مکہ المکرمہ سے باہر کئی کلومیٹر سے اس کلاک سے چاروں اطراف سے ٹائم بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس جیسا چوڑائی میں اور اونچا پلازہ مکہ المکرمہ، مدینہ المنورہ اور جدہ میں یقینی نہیں ہے۔ شاید یہ سعودی عرب کی اونچی ترین عمارت ہو۔ آپ حج یا عمرہ کے لئے جائیں اور جس راستے سے مکہ المکرمہ میں داخل ہوں یہ بلڈنگ دور سے ہی آپ کا استقبال کرے گی۔ باب عبدالعزیز سے نکل کر مرکزی دروازہ سے داخل ہوں یا کبوتر چوک کی طرف جانے والی دائیں ہاتھ کی ذیلی سڑک سے جائیں۔ مکہ ٹاور کے گراؤنڈ فلور الگ الگ اور اوپر نیچے ہیں۔ زمین کی کھدائی سے لے کر مختلف مرحلوں میں چند سال میں مکمل ہونے والی تعمیر کے مختلف ادوار کو میں نے مرحلہ وار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آپ جب اس بلڈنگ کو دیکھیں تو جن محنت کشوں نے محنت، جذبے، ہمت اور بہادری سے اتنی بلندی پر اپنے پیٹ پالنے اور بچوں کے روشن مستقبل کے لئے پسینہ بہا کر کام کیا ہر خطرہ اور حادثہ کو ذہن میں جگہ نہ دی۔ ایک بار ان کی عظمت کو دل ہی دل میں سلام ضرور کیجئے۔

خانہ کعبہ کے شمال میں ''حطیم'' ہے، یہ خانہ کعبہ کا حصہ ہے۔ شروع میں کسی وجہ سے یہ جگہ تعمیر ہونے سے رہ گئی، اب یہ حاجیوں کے لئے کسی تحفہ سے کم نہیں ہے۔ اگر مسجدالحرام میں عام مسجدوں کی نسبت ایک لاکھ گنا زیادہ نماز پڑھنے کا ثواب ہے تو حطیم میں نماز پڑھنا خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے برابر ہے لیکن یہاں صرف نفل نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ یہاں مجھے بیسیوں بار نفل پڑھنے اور خانہ کعبہ سے لپٹنے، سینہ اور چہرہ رگڑنے کا موقعہ ملا ہے۔ حطیم کے اوپر ''میزاب رحمت''، یعنی خانہ کعبہ کا پرنالہ ہے جو مکمل طور پر سونے کا بنا ہے۔ حرم پاک میں نصب زم زم کی ٹونٹیوں سے جی بھر کر پیا اور جسم کے مختلف حصوں پر شفا کے لئے لگایا ہے کیونکہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ زم زم جس مقصد کے لئے پیا جائے، اسی میں فائدہ دیتا ہے۔ حطیم میں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے بلکہ جنگ کا منظر ہوتا ہے۔ آرام اور صبر سے جگہ نکل آتی ہے لیکن خیال رہے کہ دو نفل کی ادائیگی کے بعد دوسرے بھائیوں کے لئے جگہ خالی کر دینا چاہئے اور غلاف کعبہ سے زیادہ دیر تک لپٹے رہنے اور دھاگے توڑنے سے بچنا چاہئے۔ یہاں مرد عورت ایک ساتھ عبادت کرتے ہیں، جگہ تنگ ہے اس لئے عورتوں کا احترام لازمی کرنا چاہئے ورنہ عبادت کی بجائے گناہ کا احتمال بڑھ جائے گا۔

مسجد تنعیم

میں نے سب ساتھیوں کو تفصیلاً بتایا تھا کہ یہاں رہتے ہوئے تہجد کے علاوہ نماز باجماعت کا اہتمام ضروری ہے۔ جیسے صحت اجازت دے اور وقت ملے،

طواف کرو کیونکہ طواف کرنے کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ اب سب ساتھیوں کا ارادہ تھا کہ مسجد تنعیم سے عمرہ کیا جائے۔ میں نے اس مسجد سے کئی بار عمرہ کی نیت کی تھی لیکن تمام ساتھیوں کو یہ مسجد دیکھنے کی خواہش تھی۔ ناشتہ کے بعد سرکاری گاڑی میں روانہ ہوئے، یہ آرام دہ تو نہیں ہوتی لیکن کرایہ مناسب ہوتا ہے۔ نزدیک ہونے کی وجہ سے عمرہ کرنے والوں کا رش رہتا ہے۔ اس مسجد کا پرانا نام مسجد عائشہ ہے، اسی مقام سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمان بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ یوں مکہ میں مقیم حاجیوں کے لئے آسانی پیدا ہو گئی۔ دور جدید میں نہایت کشادہ اور خوبصورتی میں بے مثال مسجد تعمیر کی گئی ہے، غسل اور وضو کے لئے مختلف اطراف میں بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ مسجد چاروں طرف سے درختوں اور باغیچوں میں گھری ہوئی ہے۔ قریب سے کشادہ مدینہ المنورہ کی سڑک گزر رہی ہے۔ مسجد مکمل ائرکنڈیشنڈ ہے، چھت سے گول دائرہ کی شکل والی لائٹس لگی ہوئی ہیں، کھڑکیوں میں رنگ برنگے شیشے لگے ہیں۔ چھت کے درمیان میں اونچا گنبد ہے، فرش پر قیمتی دبیز قالین بچھایا گیا ہے۔ مسجد ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ ہم ''اے اللہ، ہمارے لئے رحمت کے دروازے کھول دے'' پڑھتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔ دو نفل تحیۃ المسجد کے بعد دو نفل احرام عمرہ پڑھے، سلام پھیرنے کے بعد عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ پڑھتے ہوئے مسجد سے باہر آ گئے، ہر چیز پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حرم میں رش بڑھ گیا تھا۔ طواف اور سعی مکمل ہوئی تو ہم پسینہ میں نہا چکے تھے۔ برآمدہ میں بیٹھ کر کچھ دیر ستائے اور پھر مکان پر آ گئے۔

جبل رحمت

اب ترکی اور حبشی حجاج کی تعداد بڑھ گئی ہے، یہ ہٹ دھرم اور ناک کی سیدھ میں گروپ کی شکل میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہیں، خود سامنے سے ہٹ جائیں وگرنہ دھکا لگنا ضروری ہے۔ یوں کمزور، ضعیف اور عورتیں درمیان میں پھنس جائیں تو گر کر کچلے جانے یا پاؤں زخمی ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے ہم نے آبادی سے باہر کی زیارات کا پروگرام طے کر لیا۔ ہم نے کوچ کرایہ پر حاصل کی اور پہلی منزل ''جبل رحمت'' جا پہنچے۔ حج کا سیزن ہونے کی وجہ سے یہاں بھی زائرین کا رش تھا، اس لئے کوچ ڈرائیور نے ذرا فاصلے پر اتار کر آگے جانے سے معذرت کر لی۔ پورے میدان میں سجے سجائے بے شمار اونٹ، چھوٹے قد کے گھوڑے اور چار موٹے ٹائروں والے موٹر سائیکل موجود تھے۔ چھوٹے بڑے ان پر سوار ہو کر یا ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو بنوا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹیں اور خوشیوں کے کئی رنگ تھے۔ ایک جشن کا سماں تھا۔ عبادت کا مقام کاروباری شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہمارے دیہی اور ریگستانی علاقوں میں اونٹ بکثرت پائے جاتے ہیں، اس لئے ہم اس تماشے کے قریب سے گزر کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں بھیک مانگنے والوں کا قبضہ رہتا ہے جو اوپر جانے والوں کے کپڑے تک پکڑ لیتے ہیں اور یہ نوے فیصد پاکستانی ہوتے ہیں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد جوان عورتوں کی ہوتی ہے، کئی ایک دودھ پیتے بچے اٹھائے ہوتی ہیں۔ ایک عورت نے میرا دامن پکڑ لیا، میں نے کہا کہ جب حج پر آئے ہو تو جو زر مبادلہ ملا ہے وہ کدھر ہے۔ بڑی ادا سے کہنے لگی کہ میں تو عمرہ پر آئی تھی لیکن واپس نہیں گئی، پولیس سے چھپ کر رہتی ہوں۔ میرے

ہاتھ میں انگوروں کا شاپر تھا، یقین کریں اس نے وہ پکڑ کر کہا کہ چلو ریال نہیں دیتے تو کچھ انگور دیتے جاؤ، وہ مسکرا بھی رہی تھی۔ میں نے کہا کہ کم از کم مانگنے والا منہ تو بنالو۔ کتنے شرم کی بات ہے دوسرے ممالک کے لوگ بھی بھیک مانگتے ہیں لیکن وہ کٹی ہوئی ٹانگ یا مڑا تڑا بازو آگے کرتے ہیں اور چہرے پر مسکینی اور سنجیدگی ہوتی ہے۔ ان کے قریب سے گزرنے والے حجاج خود ریال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے پاکستان کو بدنام کیا ہے۔ ہمارے ایسے کرتوتوں کی وجہ سے ہمیں قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے جس کے ذمہ دار یہ چند لوگ ہیں جو ذاتی مفاد کے لئے پوری قوم کے منہ پر کالک مل رہے ہیں۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر محراب آدم ہے، اس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی، اس لئے جبل رحمت کہلایا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہاڑ کے قریب ایک پتھر پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اس کی زمین سے اونچائی تین سو فٹ ہے، زمین سے لے کر چوٹی تک کنکریٹ کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے اوپر جانے میں آسانی رہتی ہے۔ محراب آدم کے چاروں طرف مختلف اشیاء بیچنے والوں کا قبضہ رہتا ہے۔ نفل پڑھنے کے لئے بڑی مشکل سے جگہ نکالی، دعا مانگ کر بھیک مانگنے والوں سے بچتے ہوئے کوچ تک آئے، جب سب ساتھی اکٹھے ہو گئے تو اگلے پڑاؤ کی طرف چل دیئے۔

نہر زبیدہ

ملکہ زبیدہ شام سے حج کرنے آئیں تو دیکھا کہ حجاج اور اہلِ مکہ کو پانی کی تکلیف ہے۔ اس نے واپس جا کر اپنے کاریگروں اور انجینئر کو بلایا یوں پچیس کلومیٹر لمبی نہر کھدوائی اس کا پانی وادی نعمان اور طائف کے چشموں سے حاصل کیا گیا۔ پہاڑیوں کو کاٹ کر تین سال میں مکمل کیا گیا اور ملکہ کے ستر لاکھ طلائی دینار خرچ ہوئے لیکن وہ ہارون رشید کی بیوی تھی اسے کیا پروا تھی۔ دجلہ کے کنارے محل میں ملکہ کو اخراجات کے کاغذات دیئے گئے تو ملکہ نے بغیر دیکھے کاغذات دریا میں ڈال دیئے اور کہا کہ ہم نے حساب کو حساب کے دن کے لئے چھوڑ دیا۔ اس تاریخی نہر کی دیواریں میدان عرفات میں دیکھی جا سکتی ہیں اور ملکہ کے جذبہ ایثار اور کاریگروں کی محنت کو سلام کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس نہر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے میدان عرفات کی ''مسجد نمرہ'' کو باہر سے دیکھتے ہوئے مزدلفہ کی ''مسجد مشعرالحرام'' کی زیارت کرتے وادی محسر کے قریب سے گزرے جہاں ابابیل نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو کنکریوں سے بھوسے کے ڈھیر کی طرح بنا دیا تھا۔ یہ عذاب کی جگہ ہے، تیزی سے آگے نکل آئے۔ منا میں خیموں کا بسا شہر دیکھا اور ''مسجد خیف'' کی باہر کھڑے ہو کر زیارت کی کیونکہ یہ مسجدیں حج کے دنوں میں کھلتی ہیں لیکن ان پانچ دنوں میں رش کی وجہ سے اندر داخل نہیں ہوا جا سکتا۔ واپسی راستے میں منا کے قریب ''مسجد عقبہ'' ہے۔ سڑک سے ہٹ کر بائیں جانب پہاڑ کے دامن میں ایک کمرہ پر مشتمل تاریخی مسجد ہے، اس مقام پر ہجرت سے پہلے انصار مدینہ کی بارہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے نبی کریم اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ دیواریں پختہ ہیں اور چاروں طرف آہنی جنگلہ لگایا گیا ہے لیکن ہم نے کوچ ڈرائیور کی نشاندہی اور مہربانی سے تسلی سے زیارت کی۔ اب ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور ہوٹل آ گئے۔

جبل نور، غار حرا

جبل نور کے دامن میں کھڑے ہو کر کئی بار دعا مانگی اور واپس آ گئے، یہ کئی سال کا معمول تھا۔ اب میں

نے ہمت باندھی اور خاموشی سے فجر کی نماز کے بعد سرکاری بسوں کے اڈہ پر آ گیا، ایک بس کے سامنے جبل نور لکھا دیکھا تو ٹکٹ خرید کر سیٹ پر بیٹھ گیا، سرکاری بسوں کے ڈرائیور اپنی مرضی سے چلتے ہیں راستے میں دیر تو لگ گئی لیکن موسم خوشگوار تھا۔ آخر مخصوص سٹاپ پر اتر گیا اور سنگل سڑک پر چلنا شروع ہو گیا۔ چڑھائی تو معمولی تھی لیکن سانس پھولنے لگا تو قریب کی دکان سے چائے کا گلاس اور فل سائز کیک پیس خرید لیا اور نئے عزم سے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ چڑھائی شروع ہو گئی تھی لیکن چائے نے بڑا حوصلہ دیا، قدم روک کر گھونٹ بھرتا اور اللہ کا نام لے کر چلنا شروع دیتا۔ اب سڑک کی سہولت ختم ہو گئی اور پتھریلا راستہ شروع ہو گیا تھا جو چلنے کے لئے مشکل تھا۔ گول پتھر پاؤں کے نیچے سے پھسلتے تو لڑکھڑا جاتا۔ کئی کمزور مرد اور عورتیں بھی بہادری سے چڑھائی اور مشکل سفر پر گامزن تھیں۔ یوں میں بھی خود کو ہمت دلاتا، جب سانس پھول جاتا تو رک جاتا۔ ایک چھوٹے قد کی جھاڑی کے سائے میں دو پٹھان بیٹھے بے فکری سے گپ شپ میں مصروف تھے، میں ان کے ساتھ کافی دیر بیٹھا رہا۔ چلتے ہوئے پھسلتا تو قریب سے گزرنے والے پکڑ کر سہارا اور حوصلہ دیتے۔ ایک بار ایرانی عورت نے اٹھنے میں مدد کی وہ خود کافی صحت مند تھی، مسکرا کر جوس کا ڈبہ بھی پیش کیا جو میں نے شکریہ کہہ کر لے لیا۔ ایک بزرگ سے پانی مانگا تو اس نے پوری بوتل پکڑا دی، یوں پانی پی کر تازہ دم ہو گیا اور توانائی بحال ہو گئی۔ ایک چھپر ہوٹل میں کچھ دیر ستا لیا۔

آخر ایک گھنٹے کی چڑھائی کے بعد میں غار حرا کے سامنے پہنچ گیا، یہ وہ مقدس غار ہے جو تاریخ اسلام میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ہدایت الٰہی کا نور یہیں سے ساری کائنات میں پھیلا اور جس کے انوار سے تاریکیاں دور ہو گئیں۔ کائنات کے سربستہ راز اسی غار میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف ہوئے۔ یہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت پر فائز ہوئے۔ آپؐ جب عمر عزیز کے اکتالیسویں برس میں داخل ہوئے تو تنہائی پسند ہو گئے۔ آپ کا زیادہ تر وقت غار حرا میں یاد الٰہی اور غور و فکر میں گزرتا اور کئی کئی شب غار حرا میں رہ کر عبادت کرتے۔ یہیں ماہ مبارک کی مقدس رات کو قرآن کریم کی ابتدائی آیات وحی کے ذریعے آپؐ کے قلب اطہر پر نازل ہوئیں، اب وہی آیات غار حرا کے دہانے پر لکھی گئی ہیں۔ غار حرا کیونکہ تنگ ہے، اس لئے بڑی مشکل سے نفل پڑھنے کے لئے جگہ بنائی۔ دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو مسجد الحرام کے مینار اور دوسری کئی بلند عمارات بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ منظر بھی دل کو لبھانے اور دھڑکنیں تیز کرنے والا تھا۔ اللہ کی شان کہ ایک وقت میں کتنے اعزازات اور روح پرور نظارے آنکھوں کے سامنے تھے یقین جانئے کہ ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ واپسی کا سفر تو بالکل آسان ثابت ہوا اور بہت کم وقت میں نیچے اتر آیا، سٹاپ سے بس میں بیٹھ کر واپس آ گیا۔ ظہر کا وقت قریب تھا اس لئے ہوٹل جانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ جب کمرے میں اکٹھے ہوئے تو بیگم اور خالہ نے ڈھیروں مبارک باد دی کیونکہ میں زیادہ مشقت کا عادی نہ تھا اس لئے میرے لئے یہ زیارت کرنا کسی کارنامہ سے کم نہ تھا۔

غارِ ثور

جن ساتھیوں نے میرے غار حرا تک جانے کا سنا تو جو جوان العمر تھے انہوں نے غار ثور تک جانے کا ارادہ ظاہر کیا خود میں بھی دل میں ارادہ رکھتا تھا۔ یوں ہم نے ایک دن چھوٹی کوچ کرایہ پر حاصل کی، بھاری

ناشتہ کے بعد عازم سفر ہوئے۔ سڑک کے اطراف میں قطار در قطار مختلف قد اور نسل کے درخت لگائے گئے ہیں جنہیں روزانہ کی بنیاد پر پانی لگایا جاتا ہے۔ سڑک کے دائیں طرف زم زم کے ذخیرہ کو سڑک کے ذریعے مدینہ المنورہ بھیجنے کے لئے موٹریں لگائی گئی ہیں اور ہیوی انجن اور غیر معمولی لمبائی رکھنے والے ٹرالر لوڈ کر کے لے جاتے ہیں۔ کئی پہاڑی موڑ کاٹنے کے بعد کوچ نے ہمیں پہاڑ کے دامن میں اتار دیا۔ وہاں ایک چوڑا تھڑا بنا ہوا تھا جہاں سائے کا انتظام بھی تھا، یہ آبادی سے پانچ کلو میٹر کی دوری پر ہے۔ حیرت انگیز طور پر ایک مرغی کئی چوزوں کے ساتھ مٹرگشت کر رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر مرغ بڑے نخرے اور اکڑے انداز میں ساتھ چل راہ تھا جیسے بطور گارڈ ڈیوٹی دے رہا ہو۔ یہ دیسی نسل، پروں سے بھرے جسم والی نسل تھی اور اس ماحول میں کسی عجوبہ سے کم نہ تھی۔ وہاں موجود سب حجاج انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ اب ہم نے اوپر جانے کے لئے پہاڑی راستے پر قدم رکھ دیئے تھے۔ یہ چڑھائی ترچھی اور آسان ضرور ہے لیکن فاصلہ اندازاً پینتیس سو فٹ ہے زمین سے غار ثور کی سیدھی اونچائی پچیس سو پچاس فٹ ہے جو کنفرم ہے۔

ہمیں کوئی جلدی نہ تھی ہمکمزور، عمر رسیدہ مردوں اور عورتوں کو ہوٹل پر چھوڑ آئے تھے اس لئے بے فکری سے احتیاط کے ساتھ فاصلہ طے کرتے رہے۔ مجھے خوشاب سے عمرہ کے قافلے لے جانے والے حاجی علی اکبر مل گئے، میں نے ایک بار بیوی اور بیٹی کے ساتھ ان کی سربراہی میں پورے ایک ماہ کے لئے عمرہ کا سفر کیا تھا۔ وہ بڑی عزت سے ملے اور کہنے لگے کہ فکر نہ کرو، اگلا راستہ اکٹھے طے کریں گے۔ یوں ہم ایک ساتھ چلتے، حال احوال پوچھتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے چلتے رہے۔ تقریباً تمام ساتھی آگے نکل گئے تھے، ہم راستہ میں ایک ہوٹل پر بیٹھ گئے اور چائے پی اور سانس لینے کی رفتار بھی اعتدال پر آ گئی۔ ایک دو جگہ سیدھی اوپر چڑھائی جسے ہم اطراف کی ڈھلان کے کنارے پکڑ کر اوپر چڑھ گئے۔ جب ہم غار ثور کے دہانے پر پہنچے تو حجاج کرام زیارت اور نفل کی ادائیگی سے فارغ ہو کر واپس اتر رہے تھے۔ یہ غار تیرہ فٹ لمبا اور تقریباً پانچ فٹ چوڑا ہے۔ اس مقدس غار میں ہجرت کی رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمراہی میں آرام فرمایا اور تین دن تک قیام رہا۔ اس غار کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ غار ثور کے سامنے ذرا نیچے کی طرف ایک بڑا پتھر پہاڑی سائبان کی شکل کا بنا ہوا ہے، قیاس ہے کہ جیسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو غار سے باہر آ کر اس جگہ تشریف رکھتے ہوں۔ اب وہاں جانے والوں نے اندر جانے کا راستہ پچھلی طرف سے بنا لیا ہے اور منہ کی طرف سے آدمی باہر نکل آتا ہے۔

آپ یقین کریں جب میں غار میں داخل ہوا تو میرا شراکت دار کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے بڑی تسلی سے جگہ بدل بدل کر نفل ادا کئے، اس کے بعد غار کی دیواروں، چھت اور فرش پر سینہ جسم اور جہاں تک ممکن ہو سکا چہرہ ملتا رہا اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مشقت سے اوپر چڑھنا اپنی جگہ لیکن یہ کتنے اعزاز کی بات تھی کہ اس مقدس مقام پر میں موجود تھا، مکمل تسلی سے ہر کونہ، دیواریں اور دہانہ دیکھ لینے کے بعد باہر نکلا تو پھڑ پھڑاتے کبوتروں نے استقبال کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسی نسل کے ہیں جنہوں نے آج سے چودہ سو سال پہلے غار کے منہ پر گھونسلہ بنایا تھا اور کافر اس غلط فہمی کا شکار ہو کر واپس چلے گئے تھے کہ یہاں کوئی ذی روح کیسے موجود ہو سکتا ہے۔ اسی نسبت اور عقیدت سے حجاج انہیں اس مقدار میں گندم ڈالتے ہیں کہ بلد یہ

کے ملازم اکٹھی کر کے گٹھ بھر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی کافی ضائع ہو جاتی ہے۔ میں علی اکبر صاحب سے بھی بچھڑ چکا تھا، اکیلے ہی واپس کا سفر کرنا پڑا۔ جب نیچے پہنچا تو صرف میرا ہی انتظار ہو رہا تھا، یوں خوشی سے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے ہوئے ہوٹل واپس آ گئے۔

حج کے دن قریب آنے کی وجہ سے جگہ تنگ پڑتی جا رہی تھی۔ اب ہم سڑکوں، بسوں کے اڈے پر اور دکانوں کے تھڑوں پر بھی صفیں بنانے لگے تھے۔ آخری جمعہ اتنی دور اور اس حالت میں پڑھا کہ امام کعبہ کی آواز بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی حالانکہ گلی، بازاروں میں دور دور تک طاقتور سپیکر نصب کر دیئے گئے تھے اور قریب کی مسجدوں کو بھی حرم کے ساتھ منسلک کر دیا گیا لیکن ایک ہی وقت میں لاکھوں حجاج اکٹھے ہو گئے تھے اور مدینہ المنورہ سے تمام حجاج یہاں آ چکے تھے۔ مسجد الحرام کے اطراف میں کھلے صحن میں پانی پھینکنے والے اوور فلو (پنکھے) رات دن چلتے رہتے تھے، اس سے سانس لینے میں آسانی اور ہوا میں نمی شامل ہونے کی وجہ سے گرمی اور خشکی میں کمی آتی ہے۔ ہم آگے نماز پڑھنے والے حجاج کی دیکھا دیکھی رکوع و سجود کرتے اور اندازے سے سلام پھیر لیتے۔ اللہ ہماری نیتیں جانتا اور دیکھتا ہے، وہ ہماری لولی لنگڑی نمازیں اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مانگی گئی دعائیں قبول کرے گا۔ یہ سارا سلسلہ اسی امید پر چل رہا ہے۔

روانگی حج

حج اسلام کا ایک اہم رکن ہے اور اللہ کی عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس میں مالی، جسمانی اور روحانی عبادات شامل ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو رب العزت نے استطاعت دی اور حج جیسے سفر کے لئے چن لیا۔ کیونکہ اگر حلال رقم سے اور سنت طریقہ کے مطابق یہ فریضہ ادا کیا جائے تو اس کے بعد حاجی نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ آج ہم بھی ایسے خوش قسمت لوگوں میں شامل ہو گئے تھے کہ آج ہمارے ہوٹل کے ریسپشن ہال میں نوٹس آویزاں کر دیا گیا کہ تمام حجاج آٹھ ذوالحجہ کی رات کو منا روانگی کے لئے تیار رہیں۔ شاید بھیڑ سے بچنے کے لئے رات کو روانگی کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ہم نے ضروری سامان کا اکٹھا ایک بیگ تیار کر لیا۔ عشاء کے بعد تمام ساتھیوں کو ایک کمرے میں اکٹھا کر کے حج کے پانچ دنوں کی مصروفیات سے آگاہ کیا۔ نفل، سنت اور فرائض کی ادائیگی کی مکمل تربیت دی، سوال و جوبات کے بعد اور ذہنی طور پر تیار کر کے سب کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ جو حجاج بیرون ممالک سے آتے ہیں انہیں طے شدہ مقامات تک لے جانا، ٹھہرانا اور بسیں فراہم کرنا معلم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ دیر سویر ہو جانا الگ بات ہے۔ رات تین بجے دروازہ کھٹکھٹا کر بسیں آنے کی اطلاع دی گئی۔ نہا کر احرام باندھ لیا، دو نفل احرام حج پڑھنے کے بعد نیت کر لی۔ ''اے اللہ! میں حج کا ارادہ کرتا ہوں، تُو اسے آسان کر اور مجھ سے قبول فرما''۔

تلبیہ پڑھتے ہوئے اپنے گروپ کی بس تلاش کر کے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے پہلے بغیر کسی تکلیف یا رکاوٹ کے اپنے کتب کے سامنے اُتر چکے تھے۔ اس لحاظ سے رات کو سفر کا فیصلہ ٹھیک رہا۔ فجر کی نماز کے بعد سونے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا، ہمارا خیمہ گیٹ کے دائیں طرف قریب تھا، کہیں بھی آنے جانے میں سہولت تھی۔ میرے سر میں صبح سے ہلکا درد تھا، بیگم صاحبہ نے بتایا کہ قریب ہی سعودی ہسپتال ہے، ہم وہاں سے زکام، جسم درد اور بخار کی دوائی لے آئی ہیں۔ میں عوتوں کی پھرتی پر حیران رہ گیا۔ میں بھی کتب کے

پیچھے گیا تو ہسپتال کا بورڈ نظر آ گیا۔ پرچی بنوائی اور ڈاکٹر کو کئی امراض کا بتا کر شربت اور گولیاں لے لیں تاکہ بعد میں اپنے اور ساتھیوں کے کام آتی رہیں گی۔ ہم تو ہر مقام پر ایسا چکر چلا کر ڈبل بلکہ ٹرپل تعداد میں سامان لے آتے ہیں۔

منیٰ ایک چھوٹا شہر ہے جو چاروں طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، صرف حج کے دنوں میں آباد ہوتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے یہاں نیم کے درخت لگوائے تھے جو کوشش اور پانی لگانے کے باوجود تسلی بخش انداز میں بڑھ نہیں پا رہے، شاید پتھریلی زمین ہونے کی وجہ سے ان کی جڑوں کو مناسب طریقہ سے پھلنے پھولنے کو جگہ نہیں مل رہی۔ سڑکیں پکی ہیں، پہلے خیمے عام کپڑے کے ہوتے تھے جنہیں آسانی سے آگ لگ جاتی تھی لیکن اب خیموں کو فائر پروف اور ائرکنڈیشنڈ کر دیا گیا ہے۔ پانی اور بجلی ہر وقت دستیاب ہے، جگہ جگہ معقول تعداد میں بیت الخلا اور وضو خانے تعمیر کئے گئے ہیں۔ حجۃ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں، پھر عرفات کو روانہ ہو گئے تھے۔ منیٰ میں جس مقام پر آپ کا خیمہ تھا وہاں اب مسجد خیف ہے۔

میدان عرفات

9 ذی الحجہ کی صبح معلم کی فراہم کردہ بسیں ہمیں میدانِ عرفات لے گئیں۔ آج مغفرت کا دن ہے اور یوم عرفہ ہے، حج کا رکن اعظم ہے، اگر کوئی حاجی کسی وجہ سے میدان میں نہ پہنچ سکے تو وہ اس سال حج کی سعادت سے محروم رہ جائے گا۔ یہاں عارضی خیمے لگائے جاتے ہیں، ہر طرف انسانوں کا سمندر ہے جس میں ہم بھی شامل ہیں۔ اب نہ قومیت کی پروا، نہ زبان کا خیال، رنگ کی پروا نہ نسل کا خیال، سب ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سب اللہ کے مہمان ہیں، سب کو اللہ نے بلایا ہے۔ یہاں مسجد نمرہ کے آثار جبل رحمت کے ساتھ موجود ہیں جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کا خطبہ دیا تھا۔ یہاں خیمے الاٹ نہیں ہوتے، ہم نے ایک بڑا خیمہ دیکھ کر ڈیرا ڈال لیا اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔ جبل رحمت یہاں سے صاف دکھائی دیتا ہے اور کالے پتھروں کے باوجود سفید احرام کی وجہ سے سفید نظر آ رہا تھا، دوپہر کا کھانا معلم کی طرف سے تھا، مسجد نمرہ سے دوری کی وجہ سے ظہر اور عصر کی نمازیں اپنے وقت پر خیمے میں ادا کیں، وقوف عرفات کا وقت زوال آفتاب کے وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اب ہم قبلہ

ایک صاحب نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ مقررہ وقت پر مدعو مہمانوں کے ساتھ غیر مدعو طفیلی بھی دعوت میں پہنچ گئے۔ میزبان نے کھانے سے پہلے مہمانوں کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ''خواتین و حضرات! میں حیران ہوں کہ آپ میں سے کس کا شکریہ ادا کروں؟ اُن صاحبان کا جنہیں میں نے بلایا تھا اور وہ تشریف لائے یا اُن حضرات کا جنہوں نے بلائے بغیر آنے کی تکلیف برداشت کی۔

❁

کسی شریر اور بدتمیز لڑکے نے بڑی عمر کے ایک آدمی سے کہا۔ ''چچا! ذرا ٹھہریئے، میری ہتھیلی میں کھجلی ہو رہی ہے، ایک چپت کھاتے جائیے''۔

بڑی عمر کے آدمی نے جواب دیا۔ ''بھتیجے! مجھے ذرا جلدی ہے تم یہ چپت میرے بھائی کو مار دینا''۔

رخ کھڑے ہو گئے، یہ دن اور وقت دعاؤں، مناجاتوں اور توبہ استغفار کی قبولیت کا ہے، آنکھیں بند کیں تو خود بخود الفاظ ہماری زبان سے نکلنے لگے۔

اے اللہ ہماری کوتاہیوں سے درگزر اور برائیوں کی پردہ پوشی فرما۔ اس مبارک سفر میں اور میدانِ عرفات میں تیری دائمی خوشنودی اور رضامندی کے ساتھ ہر قسم کی آسانی اور سہولت کے طلب گار ہیں، ہمیں ہدایت نصیب فرما، ہمارے ظاہر و باطن کی اصلاح فرما تاکہ گمراہیوں سے دور رہیں۔ ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت فرما، اسے اپنی امان میں رکھ اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھ۔ جو لوگ بدامنی اور انتشار پھیلانا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ناپاک ارادوں سے باز رکھ اور ان کے دل میں اپنے ملک کی محبت اور استحکام و بقا کے لئے کام کرنے کا جذبہ پیدا کر۔ تمام دوست احباب اور ملنے والوں کی نیک خواہشات اور جائز حاجات پوری ہونے کی دعا کی۔ کئی دعائیں تھیں جو بے ساختہ زبان سے نکل کر عرفات کی پاک فضاؤں میں شامل ہو گئیں، کئی حجاج آنسو بہا رہے تھے، کئی کی ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اے اللہ ہم نے جتنی دعائیں اس پاک سرزمین پر مانگی ہیں انہیں قبول فرما۔ آمین ثم آمین!''

اب سورج پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپنے کے لئے پر تول رہا تھا، ہم نم آنکھوں اور بجھے دل کے ساتھ خیموں سے باہر نکل آئے اور بسوں کی طرف چل دیئے۔ ایک خوشی تھی کہ حج کا ایک اہم فرض ادا ہو گیا تھا۔ اب بسوں میں سیٹیں صرف عورتوں کے لئے مخصوص کر دی گئیں، ہم کسی نہ کسی طرح ایک بس کی چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ تاحدِ نگاہ بسوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں، بسوں نے حرکت شروع کر دی تھی لیکن رفتار چیونٹی جیسی تھی۔ عرفات کی حدود کو پیچھے چھوڑا تو اب رفتار بھی قدرے بڑھ گئی تھی، آدھی رات کے قریب مزدلفہ کی حدود میں داخل ہوئے تو تھکاوٹ اور نیند کی وجہ سے برا حال تھا۔

مزدلفہ

عرفات کی طرف سے کئی روڈ مزدلفہ سے ملاتے ہیں، منا کی حدود کے قریب جا کر ڈرائیور نے گاڑی روکی، ڈنڈے پکڑ کر، کھڑکیوں میں پاؤں پھنسا کر اور لٹکتے ہوئے کئی کرتب دکھا کر نیچے اترے، کچھ دیر گئے گوڈے سہلاتے رہے، اس سے اچھا تھا کہ میں پیدل ہی آ جاتا اور میں نے یہ دس کلومیٹر کا سفر پیدل طے کیا ہے۔ راستے میں ٹھنڈا پانی، جوس اور بریانی کے پیک ڈبے الگ تھلگ میں ملتے ہیں۔ ہم ساتھی آپس میں بچھڑ چکے تھے، عورتیں کسی دوسری بس کے اندر سوار تھیں، ان کی الگ فکر تھی۔ اب ہم نے مزدلفہ کی حدود میں ایک پہاڑ کے دامن میں ہموار جگہ تلاش کی، ایک ساتھی کہیں سے گتے اکٹھے کر لایا جگہ کو صاف کر کے گتے بچھا کر یہاں ڈیرہ جما لیا۔ حمام تلاش کر کے وضو کیا، پہلے مغرب اور بعد میں نماز عشاء ادا کی۔ عرفات میں معلم کی طرف سے کھانا لینے کی ممانعت نہ تھی، جس سہولت سے ہم نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ مرغ کے بڑے بڑے پیس چاولوں میں شامل تھے، ہم بوٹیاں کھا کر چاول سائیڈ پر رکھ دیتے تھے، اس لئے اب کھانا کھانے کی گنجائش نہ تھی۔ شیطانوں کو مارنے کے لئے کنکریاں اکٹھی کیں اور کچھ وقت آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ مزدلفہ میں مسجد مشعر الحرام اس جگہ واقع ہے جہاں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا۔ پہلے نماز تہجد ادا کی، اذان ہونے تک دعائیں مانگتا اور ذکر اذکار میں وقت گزارا۔ نماز فجر کے بعد وقوف کی نیت کر لی اور تسبیح کے بعد تلبیہ کا ورد کیا۔ جب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تو روانگی کا

ارادہ کر لیا لیکن بسیں غائب تھیں۔ منیٰ میں خیموں کی بستی پل کے پار نظر آ رہی تھی۔ یوں پل کو کراس کیا تو منیٰ کی حدود شروع ہو گئیں، آدھ گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد اپنے خیموں میں پہنچ گئے، ابھی بچھڑے ساتھی نہ آئے تھے تو کمر سیدھی کرنے لیٹ گیا۔ اب ساری عورتیں ہماری بیگم کی قیادت میں اندر داخل ہوئیں تو بے ساختہ میں مسکرا دیا لیکن بیگم صاحبہ بغیر ہماری رہنمائی کے بخیر و عافیت خیمہ تلاش کر کے پہنچ گئی تھی، خوشی میں اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ تمام عورتوں کو لے آنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی داد دینا پڑی۔ وہ اپنے اس کارنامہ پر جتنی مسرور ہوتی، کم تھا کیونکہ کئی حجاج تھکاوٹ کی وجہ سے کئی گھنٹے بعد رضا کاروں اور نقشوں کی مدد سے آ پہنچتے ہیں۔

رمی جمرات

آج دس ذوالحجہ ہے۔ آج سب سے پہلا کام بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا ہے، اب تلبیہ پڑھنا بند ہو جاتا ہے۔ یہاں ذہن صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کے لئے منیٰ کی طرف لے کر چلے تھے تو شیطان انسانی شکل میں بہکانے آیا تھا جہاں ''عقبہ جمرہ'' ہے آپؑ نے فرمان الٰہی کے مطابق سات کنکریاں شیطان کو ماری تھیں اور وہ فرار ہو گیا تھا۔ اسی طرح ''جمرہ وسطیٰ'' اور ''جمرہ اولیٰ'' تک پیچھے آ کر بہکاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے آپؑ نے دونوں جگہ سات سات کنکریاں ماریں تو وہ راستہ سے پلٹ گیا تھا۔ اس واقعہ کی یاد میں بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے چل دیئے۔ دھوپ اور بھیڑ بڑھ گئی تھی، راستے میں فوجی جوان ہدایات دے رہے تھے، میں نے بیگم اور خالہ کو کنٹرول میں لے لیا تھا کیونکہ یہاں جنگ کا منظر نظر آ رہا تھا، ساتھی بچھڑ گئے تھے اور میں نے عورتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کنکریاں ماریں۔ ہم آپس میں بچھڑنے سے تو بچ گئے لیکن عورتوں کا دیکھنے میں یہ حال تھا جیسے تینوں نے آپس میں دھینگا مشتی اور بال نوچنے کا مقابلہ کیا ہو۔ راستے سے ہٹ کر ایک مقام پر سب نے اپنی حالت درست کی، کچھ سانسیں درست کیں اور خیمے میں آئے تو کچھ ساتھی آ چکے تھے۔ ہینک نے ہمیں قربانی کے کوپن دیتے ہوئے جو سر منڈوانے کا وقت بتایا تھا اس کے کچھ دیر بعد ہم نے حلق کرا لیا۔ منیٰ میں ہی جبل ثبیر ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر سات سال تھی، وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں لینے وہاں پہنچ گئے۔ پھر ان کی جگہ اللہ نے مینڈھا بھیج دیا۔ ذبح ہونے والے مینڈھے نے چالیس سال جنت میں چرا تھا، اس کی اون کا رنگ سرخی مائل تھا، وہ عمدہ آنکھوں اور سینگوں والا تھا۔ مسجد کبش اسی پہاڑ پر واقع ہے اور قربان گاہ کی جگہ پہاڑی پر تین فٹ اونچائی میں ستون تعمیر کیا گیا ہے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب ہم احرام اتار کر معمول کے کپڑے پہن کر تمام پابندیوں سے باہر آ گئے تھے۔

طواف زیارت

کچھ ساتھی طواف زیارت کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ ہم دو مرد اور پانچ عوروں یعنی سات افراد پر مشتمل یاہ قافلہ عصر کے وقت حرم پاک پہنچ گیا۔ ہم اندر چلے آئے، طواف کے لئے مطاف میں جگہ مل گئی، میں سب کے آگے تھا، درمیان میں عورتیں اور آخر میں دوسرے حاجی کی ڈیوٹی لگائی یوں ایک دوسرے سے بچھڑنے سے بچ گئے۔ شروع سے ہی بیگم نے میری قمیص کا کونا پکڑا تو آخر تک نہ چھوڑا۔ اللہ کے فضل سے طواف،

نوافل اور سعی مکمل ہو گئی بس درمیان میں مغرب کی نماز ضرور ادا کی تھی۔ میں نے چھوٹی خالہ سے کہا تھا کہ آج وہ ہم سے نہ بچھڑی تو مرغ روسٹ کھائیں گے۔ اب سب نے مجھے وعدہ یاد دلایا تو نکل بھاگنے کا موقع نہ تھا، ایک قریبی ہوٹل پر چلے گئے جو بڑے پلازوں کی بیک سائیڈ پر ہے۔ وہاں رش دیکھ کر پروگرام تبدیل کرنا پڑا کیونکہ زیادہ دیر انتظار کرنا پڑتا اور ہمیں منیٰ جانے کی جلدی تھی، بس مرغ سالن پر گزارا چلانا پڑا۔ مجھے تو اب بھی جیب پر کافی بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب یہ وعدہ کیا تھا لیکن اب صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ اپنے ہاتھ کی کلہاڑی، اپنے پاؤں پر پڑی تھی، بجھے دل سے بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

واپسی کے لئے بڑی ٹیکسی مل گئی، اس نے کرایہ بھی مناسب لیا، یوں سمجھئے کہ بس کے کرایہ میں کار پر سفر کر رہے تھے۔ میں ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گیا۔ آبادی سے نکلے تو میں نے ڈرائیور سے نام پوچھا، اس نے عربی لہجہ میں ولید عبداللہ بتایا۔ ہم آسان انگلش، عربی اور باقی کسر اشاروں سے نکال کر باتیں کرنے لگے۔ ولید نے بتایا کہ اس کی شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں لیکن بچہ نہیں ہے، بیوی پڑھنا لکھنا جانتی ہے۔ ڈیش بورڈ پر بڑے سائز کی دو چابیاں رکھی ہوئی تھیں، اس متعلق پوچھا تو کہنے لگا کہ اس کی بیوی الریاض اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ ولید کی مستقل رہائش جدہ میں تھی، اسے جہاں رات آتی ٹیکسی کی سیٹ سیدھی کر کے سو جاتا۔ وہ میرے ساتھ باتوں سے بڑا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر قہقہہ لگاتا اور کبھی جوش میں اور خوش ہو کر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بھی مارتا تھا۔ ایک جگہ رش کی وجہ سے ٹریفک رکا ہوا تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی سائیڈ پر نیچے رکھا شاپر اٹھایا اور ایک کیلا پیش کیا، میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر پورا شاپر پکڑ لیا اور کئی کیلے پیٹ میں اتار کر باقی کیلے بیگم کو پکڑا دیئے کہ سب مل جل کر کھاؤ۔ وہ کہنے لگی کہ اس بیچارے نے اپنے لئے رکھے ہوں گے، واپس کر دو یوں مناسب بھی نہیں لگتا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ سعودی عرب میں پٹرول پانی سے سستا ہے، اس نے ہم سے اچھا خاصا منافع کمایا ہے، کچھ حق ہمارا بھی بنتا ہے آخر ہم ان کے مہمان ہیں اور سعودی عرب والے سولہ آنے میزبانی کی تعریف پر پورا اترتے ہیں، بے شک گھر جا کر تاریخ کی کتاب میں پڑھ لینا۔ ولید اور بیگم صاحبہ حیرانی سے میرا منہ دیکھ رہے تھے۔ اب ہم اپنے کتب کے قریب آ گئے تھے، سامنے فوجی جوان گاڑیاں روک رہے تھے، ادھر شاہی محل بھی ہیں شاید کوئی شخصیت گزرنے والی تھی، مجبوراً ولید سے جدا ہونا پڑا، ہم اتر کر چل پڑے تو ولید نے مجھے واپس بلایا اور ایک کھجور کا پیکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا، اس کے چہرہ پر حقیقی مسکراہٹ تھی۔ میں نے بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پکڑ لیا جیسے وہ میری امانت واپس کر رہا ہو۔ یوں ولید ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

ظہر کی نماز کے بعد تینوں شیطانوں کو گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مار لیں تو سب ساتھیوں کو حج مکمل ہونے کی مبارک باد دی، ہم نے جس مقصد کے لئے گھر چھوڑا، رقم خرچ کی اور تکلیفیں برداشت کیں وہ آج پورا ہو گیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور خوشی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ آج سے پورے سال کے لئے خیموں کی یہ بستی ویران ہو جائے گی۔ ہمارے کچھ ساتھی جو اکیلے تھے وہ پیدل نکل گئے تھے۔ مکہ المکرمہ یہاں سے پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، میں نے بھی ایک بار یہ سفر پیدل طے کیا تھا جو ڈیڑھ گھنٹے میں پورا ہو گیا تھا لیکن آج عورتوں کے ساتھ کی وجہ سے بس میں آنا پڑا اور منٹوں کا سفر گھنٹوں میں مکمل ہوا۔ ہوٹل آ کر راستے میں

قضا ہو جانے والی نمازیں ادا کیں اور اکٹھے کھانا کھایا۔ آج سب کا موڈ خوشگوار تھا اور بات بہ بات مسکرا رہے تھے۔ ہم نے نفل شکرانہ ادا کئے اور سو گئے۔

اب ہمارے پاس چند دن تھے جو نماز، طوافِ کعبہ اور نفلی عبادات میں گزر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے سعودی عرب کا ہر موسم دیکھ لیا ہے، انتہائی گرمی میں دن گزارے ہیں تو سردیوں کی خوشگواریت اور معتدل موسم کا لطف لیا ہے۔ بہار کی آمد اور رخصتی کے ہر لمحہ کی میری آنکھیں گواہ ہیں۔ بے موسم پھل اور سبزیاں کھائی ہیں۔ نومبر، جنوری میں آم تو جون، جولائی کے تپتے موسم میں مولی اور کنو کا ذائقہ بھی چکھا ہے، خانہ کعبہ کے آبِ زم زم سے غسل کا منظر، کھلا دروازہ، اندرونی منظر اور غلاف کی تبدیلی ہوتے کئی بار دیکھا ہے۔ بیسیوں حاجیوں کو خیموں میں جل کر کوئلہ بنتے اور کنکریاں مارتے وقت جانے اور واپس آتے حاجیوں کے ہجوم کا ٹکرانا، پل سے گنجائش سے زیادہ حجاج کا جانا اور پچاس فٹ کی بلندی سے نیچے آنا اور کئی حجاج کا کچلے جانا اور سینکڑوں کی تعداد میں شہید ہونا بھی میرے سامنے کی بات ہے۔ ہر سال تو ہم کبھی نہیں گئے لیکن جب زادِ راہ اکٹھا ہو گیا اور بلاوا بھی آ گیا تو چل پڑتا ہوں۔ وہاں جا کر کبھی ایک ریال کا کاروبار نہیں کیا۔ محض عبادت اور زیارات کے لئے جاتا ہوں اور ذہن کی تختی پر خانہ کعبہ، مسجد نبوی، گنبد خضرا اور مقدس مقامات کا تازہ نقش لے کر واپس آ جاتا ہوں۔ یہ ایک روحانی کشش ہے جو مجھے اس سرزمین کی طرف لے جاتی ہے۔ حالانکہ کمر کو درد ہے تو کبھی جوڑوں کی تکلیف ہے، ہائی بلڈ پریشر نے الگ پریشان کر رکھا ہے۔ پچھلے تین سالوں سے مہرے میں خرابی بن گئی ہے جس کی وجہ سے یہ عرصہ سعودیہ نہیں جا سکا کیونکہ زیادہ چلنے سے ٹانگ سن ہو جاتی ہے۔ آج کل وہاں کئی نئے منصوبوں پر کام شروع ہو چکا ہے۔ قسمت نے ساتھ دیا تو کبھی یہ بھی دیکھ آئیں گے۔

ہماری روانگی کا نوٹس لگا دیا گیا تو بڑی مشکل سے ''طواف وداع'' کیا۔ ابھی حج کو گزرے چند دن ہوئے تھے اس لئے رش میں کمی نہ آئی تھی۔ پاک سرزمین پر دوران قیام جو غلطیاں، کوتاہیاں انجانے میں سرزد ہوئی تھیں۔ اس کے لئے اللہ سے دعائیں مانگیں، عبادت کی قبولیت کے لئے التجا کی اور خانہ کعبہ جب تک نظر آتا رہا، مڑ مڑ کر دیکھتے آئے۔ ہوٹل آ کر سب نے اپنا اپنا سامان سنبھال کر بیگ میں رکھا۔ عشاء کی نماز کے بعد سامان بسوں کے قریب لے آئے، معلم کے ورکرز نے لوڈ کرنے میں مدد کی، عورتیں سیٹوں پر قبضہ جمائے بیٹھی تھیں، فکر والی بات نہ تھی۔ جب بسیں سٹارٹ ہوئیں تو ہم بھی سوار ہو گئے۔ رات بارہ بجے جدہ ائرپورٹ پہنچ گئے۔ سب سے ٹکٹیں اکٹھی کر کے پی آئی اے کے کاؤنٹر پر لے گیا، او کے کرا کے واپس آیا تو تمام ساتھی بیگوں پر سر رکھے سو رہے تھے۔ مجھے ان کی بے فکری پر رشک آ رہا تھا۔ میں نے ٹکٹیں اپنے پرس میں رکھیں اور سونے کے لئے لیٹ گیا، اذان کے ساتھ سب جاگ گئے اور ٹکٹیں حوالے کرنے کے بعد سامان جمع کرایا اور دستی بیگ ہاتھ میں رکھ لئے۔ سستی دور کرنے کے لئے چائے کا گلاس لیا، چسکیاں لینے کے ساتھ سگریٹ کے کش لگائے تو نیند اور سستی غائب ہو گئیں۔ اب دستی سامان کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو پاسپورٹ پر خروج کی مہر لگا کر بورڈنگ کارڈ دے دیا گیا۔ دستی سامان چیک کرا کر آگے بڑھے، پروازوں کے شیڈول دکھانے والے بورڈ پر نظر پڑی تو ہمیں لے جانے والی پرواز وقت پر دستیاب تھی۔ ہمیں جہاز پر سوار کرنے کے لئے لاؤنج میں قطار بنانا پڑی۔ یہ بھی بڑا جہاز تھا جس نے مقررہ وقت پر رن وے پر رینگنا

شروع کر دیا۔

ہم نے حفاظتی بیلٹ باندھ لئے، جب ہم فضا میں سفر کر رہے تھے تو میں خیالوں میں اپنے گاؤں، گھر اور گلیوں میں چل رہا تھا اور کئی شناسا چہرے سامنے تھے، جب ائر ہوسٹس نے جوس پیش کیا تو خیالوں کی دنیا سے واپس آنا پڑا۔ کچھ دیر بعد کھانا تقسیم کیا گیا، تھکاوٹ اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے خوب بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہر آئٹم کے ساتھ خوب انصاف کیا جب خالی برتنوں کی ٹرے اٹھالی گئی تو سستی اور نیند نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ گزری رات کا جاگنا اب رنگ دکھا رہا تھا۔ اس لئے خود بخود آنکھیں بند ہونے لگیں، بیگم صاحبہ حسب معمول کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھنے میں مصروف تھیں۔ میری جب بھی آنکھ کھلتی تو ائر ہوسٹس سے جوس یا پیپسی مانگ کر پی لیتا اور پھر آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگتا۔ جب جہاز پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تو سب ساتھی مکمل جاگ گئے۔ کراچی، ملتان اور آخر لاہور کی حدود میں داخل ہو کر جہاز نے دو تین چکر کاٹے اور ہم بخیریت ائرپورٹ پر اتر گئے۔ رن وے پر جہاز آخر میں چہل قدمی انداز میں چلتے ہوئے رک گیا۔ اب سب کو باہر نکلنے کی جلدی تھی، پیارے انتظار میں تھے۔ دروازے کھلنے سے پہلے ہی ہم نے سیٹیں چھوڑ کر دستی سامان سنبھال لیا، ہم عمرہ سے کچھ وقت پہلے جہاز سے باہر آ گئے۔ قطاروں میں لگ کر پاسپورٹ پر دخول کی مہر لگائی گئی، دستی بیگ سنبھالا، گھومنے والی بیلٹ سے زم زم کا کین اور بڑا بیگ اتارا، بڑے ہال سے باہر آئے تو پہلی نگاہ برادرم سجاد پر پڑی، ان سے بے ساختہ بغلگیر ہو گیا، پھر بیگم صاحبہ اور خالہ کو ملے، سب کو فرداً فرداً حج کی مبارک باد پیش کی۔ یہاں دوسرے ساتھیوں کے لواحقین اور کہاں کہاں کے لوگ آئے ہوئے تھے، سب بڑی محبت سے ملے، مبارک باد دی اور ہمارا سامان ٹرالی سے اتار کر کوچ کی طرف چل پڑے۔ میں اب بھی گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے لوگوں سے ہاتھ ملاتا چلا آ رہا تھا، سامنے ہمارے لئے لائی گئی ایک لگژری کوچ موجود تھی، پارکنگ ایریا میں ملنے والوں کا الگ میلہ لگا ہوا تھا۔ حجاج کے رشتہ داروں، دوستوں اور لواحقین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ سب سے ملتے دل میں خیال آیا کہ ایک ملک کے صدر کا ایک دن میں ہاتھ ملانے کا ریکارڈ آج ٹوٹ جائے گا لیکن میں وہ ورلڈ ریکارڈ نہ توڑ سکا، شاید ڈرائیور کو میرے ساتھ دوسرے حاجیوں کی حالت پر بھی ترس آ گیا۔ اس نے مسلسل ہارن بجانا شروع کر دیا اور ایکسلیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھایا تو سب کو سیٹوں کی فکر ہو گئی، یوں میں نے بھی سکون کا سانس لی۔

رات دس بجے سرگودھا پہنچ کر گھر فون کیا، ہماری بیٹی نے بتایا کہ ہم سب آپ کے انتظار میں جاگ رہے ہیں۔ گھر پہنچنے کی جلدی میں کھانا بھی کسی کو یاد نہ تھا، کچھ دوستوں کے اصرار پر جھال چکیاں چوک پر دال روٹی کے لئے مشہور ہوٹل کے سامنے کوچ روک دی گئی تو سب نے کھانا کھایا۔ دال کے ساتھ اچار اور سلاد نے مزہ دوبالا کر دیا۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے کوچ ہمارے گھر کے قریب کھلے میدان میں رک گئی، گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے بڑوں سے ملے اور ان کی دعائیں لیں، اس کے بعد سب بڑوں اور بچوں سے ملے۔ جب بیگم صاحبہ بیٹی سے ملیں تو دونوں کے آنسو بے ساختہ بہنے لگے۔ فارغ ہو کر وضو کیا اور دو نفل شکرانہ ادا کئے۔ اب ملنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے تو مجھے بھی سونے کا موقع مل گیا کیونکہ صبح ہر ملنے کے لئے آنے والے سے بغلگیر ہونے اور سوالات کے جوابات دینے کے لئے نیند اور سکون ضروری تھے۔

ختم شد

ایک حقیقت ایک افسانہ

پچھل پیری

وہ انگوری چڑیل کے خوف اور دہشت کا شکار ہو کر اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کے تاریک ہوتے ذہن میں آخری خیال یہی ابھرا تھا کہ اس کی بیوی سچ کہتی تھی۔ بھوت پریت اور چڑیل واقعی ایک حقیقت ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا قصہ عبرت وہ جن، بھوت اور چڑیلوں پر یقین نہیں رکھتا تھا

☆ شاکر لطیف
0308-4255775

''پتہ نہیں یہ میڈیا کو کیا ہوتا جا رہا ہے، آخر اس طرح کے پروگرام کیوں دکھائے جا رہے ہیں، جہالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے''۔ ارسلان نے ٹی وی پر چلنے والے ایک لائیو شو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ ٹی وی پروگرام جنات اور بھوتوں کے وجود بارے تھا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے کہ جنات اور بھوتوں کا وجود ہوتا ہے اور یہ انسانوں کو چمٹ بھی جاتے ہیں''۔ اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی اس کی بیوی نوشین نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں جنات کے وجود سے انکاری نہیں ہوں''۔ ارسلان ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ''جنات کا ذکر تو مقدس کتابوں میں بھی موجود ہے، میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ صرف انسان کو وسوسہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں عملی طور پر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ ہم سے بالکل علیحدہ اور جدا مخلوق ہے مگر ٹی وی پر اس کے متعلق اس طرح سے پروگرام کئے جاتے ہیں جیسے میڈیا کا اس مخلوق سے ذاتی تعلق ہو۔ میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں تمہاری طرح دیہاتی اور توہم پرست نہیں ہوں جو آنکھیں بند کر کے ایسی فرسودہ باتوں پر یقین کر لوں اور پھر میں بطور مخلوق صرف جنات کا وجود تسلیم کرتا ہوں۔ بھوتوں اور چڑیلوں کے متعلق جو بھی کہا جاتا ہے یہ سب گھڑے ہوئے افسانے اور کہانیاں ہیں''۔

''اب اگر آپ کی عقل ان مخفی باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں''۔ نوشین نے جواب دیا۔ ''میری مرحوم امی جان بتایا کرتی تھیں کہ میرے نانا جان نے اپنی آنکھوں سے ایک چڑیل کو دیکھا تھا اور وہ مرحوم نانا جان کو چمٹ بھی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ شدید بیمار ہو گئے تھے''۔

''تمہارے مرحوم نانا جان کسی نفسیاتی بیماری یا ذہنی کجروی کا شکار ہوں گے۔ اگر ان کا کسی ماہر نفسیات سے علاج کروایا جاتا تو وہ ٹھیک ہو جاتے''۔ ارسلان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ماہر نفسیات ایسی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتے''۔ نوشین اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے نانا جان کا علاج ایک بہت پہنچے ہوئے سائیں بابا نے کیا تھا۔ انہوں نے اس چڑیل کو اس طرح سے قابو تھا کہ وہ وعدہ کرنے پر مجبور ہو گئی کہ آئندہ سو سال تک انسانوں کی دنیا میں قدم نہیں رکھے گی''۔

''ورنہ تمہارے سائیں بابا کیا کر لیتے؟'' ارسلان نے استفسار کیا۔

''اگر وہ چڑیل وعدہ خلافی کرتی تو وہ درویش اسے جلا کر بھسم کر دیتے''۔ نوشین نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ارسلان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ سائیں بابا خود سو سال تک زندہ رہتے''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بزرگوں کا مذاق نہیں اڑاتے''۔ نوشین اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''ورنہ بڑا طوفان آ جاتا ہے اور انسان خواہ مخواہ مشکلات میں پھنس جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان کی عقل جس شے کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ وجود ہی نہ رکھتی ہو''۔

''کبھی کبھی تو بڑی عقل مندی کی باتیں کرتی ہو تمہاری باتیں سن کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ تم تعلیم یافتہ ہو۔ کاش! میرا یہ گمان حقیقت پر مبنی ہوتا''۔ ارسلان نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اگر میرے ماں باپ نے مجھے پڑھایا لکھایا نہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟'' نوشین کے لہجے میں افسردگی عود آئی۔ ''اور پھر ہمارے گاؤں میں کوئی سکول ہی نہیں تھا جو میں تعلیم حاصل کر سکتی''۔

''میرے مرحوم والد اسی گاؤں سے تعلق رکھنے

کے باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اس وقت کی بات دوسری تھی لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے گاؤں میں آج بھی کوئی سکول نہیں ہے اور گاؤں کی اکثریت آج بھی عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جہاں جہالت ہو گی وہاں پھر بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے ہی رہ جاتے ہیں اور اس طرح کے علاقے سائیں بابا کی قبیل سے تعلق رکھنے والوں کے لئے کسی ارضی جنت سے کم نہیں ہوتے۔ بیٹھے بٹھائے دولت خود چل کر ان کے پاس آ جاتی ہے۔ یہ لوگ آج بھی ہمارے معاشرے کے جاہل طبقے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور ہمارے معاشرے کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی یہ سب دیکھنے کے باوجود مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ ملک دنیا کا شاید واحد ملک ہے جہاں اس قسم کی جھوٹی کہانیاں پھیلا کر بھی پیسہ کمایا جا رہا ہے''۔

''یہ جھوٹی کہانیاں نہیں ہوتیں''۔ نوشین اس کے خاموش ہوتے ہی بول پڑی۔ ''ان واقعات کا کچھ نہ کچھ تعلق حقیقی زندگی سے بھی ہے۔ اب حال ہی کا قصہ سن لیں۔ ہمارے گاؤں سے چند میل دور واقع قدیم قبرستان کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے وہاں بھی ایک چڑیل نے قبضہ جما لیا ہے۔ خالدہ باجی بتا رہی تھیں کہ گاؤں کے بہتیرے افراد نے اس چڑیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ پچھل پیری ہے۔ میں نے آپ کو یہ بات پہلے بھی بتائی تھی مگر آپ کو یقین نہیں آیا''۔

''تم نے پھر اسی چڑیل کا ذکر چھیڑ دیا، تم پہلے بھی اس سلسلے میں میرے کافی مرتبہ کان کھا چکی ہو''۔ ارسلان چڑتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھا تھا کہ صرف تمہاری خالدہ باجی ہی پاگل ہیں مگر اب لگتا ہے کہ پورا گاؤں ہی نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ویسے یہ پچھل پیری کیا ہوتی ہے؟''

''پچھل پیری کا مطلب ہے اس چڑیل کے پاؤں سامنے کی بجائے پچھلی طرف ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح آگے کو نہیں ہوتے''۔

خالدہ باجی نوشین کی بڑی بہن تھیں اور گاؤں میں ہی رہتی تھیں۔

''اب اتنے افراد کی گواہی کو کوئی عقل سے پیدل شخص ہی جھٹلائے گا''۔ نوشین نے ارسلان کا طنز اسی پر لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''وہ چڑیل ایک حقیقت ہے، وہ ایک نوجوان لڑکی کے روپ میں اس قبرستان میں کسی قبر کے پاس بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے، گاؤں کے جن افراد نے اسے دیکھا ہے وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے اور اب کوئی بھی اس طرف کا رخ نہیں کرتا''۔

''انہوں نے سچ مچ کسی لڑکی کو دیکھا ہو گا، کیا اس کے ماتھے پر لکھا تھا کہ وہ کوئی چڑیل ہے؟'' ارسلان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''بالکل نہیں''۔ نوشین نے فوراً ہی جواب دیا۔ ''دراصل آپ کو ان خفیہ رازوں کا علم نہیں لیکن اگر آپ کسی نیک اور صالح بزرگ سے اس بارے میں سوال کریں گے تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ چڑیل عورت کا روپ تو دھار سکتی ہے مگر اپنے پاؤں سیدھے نہیں کر سکتی۔ یہی الٹے پاؤں اس کی شناخت کا باعث بن جاتے ہیں۔ گاؤں والے اس کو پچھل پیری بھی کہتے ہیں''۔

''غالباً وہ نیک اور صالح بزرگ آپ ہی ہیں''۔ ارسلان نے اس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو تو کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی''۔ نوشین نے ناراضی سے جواب دیا۔ ''کل آپ گاؤں جا رہے ہیں، وہاں جب آپ کو اس بارے میں بتایا جائے گا تو ہو سکتا ہے آپ کو میری بات پر یقین آ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ پرانے قبرستان میں انگوری نامی کسی

پچھل پیری کا بسیرا ہے۔ باجی خالدہ کبھی جھوٹی بات نہیں کرتیں"۔

"تم نے کئی مرتبہ اس چڑیل کا تذکرہ کیا ہے مگر کبھی نام نہیں لیا لگتا ہے خالدہ آپا نے فون پر تمہیں حال ہی میں اس کا نام بتایا ہے۔ ویسے تم نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ انہیں اس چڑیل کا نام کیسے معلوم ہوا؟" ارسلان نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ وہ جانتا تھا کہ خالدہ باجی نوشین کو فون کر کے اس قسم کے افسانے سناتی رہتی تھیں۔

"اب مجھے کیا معلوم کسی نے تو بتایا ہوگا"۔ نوشین اس کا سوال سن کر بوکھلا گئی۔

"کسی نے نہیں بتایا"۔ ارسلان فوراً ہی بولا۔ "یہ مفروضہ ان کے اپنے ذہن کا شہکار ہے۔ تمہاری باجی اور گاؤں والوں کی پرانی عادت ہے کہ جب تک رائی کا پہاڑ نہ بنالیں انہیں چین ہی نصیب نہیں ہوتا۔ اگر دنیا میں مبالغہ آرائی اور جھوٹ بولنے کا عالمی مقابلہ ہوتا تو تمہارا گاؤں پہلے نمبر پر آتا۔ بہرحال اب مزید میرے کان کھانے کی بجائے ایک کپ چائے پلا دو۔ یہ تو شکر ہے کہ سردی کا موسم ہے ورنہ تم مجھے لسی پلانے کی کوشش کرتی"۔

"لسی صحت کے لئے فائدہ مند ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب چائے نہیں تھی تو لوگ لسی ہی پیتے تھے مگر ستیاناس ہو ان فرنگیوں کا کہ ہمیں جاتے جاتے چائے کا عادی بنا گئے۔ ہمارے گاؤں کے لوگ آج بھی زیادہ تر لسی کا استعمال ہی کرتے ہیں"۔

"اسی لئے ہمیشہ سوتے رہتے ہیں"۔ ارسلان نے لقمہ دیا۔

"اسی لئے اتنے صحت مند ہیں"۔ نوشین نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "اور پھر چائے صحت کے لئے نقصان دہ بھی تو ہے"۔

"اچھا!" ارسلان مصنوعی حیرت کے ساتھ بولا۔ "غالباً یہ معلومات بھی تمہیں خالدہ باجی نے ہی فراہم کی ہوں گی"۔

"جی نہیں، میں خود بھی ایک باشعور لڑکی ہوں اور چائے کے مضر صحت ہونے کے بارے میں کافی معلومات رکھتی ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے نوشین اٹھی اور کچن کی جانب بڑھ گئی اور ارسلان جس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھول ہی تھا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ تاہم اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

نوشین اس کے چچا کی بیٹی تھی اور ارسلان کی اس سے شادی کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے۔ ان دونوں کا رشتہ خاندان کے بڑوں نے اس وقت طے کر دیا تھا جب انہوں نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا۔ ارسلان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، اس وقت اس کے والد گاؤں کے واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے کیونکہ گاؤں میں کھیتی باڑی کے علاوہ روزگار کے مواقع موجود نہیں تھے جبکہ اس کے والد نہیں چاہتے تھے کہ ان کی تعلیمی قابلیت رائیگاں جائے۔ اس لئے وہ عرصہ دراز پہلے شہر منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں وہ ایک بینک میں بطور منیجر ایک طویل عرصہ تک تعینات رہے کیونکہ وہ خود بھی پڑھے لکھے تھے اس لئے انہوں نے ارسلان کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

ارسلان کی والدہ اس کے والد کے برعکس تعلیم سے بالکل نابلد تھیں۔ ارسلان بچپن سے ہی اپنے والدین کے درمیان بحث و تکرار سنتا آ رہا تھا کہ بھوت پریت وجود رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس کے والد ہمیشہ اس بات سے انکاری رہے کہ بھوت پریت ہوتے ہیں جبکہ اس کی والدہ ہمیشہ اس بات پر بضد رہیں کہ جن بھوت نہ صرف ہوتے ہیں بلکہ انسانوں کو چمٹ بھی جاتے ہیں۔

ارسلان ان دونوں کی اس تکرار کو بڑے غور سے

سنتا تھا تاہم وہ اس معاملے میں اپنے والد کا ہم خیال تھا۔ ان کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ جو لوگ جن بھوت چمٹ جانے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ حقیقت میں نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور انہیں کسی اچھے ماہر نفسیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ دنیا سائنسی حقائق جان کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور اس کے ملک کی اکثریت ابھی تک جنوں بھوتوں کی دنیا میں ہی جی رہی۔ ارسلان کے والدین کا انتقال ہوئے بھی دو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے والد کے انتقال کے دس دن بعد ہی اس کی والدہ بھی ان کے پیچھے پیچھے عدم سدھار گئی تھیں۔

وہ چاہتا تو ان کے انتقال کے بعد اپنی بچپن کی منگنی ختم کر کے کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا مگر اس نے اپنے مرحوم والدین کی زبان کا پاس رکھتے یہ شادی کر لی تھی۔ اب کل اسے گاؤں جانا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہاں انگوری چڑیل کے جھوٹے قصے اس کے منتظر ہوں گے۔

اگلے دن وہ تقریباً تین بجے اپنی ذاتی گاڑی پر گاؤں روانہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے گاؤں پہنچنے میں تقریباً پانچ گھنٹے لگ جائیں گے مگر توقع کے برعکس ایک جگہ گھنٹوں ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے اسے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ آگے کہیں زیر تعمیر سڑک کی وجہ سے دوسروں کی طرح اسے بھی نکلنے میں کئی گھنٹے لگ گئے تھے اور ابھی بھی اس کی منزل خاصی دور تھی۔ اب خاصی رات ہو چکی تھی، جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ارسلان کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات بھی امنڈتے چلے گئے۔ اس کے گاؤں کے آس پاس کا علاقہ سنسان اور بیابان تھا، اس لئے اس جگہ مسافروں کا ڈاکوؤں سے سامنا ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ یہ علاقہ کافی عرصے سے ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور یہاں ڈکیتی اور مزاحمت پر قتل کے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ سردی کی وجہ سے دھند میں بھی اضافہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ گاڑی کی رفتار آہستہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تیز رفتاری کسی سنگین حادثے کا باعث بھی بن سکتی تھی۔

اس پر اب جھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ سفر شروع کرتے وقت اس کا خیال تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک گاؤں پہنچ جائے گا مگر اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بائی روڈ سفر کرتے ہوئے مزید دو گھنٹے لگ سکتے تھے تاہم ساتھ ہی ایک شارٹ کٹ کچا راستہ موجود تھا اگر وہ اس پر سفر کرتا تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں گاؤں پہنچ جاتا تاہم اس راستے پر سفر کرنے کے کچھ مضمرات بھی تھے۔ سب سے بڑا خطرہ ڈاکوؤں کا ہی تھا جو ایسی سنسان و بیابان جگہوں پر ارسلان جیسے مسافروں کے منتظر رہتے تھے اور گاڑی نہ روکنے پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ پولیس کی گشتی ٹیموں میں اضافے کے باعث ڈکیتی کی ان وارداتوں میں خاطرخواہ کمی واقع ہوئی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی کوئی سنگین واقعہ رونما ہو ہی جاتا تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ اب گاؤں والے بھی اس راستے کو استعمال کرنا ترک کر چکے ہیں کیونکہ اسی راستے میں وہ قدیم قبرستان بھی موجود تھا جہاں کسی انگوری نامی چڑیل کے قصے وہ نوشین کی زبانی سن چکا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک غور کیا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اپنی گاڑی کچے میں اتار دی۔ ڈاکوؤں کا خطرہ تو مین روڈ پر بھی موجود رہتا تھا، اس لئے اس نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے اس شارٹ کٹ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دھند کی وجہ سے وہ گاڑی بھی خاصی آہستہ رفتار سے چلا رہا تھا۔ اگرچہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس خاصی طاقتور تھیں مگر اس کے باوجود زیادہ دور تک دیکھ پانا ممکن نہیں رہا تھا۔

یہ سوچ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی کہ جب وہ نوشین کو بتائے گا کہ وہ اسی قبرستان کے پاس سے گزرا تھا جہاں بقول اس کے انگوری چڑیل کا بسیرا ہے تو اس کا کیا حال ہوگا، شاید وہ خوف سے کانپنے لگے گی۔

تقریباً ایک گھنٹے کی سست رفتار ڈرائیونگ کے بعد اچانک اس کی گاڑی کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ ابھی ارسلان ان جھٹکوں کی وجہ تسمیہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ گاڑی کا انجن بھی بند ہو گیا۔ شاید گاڑی میں کوئی فنی خرابی واقع ہو گئی تھی۔ گاڑی اب رک چکی تھی، اس ویرانے میں اس کا یوں خراب ہو جانا کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ ارسلان کے چہرے پر بھی تشویش کے تاثرات ابھر آئے۔ اس ناگہانی صورت حال نے اسے حقیقی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ اس ویران علاقے میں اتنی رات گئے کسی کی مدد بھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کافی دیر تک سیلف مار کر گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے بونٹ اٹھا کر خرابی کی وجہ جاننا چاہی مگر اسے ناکامی ہوئی۔

گاڑی سے نیچے اترتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ باہر موسم کس قدر سرد ہے۔ وہ دوبارہ پجیرو کے اندر بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ دیر تک دوبارہ گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر پھر جھلا کر اپنی کوشش ترک کر دی۔ اس کا ذہن تیزی سے اس مسئلے کا کوئی قابل عمل حل سوچ رہا تھا۔ اس جگہ کسی کی مدد ملنا محال تھا۔ نوشین اسے بتا چکی تھی کہ انگوری کے قصے کے بعد گاؤں والے اس راستے کا استعمال ہی ترک کر چکے ہیں اور پھر اتنی رات گئے تو کوئی ویسے بھی اس راستے کا استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے پاس آخری چارہ کار یہی تھا کہ وہ گاؤں میں اپنے چچا کو فون کر کے ان سے مدد طلب کرے۔ گاؤں سے کوئی موٹر سائیکل پر اسے لینے آ جاتا تو وہ گاڑی کو اسی جگہ کھڑی کر کے اس کے ساتھ جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے چچا جان کو فون پر یہی بتا رکھا تھا کہ وہ ایک دو دنوں تک گاؤں کا چکر لگائے گا اور آج وہ انہیں اپنی آمد کی اطلاع دیئے بغیر ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ غالباً نوشین نے بھی انہیں آ اطلاع نہیں دی تھی ورنہ اب تک اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے کسی کا فون آ چکا ہوتا۔

اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور اپنے چچا کا نمبر ملا دیا۔

یہ باعث غنیمت تھا کہ اس جگہ بھی موبائل کے سگنل دستیاب تھے مگر اپنی اس کوشش میں بھی سے مایوسی ہوئی کیونکہ دوسری طرف سے فون آف جا رہا تھا۔ دیہات میں آج بھی لوگ جلد سو جانے کے عادی تھے کیونکہ انہیں اپنے کھیتوں پر کام کرنے کے لئے صبح سویرے اٹھنا ہوتا ہے۔ اس نے خالدہ باجی کو فون کرنے کا سوچا مگر پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ ایک تو ان کا گھرانہ بھی اس وقت محو خواب ہو گا اور پھر اتنی رات گئے انہیں تکلیف دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ نوشین کو وہ فون کرنا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ یہ جاننے کے بعد کہ ارسلان قدیم قبرستان کے پاس کہیں موجود ہے شاید رونا ہی شروع کر دیتی کیونکہ اس کی توہم پرست بیوی انگوری چڑیل کو ایک حقیقت مانتی تھی اور اس کے لئے یہ اطلاع بڑی روح فرسا ہوتی کہ اس کا شوہر اتنی رات گئے انگوری کے علاقے میں موجود ہے۔

ارسلان کو یقین تھا کہ اس نے اپنی گاڑی پر کچے راستے کا کافی سفر طے کر لیا ہے اور وہ قدیم قبرستان کے قریب ہی کہیں موجود ہے۔ تاہم یہ صرف اس کا اندازہ ہی تھا کیونکہ دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک دیکھ پانا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ قبرستان کے قریب

ہی کہیں موجود ہے تو پھر وہ پیدل سفر کر کے بھی گاؤں تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قبرستان کے اندر سے ایک پیدل شارٹ کٹ راستہ موجود ہے جہاں سے گزر کر وہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں اپنی منزل پر پہنچ جاتا۔ اپنے چچا کے گھر رات بسر کرنے کے بعد صبح کسی میکینک کا بندوبست کر کے گاڑی کو بھی ٹھیک کروایا جا سکتا تھا۔ وہ ایک عملی آدمی تھا، فیصلہ کرتے ہی گاڑی سے باہر آ گیا۔ جہاں سخت سردی نے ایک بار پھر اس کا استقبال کیا۔ اس نے گاڑی لاک کی اور آگے بڑھ گیا۔

تقریباً پانچ منٹ تک پیدل چلنے کے بعد دھند میں قدیم قبرستان نمودار ہو گیا تو اسے اطمینان ہوا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ کافی سال پہلے بھی اس جگہ آ چکا تھا اس لئے گاؤں تک پہنچنے کے راستے سے بھی بخوبی واقف تھا مگر منزل تک جلدی پہنچنے کے لئے اسے اس قبرستان کے اندر سے گزرنا تھا۔ اپنے سامنے کچی پکی قبریں دیکھ کر اسے ہلکے سے خوف کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اس گہری تاریک رات جس میں دھند نے ماحول کو دہشت ناک اور آسیبی سا بنا دیا تھا اگر اس کی جگہ کوئی توہم پرست آدمی ہوتا تو شاید خوف سے کانپنے لگتا اور قبرستان کے اندر قدم رکھنے کی کبھی ہمت نہ کرتا مگر ارسلان نہ تو بزدل تھا اور نہ ہی توہم پرست۔ اگرچہ اس پُراسرار اور ویران ماحول نے اس کے اعصاب پر بھی اثر دکھانا شروع کر دیا تھا مگر اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے قبرستان میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اب اس کے دونوں اطراف میں قبریں ہی قبریں تھیں۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس کے خوف اور گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج پہلی بار اس کے ذہن میں بھوت پریت کا خوف طاری ہونے لگا تھا ورنہ وہ ایسے فاسد خیالات کو ذہن سے جھٹک دینے کا عادی تھا مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اس پر دہشت طاری ہونے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار انگوری چڑیل کا خیال بھی آ رہا تھا۔

دھند اب اتنی گہری ہو چکی تھی کہ دس فٹ سے زیادہ آگے دیکھ پانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اسی لمحے دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی تو اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا اور اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ جانتا تھا کہ آوارہ کتے عام طور پر تو کسی کو تنگ نہیں کرتے تھے مگر اتنی رات گئے کسی تنہا مسافر کو دیکھ کر اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ یہ کتے بھی شیر ہو جاتے اور اسے کم از کم زخمی تو کر ہی دیتے کیونکہ اب دھند کی وجہ سے حدِ نگاہ صرف چند فٹ رہ گئی تھی، اس لئے چلتے چلتے اس کے سامنے اچانک کوئی قبر آ جاتی تو وہ راستہ بدل کر آگے بڑھ جاتا۔ ایک دو دفعہ تو وہ گرتے گرتے بھی بچا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ قبرستان کے درمیان میں پہنچ چکا ہے۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ محض باتیں کرنے میں اور آدھی رات کو کسی ویران قبرستان کے اندر سے حقیقتاً گزرنے میں کتنا فرق ہے۔ وہ اب جلد از جلد اس آسیبی ماحول سے نکل کر گاؤں پہنچنے کا خواہاں تھا۔

دوسرے لمحے اس کے راستے میں ایک اور قبر حائل ہوئی تو وہ یکلخت اپنی جگہ ساکت ہو گیا اور اس کے چہرے پر شدید ترین خوف اور دہشت کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی دہشت کی وجہ وہ قبر نہیں بلکہ پاس ہی

ماحول کا اثر

گندگی کے آس پاس رہنے والا آخر بدبو کی حس کھو دیتا ہے۔ غلط افکار بھی ایک گندگی ہیں۔ پہلے بُرے لگتے ہیں پھر ماحول کے اثر سے بھلے لگنے لگتے ہیں۔

---------- جواد حیدر۔ تلہ گنگ

موجود پتھر پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی تھی۔ آدھی رات کو ایک قدیم اور ویران قبرستان میں بیٹھی یہ لڑکی کون ہو سکتی تھی؟ انگوری چڑیل،..... اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا اور یہ خیال آتے ہی اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اپنی بیوی کی باتیں گونجنے لگیں کہ انگوری چڑیل ایک حقیقت ہے اور وہ قبرستان میں کسی قبر پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے اور اس بات کا گواہ سارا گاؤں ہے۔

سردی کے باوجود ارسلان کے ماتھے پر پسینہ بہہ نکلا، اسے اپنے دل پر ہلکا سا دباؤ بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین نے اسے جکڑ لیا ہو اور اب وہ ایک قدم بھی مزید نہیں چل پائے گا۔ اس لڑکی کا چہرہ تو اس کی طرف تھا مگر نگاہیں کسی اور طرف تھیں اور یہ صورتِ حال ارسلان کو مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔ لڑکی نے اپنے جسم کے گرد ایک سیاہ چادر لپیٹ رکھی تھی۔

''کون ہو تم اور اتنی رات گئے اس قبرستان میں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے دل کڑا کر کے اس لڑکی سے سوال کیا۔ تاہم کوشش کے باوجود اپنی آواز کی لرزش نہ چھپا سکا۔ وہ خاصے مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر پچھلے چند ثانیوں میں اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا، اس سے اس کے اعصاب بھی چٹخ گئے تھے۔

اس کا سوال سن کر وہ لڑکی چند لمحے خاموش رہی اور پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں انگوری ہوں اور میں اسی جگہ رہتی ہوں''۔

اس کا نام سنتے ہی ارسلان نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا لمحہ بھر کے لئے اسے یقین ہی نہ آیا کہ لڑکی نے واقعی اپنا نام انگوری بتایا ہے۔ اس غیر متوقع اور خوفناک صورتِ حال کی وجہ سے اسے اپنے دل پر شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا حالانکہ موسم انتہائی سرد تھا۔ اس کے جواب نے ارسلان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ انگوری کے قصے میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی موجود ہے۔ یہ محض کوئی کہانی یا افسانہ نہیں تھا اور اس کا جیتا جاگتا ثبوت اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ کیا یہ لڑکی واقعی میں چڑیل تھی مگر اس بات کا تعین کیسے ہو گا؟ دفعتہً اس کے ذہن میں اپنی بیوی نوشین کی بات گونجی کہ چڑیل کا پہچاننے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں۔ ذہن میں یہ خیال آتے ہی اس نے خوفزدہ سی نگاہوں سے انگوری کے پیروں کی جانب دیکھا اور جیسے ہی اس کی نظر انگوری کے پیروں پر پڑی، اس کے ذہن میں ایک لفظ اُبھرا ''پچھل پیری''۔ وہ بے اختیار زمین پر گرتا چلا گیا۔ اس لڑکی کے پاؤں ننگے تھے اور ارسلان نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ اس کے دونوں پیر پیچھے کو مڑے ہوئے ہیں۔ تو گویا وہ واقعی ایک چڑیل تھی۔

ذہن میں یہ خیال ابھرتے ہی خوف اور دہشت سے اس کے دل کو زوردار جھٹکا لگا۔ وہ اب زمین پر بالکل سیدھا لیٹ چکا تھا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا اور دل بھی گویا پھڑپھڑا رہا تھا۔ اسے دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں شاید اس کی مدد کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ شدتِ تکلیف سے کچھ دیر تک اسی طرح تڑپتا رہا اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ دل کے شدید دورے نے اسے موت سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ انگوری چڑیل کے خوف اور دہشت کا شکار ہو کر اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کے تاریک ہوتے ذہن میں آخری خیال یہی ابھرا تھا کہ اس کی بیوی سچ کہتی تھی۔ بھوت پریت اور چڑیل واقعی ایک حقیقت ہیں۔

○●○

تھانہ انچارج انسپکٹر لیاقت نے بغور ارسلان کی اکڑی ہوئی لاش کا جائزہ لیا اور پھر اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔

''اس کو مرے ہوئے کافی گھنٹے گزر چکے ہیں''۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ماتحت کو کہا جس کے کندھے پر لگے ہوئے سٹارز بتا رہے تھے کہ وہ سب انسپکٹر ہے۔ ''اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان بھی نہیں ہے۔ اصل صورتِ حال تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی سامنے آئے گی مگر بادی النظر میں یہی لگتا ہے کہ یہ شخص طبعی موت کا شکار ہوا ہے۔ بہر حال اس کی تلاشی تو لو''۔ اس نے حکم دیا تو سب انسپکٹر نے تیزی سے ارسلان کے مردہ جسم کی تلاشی لینی شروع کر دی اور پھر ایک موبائل فون اور بٹوہ برآمد کر کے انسپکٹر لیاقت کے حوالے کر دیا۔

انسپکٹر لیاقت نے بٹوے کا جائزہ لیا بٹوے میں شناختی کارڈ اور نقدی کے علاوہ کسی گاڑی کی چابی بھی موجود تھی۔

''اس کا نام ارسلان ہے اور لگتا ہے کہ قبرستان سے کچھ دور کھڑی گاڑی اسی شخص کی ہے''۔ اس نے شناختی کارڈ اور چابی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''شناختی کارڈ پر پتا بھی شہر کا درج ہے''۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!'' اس کے ماتحت سب انسپکٹر نے جواب دیا، ان کے ساتھ آیا ہوا دیگر ماتحت عملہ خاموشی سے ان کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

''میرے خیال میں اب صورت حال واضح ہو گئی ہے''۔ سب انسپکٹر نے کہا۔ ''غالباً ارسلان نامی اس شخص کی منزل یہاں سے کچھ دور کا گاؤں بالم پور تھی، کسی وجہ سے اس کی گاڑی خراب ہو گئی اور اس نے پیدل آگے بڑھنا شروع کر دیا مگر قبرستان کے اندر ناگہانی موت کا

سود کے مال پر پرورش پانے والی اولاد ہمیشہ بے سود ہی نکلے گی۔

حکیم ممتاز-میانوالی

شکار ہو گیا۔ اس کی موت کے وقت کے تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہو چکے ہیں۔ شدید خوف اور دہشت کے تاثرات...... ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا''۔

''بکواس بند کرو''۔ انسپکٹر لیاقت نے اس کی توجیہہ سن کر غصیلے لہجے میں کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو کر بھی بھوت پریت پر یقین رکھتے ہو۔ حقیقت میں سارا کھیل انسانی نفسیات کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ شخص بھی ایسے ہی کسی نفسیاتی خوف کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ بہر حال اصل صورتِ حال تفتیش کے بعد ہی واضح ہو گی۔ تم کسی کو یہ شناختی کارڈ دے کر قریبی گاؤں روانہ کرو، شاید وہاں کوئی اسے جانتا ہو۔ بصورت دیگر ہمارے پاس اس کا شہر والا پتا تو موجود ہی ہے''۔

اسی لمحے اس کے ہاتھ میں موجود اس موبائل کی گھنٹی بج اٹھی جو اس کے ماتحت نے ارسلان نامی شخص کی تلاشی کے دوران برآمد کیا تھا۔

''لو میرے خیال میں اب اس بارے میں مزید معلومات حاصل ہو جائیں گی''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔ ''ہیلو کون بات کر رہا ہے؟''

''آپ کون ہیں اور ارسلان کہاں ہے؟'' دوسری طرف سے اس کے سوال کے جواب میں بھی سوال کیا گیا آواز نسوانی تھی۔

''محترمہ! میرا نام انسپکٹر لیاقت ہے، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ارسلان صاحب آپ کے کیا لگتے تھے؟'' اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے استفسار کیا۔

''میرا نام نوشین ہے اور میں ان کی بیوی ہوں مگر آپ نے ان کے لئے ''تھے'' کا صیغہ کیوں استعمال کیا ہے؟'' دوسری طرف سے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا گیا۔

''محترمہ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے شوہر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہمیں بالم پور کے قریب موجود قدیم قبرستان سے ان کی لاش ملی ہے، آپ کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں ہے؟''

''نہیں''۔ نوشین کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے، میرے شوہر نہیں مر سکتے۔ میں نے تو انہیں تاکید کی تھی کہ اس قبرستان کا رخ نہ کریں، وہ منحوس چڑیل میرے شوہر کو بھی کھا گئی، میں اسے نہیں چھوڑوں گی، میں اس پر کسی بہت بڑے عامل سے عمل کراؤں گی اور اسے جلا کر بھسم کروادوں گی''۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں محترمہ؟'' انسپکٹر لیاقت نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ شہر میں رہتی ہیں اور اس کے باوجود توہم پرستی کی باتیں کر رہی ہیں''۔

''آپ ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے انسپکٹر صاحب!'' نوشین نے باقاعدہ روتے ہوئے کہا۔ ''میرے شوہر بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ میں نے انہیں کتنا منع کیا تھا کہ بالم پور جانے کے لئے قبرستان والا راستہ استعمال نہیں کرنا مگر وہ شاید ضد میں آ کر ادھر چلے گئے اور انگوری چڑیل کا شکار بن گئے۔ ہائے میں لٹ گئی..... میں برباد ہوگئی.....'' اس کے ساتھ ہی ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی، انسپکٹر لیاقت ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا مگر رابطہ منقطع نہ ہونے کے باوجود دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

''لگتا ہے محترمہ شدت غم سے زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی ہیں''۔ اس نے گرنے کی آواز سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ہم ان کے لئے صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔ وہ ہاشم خان نامی گورکن کہاں چلا گیا ہے جس نے ہمیں لاش کے بارے میں اطلاع دی تھی؟''

''وہ اپنی جھگی میں ہے۔ قبرستان کے آخر میں اس نے ایک چھوٹی سی جھگی بنا رکھی ہے، میں اسے ابھی بلاتا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے سب انسپکٹر نے اپنے پیچھے کھڑے سپاہیوں میں سے ایک کو ہاشم خان کو بلانے کا کہا تو وہ سپاہی تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا، کچھ ہی دیر میں وہ اسے لے کر آ گیا۔

ہاشم خان تقریباً ساٹھ سال کا ایک بوڑھا شخص تھا، اسی شخص نے آج صبح تھانے پہنچ کر اس لاش کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ تھانہ انچارج انسپکٹر لیاقت بھی اتفاق سے اس وقت تھانے میں موجود تھا کیونکہ کسی لاش کا ملنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس لئے وہ فوراً ہی اپنے ماتحتوں کے ہمراہ اپنی پولیس موبائل پر قبرستان روانہ ہوگیا۔ اطلاع کنندہ ہاشم خان کو بھی پولیس موبائل میں ہی بٹھا لیا گیا تھا۔ بقول اس کے وہ اس قبرستان کا گورکن تھا۔ اسے لاش کے بارے میں رات کو ہی علم ہو گیا تھا مگر پولیس کو اطلاع کرنے کے لئے اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا اور نہ ہی اتنی رات کو تھانے تک پہنچ سکتا تھا۔ تاہم کیونکہ معاملہ سنگین نوعیت کا تھا اس لئے وہ فجر کی نماز ادا کرتے ہی تھانے کی طرف روانہ ہو گیا اور تقریباً تین گھنٹے پیدل سفر کے بعد وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا جس کے نتیجے میں انسپکٹر لیاقت اپنے ماتحتوں کے ہمراہ اس جگہ موجود تھا۔

''تم نے بتایا تھا کہ تم اس قبرستان کے گورکن ہو، کتنا عرصہ ہوا ہے تمہیں یہاں رہتے ہوئے؟'' انسپکٹر نے اس سے سوال کیا۔

''انسپکٹر صاحب! مجھے یہاں آئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے''۔ گورکن نے کہا۔ ''میں روزی کمانے یہاں آیا

تھا مگر اب لگتا ہے کہ کسی اور جگہ جانا پڑے گا''۔

''کیوں؟'' انسپکٹر لیاقت نے چونک کر سوال کیا۔

''کیونکہ اب اس کے علاقے سے کوئی بھی تدفین کے لئے اس قبرستان میں نہیں آتا''۔ گورکن نے کہا۔ ''قبریں کھود کر روزی کمانا ہی میرا پیشہ ہے اور کام نہ ہونے کی وجہ سے مجھے یہاں سے جانا پڑے گا''۔

''مگر لوگ اپنے مرنے والوں کو یہاں دفنانا کیوں چھوڑ گئے ہیں؟'' انسپکٹر لیاقت نے حیرت سے استفسار کیا۔

''یہ اس علاقے کے رہنے والوں کی جہالت اور توہم پرستی کا نتیجہ ہے''۔ ہاشم خان نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''آس پاس کے دیہات میں یہ کہانی مشہور ہوگئی ہے یا کر دی گئی ہے کہ اس قبرستان میں انگوری نامی چڑیل کا بسیرا ہے، اس لئے ڈر کے مارے کوئی ادھر کا رخ ہی نہیں کرتا۔ چڑیل کا خوف ان لوگوں کے دلوں پر اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ انہوں نے اس قبرستان میں اپنے مُردے تک دفنانے ترک کر دیئے ہیں۔ انگوری کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ میری بیٹی کا نام ہے جس کا ذہنی توازن پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہے۔ تاہم اسے اتنی عقل ہے کہ اپنا مدعا بیان کر لیتی ہے۔ اسی نے رات کو مجھے اس مرنے والے شخص کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے فوراً آ کر اس کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شخص بے ہوش ہوگا مگر اس کی نبض دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ تو مر چکا ہے۔ میں اکیلا اس بھاری بھرکم لاش کو اٹھا کر قبرستان سے باہر نہیں لے جا سکتا تھا، اس لئے میں نے مجبوراً اسے اس سردی میں ہی پڑا رہنے دیا۔ ویسے بھی یہ اب ایک لاش ہی تھی، صبح میں نے تھانے پہنچ کر آپ کو اطلاع دے دی۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی تک نہیں لی''۔

''میں جانتا ہوں''۔ انسپکٹر لیاقت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہاری بیٹی آدھی رات کو قبرستان کے اس درمیانی حصے میں کیا کر رہی تھی؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں''۔ ہاشم خان نے جواب دیا۔ ''مگر قبرستان میں اس کی موجودگی کی وجہ کچھ اور تھی۔ دو ماہ پہلے اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا، یہاں اس کی قبر ہے۔ انگوری کو اپنی ماں سے بہت لگاؤ تھا، ایک وہی تو تھی جو اس کی ہر بات کا مطلب فوراً سمجھ لیتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد میں نے انگوری کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ اکثر رات کے وقت اپنی ماں کی قبر کے پاس بیٹھی رہتی ہے''۔

''مگر اتنی رات گئے اسے قبرستان میں اکیلے ڈر نہیں لگتا؟'' سب انسپکٹر سے نہ رہا گیا تو وہ بول ہی پڑا۔ تاہم بات کرتے ہوئے وہ کنکھیوں سے انسپکٹر لیاقت کو بھی دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر اس کا سوال سننے کے بعد برہمی کے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے۔

''ڈر کیسا جناب!'' ہاشم خان نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں ایک گورکن ہوں، میری بیٹی نے اپنی ساری زندگی قبروں کے درمیان ہی گزاری ہے۔ ویسے بھی میں ان بھوتوں کی کہانیوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میں نے برسوں ویران قبرستانوں میں زندگی بسر کی ہے مگر آج تک کوئی چڑیل نہیں دیکھی۔ میں اور میری بیٹی توہم پرست نہیں ہیں، انسپکٹر صاحب!'' وہ بات کرتے کرتے انسپکٹر لیاقت کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''آپ تو اپنی ڈیوٹی کے دوران نگر نگر پھرتے ہیں، مجھے کسی ایسی جگہ کا پتہ بتا دیں جہاں کے لوگ ان بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیوں پر یقین نہ رکھتے ہوں۔ میں انگوری کو لے کر وہاں چلا جاؤں گا، میں تو ایسے لوگوں سے تنگ آ چکا ہوں''۔

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسی جگہ تمہیں کم از کم ہمارے معاشرے میں تو نہیں ملے گی۔ ایسی

جاہلانہ سوچ رکھنے والے ہر جگہ ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ہمارے محکمے میں بھی''۔ انسپکٹر لیاقت نے قہر آلود نظروں سے اپنے ماتحت کو گھورتے ہوئے ہاشم خان کو جواب دیا۔ ''بہر حال کہاں ہے تمہاری بیٹی؟ ذرا اس سے بھی مل لیا جائے''۔

''میں اسے ابھی لے آتا ہوں جناب!'' ہاشم خان نے کہا اور پھر واپس مڑ گیا۔

''اس کی لاش کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو، اس کی بیوی کے فون سے اتنا تو کنفرم ہو گیا ہے کہ یہ قریبی گاؤں بالم پور جا رہا تھا۔ اس کی لاش کو وہاں تک لے چلتے ہیں اس کے ورثاء سے بات چیت کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ پوسٹ مارٹم کروایا جائے یا نہیں''۔ انسپکٹر لیاقت نے کہا تو سب انسپکٹر نے پیچھے کھڑے سپاہیوں کو اشارہ کر دیا جو انسپکٹر لیاقت کا حکم سن کر پہلے ہی آگے بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے ارسلان کے مردہ جسم کو اٹھایا اور اس طرف بڑھ گئے جدھر پولیس موبائل کھڑی تھی۔

اسی لمحے ہاشم خان ایک لڑکی کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ انسپکٹر لیاقت نے قریب آنے پر بغور اس لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کے درمیان تھی۔ سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ وہ ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ اس کے دونوں پیر پیچھے کو مڑے ہوئے تھے اور وہ چلنے کے لئے بیساکھی کا استعمال کر رہی تھی۔

''یہ انگوری ہے انسپکٹر صاحب! جس کے مڑے ہوئے پیر دیکھ کر لوگ خوف سے ہی بھاگ اٹھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ الٹے پیر صرف چڑیلوں کے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ اس کو پگھل پیری سمجھتے ہیں۔ اپنے مڑے ہوئے پیروں کی وجہ سے یہ جوتے بھی نہیں پہن سکتی۔ بچپن میں پولیو کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کے پیروں کا یہ حال ہوا ہے''۔ ہاشم خان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''اس کی آنکھوں میں بھی بھینگا پن ہے جس کی وجہ سے سامنے والے کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ یہ کسی اور طرف دیکھ رہی ہے حالانکہ یہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہوتی ہے''۔

''مگر تم اسے ساتھ لے جا کر گاؤں والوں کے سامنے حقیقت واضح بھی تو کر سکتے تھے''۔ انسپکٹر لیاقت نے سوال کیا۔

''میں ایسا کرنا چاہتا تھا''۔ گورکن ہاشم نے کہا۔ ''مگر اپنے ارادے پر اس لئے عمل نہ کر سکا کہ گاؤں میں موجود ایک جعلی عامل نے مجھے دھمکی بھجوائی تھی کہ اگر میں انگوری کو لے کر گاؤں آیا تو وہ مجھے جان سے مروا دے گا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی بیمار ہوتا ہے وہ جعلی عامل ان کے گھر پہنچ جاتا ہے اور انہیں کہتا ہے کہ مریض پر قبرستان کی چڑیل انگوری کا سایہ ہو گیا ہے۔ اگر علاج نہ کروایا گیا تو بیمار شخص مر جائے گا۔ وہ جعلی عامل انگوری کی حقیقت جانتا ہے مگر کیونکہ انگوری کے نام پر جاہل لوگوں سے پیسہ بٹور رہا ہے اس لئے نہیں چاہتا کہ اس کی حقیقت لوگوں پر افشا ہو۔ ویسے گاؤں کے بہت سے لوگ انگوری کی حقیقت جانتے ہیں مگر کچھ تو اس جعلی عامل کے ڈر سے خاموش رہتے ہیں اور کچھ لوگوں کو ویسے ہی ایسی جھوٹی کہانیاں سنا کر پُراسراریت پھیلانے کا شوق ہوتا ہے''۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہاشم خان!'' انسپکٹر لیاقت نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''توہم پرستی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔ ارسلان نامی متوفی بھی اس توہم پرستی کی ہی بھینٹ چڑھا ہے۔ نہ جانے یہ ناسور کب تک ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کرتا رہے گا''۔

❁❁❁

جنگ بیتی

لاوا

عبدالرحمان نے مرنے سے پہلے فریدہ کو ٹھیک کہا تھا کہ
مجھے معاف نہ کر کے سکون سے تم بھی نہ رہ سکو گی۔ پھر یہی ہوا۔

☆ محمد رضوان قیوم
راوی: ڈاکٹر ممتاز اصغر

آخری قسط

انسپکٹر تیجا رام کی آنکھوں میں مکاری اور خباثت صاف نظر آ رہی تھی۔

''تیجا رام سے بھاگنا موت کو آواز دینے کے برابر ہے''۔ اس نے نفرت سے موسیٰ خان کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو بڑے بڑے سورماؤں کو زمین چٹادی، تُو کس کھیت کی مولی ہے؟''

میں حیرت اور صدمے سے اس خونی تھانیدار کو دیکھ رہا تھا۔

''چلو، اس کی لاش اٹھا کر تھانے لے چلو''۔ اس نے کانسٹیبلوں سے کہا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ دو کانسٹیبل میری طرف بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ تیجا رام میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور تمسخرانہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

''یہ کیا کیا آپ نے انسپکٹر صاحب؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''بکواس بند کر اپنی''۔ اس نے میرے کندھے پر بید کی چھڑی مارتے ہوئے کہا۔ ''میں نے وہی کیا جو میرا فرض تھا۔ تُو بتا تُو نے کیا کیا؟ تُو نے اپنے ساتھی ڈاکو، قاتل اور پکے وارداتیے موسیٰ خان کو حوالات سے بھاگنے میں سہولت کاری کی''۔

''یہ سب جھوٹ ہے انسپکٹر صاحب!'' میں نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ ''میرا موسیٰ خان سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی میں نے اس کو بھاگنے میں کوئی مدد دی تھی''۔

''تو کیا وہ تیرا بہنوئی تھا؟'' ایک ہیڈ کانسٹیبل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تُو اس کے پاس یہاں کیا لینے آیا تھا؟''

میں اس کے سوال پر سٹپٹا گیا۔

''اس کی تلاشی لو''۔ تیجا رام نے کہا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری جیب میں موسیٰ خان والا پستول تھا۔ دو کانسٹیبلوں نے میری تلاشی لی تو انہوں نے وہی پستول اور موہن داس کا دیا ہوا سونے کا ہار اور نگینے برآمد کر لئے۔

''یہ پستول، سونے کا ہار اور نگ کس کے ہیں؟'' انسپکٹر تیجا رام نے گرج کر پوچھا۔

''یہ..... یہ پستول میرا نہیں ہے''۔ میں نے بڑی مشکل سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''یہ پستول اور ہار مجھے اے ایس آئی موہن داس نے دیا تھا اور یہ نگ مجھے فریدہ نے دیا تھا''۔

''کون اے ایس آئی موہن داس؟'' تیجا رام نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ فریدہ کون ہے؟..... چلو اوئے اسے تھانے لے چلو باقی تفتیش وہیں ہو گی''۔

پولیس والوں نے میرے چہرے پر کالا کپڑا ڈال کر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

کاش! یہ سب خواب ہو۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ سب اتنا بُرا اور شرمناک تھا کہ میں زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ حقیقت میں میرے ساتھ ہو رہا تھا اور مجھے اپنے سامنے آنے والے بُرے دن نظر آ رہے تھے۔

تھانے لے جا کر جب میری ہتھکڑی کھولنے کے بعد میرے سر سے کالا کپڑا اتارا گیا تو تھانے کا منظر دیکھ کر مجھے تلوؤں سے زمین نکلتی محسوس ہونے لگی۔ تھانیدار کی میز کے سامنے والی کرسیوں پر نصیر شاہ، ساجدہ اور مظہر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ابا کو بڑے بُرے طریقے سے فرش پر بٹھایا ہوا تھا اور شیدا اپنا دایاں پاؤں ان کے کندھے پر رکھ کر کھڑا تھا۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر میں سہم گیا۔ مجھے لگا تھانے کا وہ کمرہ گھومنے لگا ہے۔

یہ اے ایس آئی موہن داس اور شیدے کی حرام زدگی تھی۔ انہوں نے انسپکٹر تیجا رام سے مل کر میرے ساتھ مکروہ کھیل کھیلا تھا، ایک سازش کی تھی۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ دونوں نے دوستی کے

پردے میں میری جڑیں کاٹ دی ہیں لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ نصیر شاہ اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ تھانے میں کیوں موجود ہے۔

مجھے خیال آیا کہ شاید یہ لوگ مجھے بچانے کے لئے یا چھڑانے کے لئے آئے ہیں لیکن جلد ہی ثابت ہو گیا کہ یہ محض میرا وہم اور خوش فہمی ہے۔

''لو جی ہم نے آپ کا ڈکیت رشتہ دار رنگے ہاتھوں پکڑ لیا''۔ تیجا رام نے نصیر شاہ کو مخاطب کر کے کہا پھر اس نے محرر کو کہا کہ شاہ صاحب کو زیورات دکھاؤ۔

محرر نے مجھ سے برآمد شدہ زیورات اور نگ ان لوگوں کے سامنے رکھ دیئے۔

''یہ تو ہمارا زیور ہے''۔ ساجدہ نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کیسے بھول سکتی ہوں''۔

''ارے کمبخت کمینے انسان تُو نے تو اپنی سگی بہن کے سسرال والوں کو بھی نہیں بخشا''۔ نصیر نے غصے سے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''یہ زیور تو مجھے ساجدہ نے خود سنار سے اجلوانے اور ٹھیک کرنے کے لئے دیئے تھے''۔

''ہائے میرے اللہ''۔ ساجدہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھلا اسے زیور کیوں دیتی۔ اس سے میرا کیا رشتہ؟ میرے ابا، بھائی کیا گھر میں نہیں ہیں؟''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ساجدہ؟'' میں نے اسے چلا کر کہا۔ ''ساجدہ تم نے کیا نصیر شاہ، موہن داس، شیدے اور ابا کے سامنے یہ نہیں کہا تھا کہ میں نے عبدالرحمان کو یہ زیورات اجلوانے کے لئے دیئے ہیں''۔

''ذلیل انسان!'' انسپکٹر تیجا نے میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ ''نصیر شاہ نے تیرے خلاف پرچہ کٹوایا ہے کہ تُو اس کے گھر سے زیورات چوری کر کے بھاگ آیا ہے''۔

''یہ جھوٹ ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ.....'' میں یہ جملہ کہہ کر خود ہی رک گیا اور میرے دل میں خیال آیا کہ یہ زیورات تو مجھے فریدہ نے دیئے تھے۔

''زبان پر تالہ کیوں پڑ گیا ہے، منہ سے کچھ پھوٹ؟'' میری کمر میں ایک سپاہی نے ایک زوردار ڈنڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔

''سچ بات یہ ہے کہ مجھے یہ زیورات فریدہ نے دیئے تھے''۔

میری اس بات پر تھانیدار تیجا رام نے شیر کی دھاڑ کی مانند چلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی چند لمحے پہلے تُو یہ بیان دے رہا تھا کہ یہ زیورات تجھے ساجدہ نے دیئے تھے۔ یہ یکدم فریدہ کہاں سے آ گئی، یہ فریدہ کون ہے؟''

''فریدہ میری محبوبہ اور ہونے والی بیوی ہے''۔ میں نے کہا۔

''محبوبہ بھی بیوی بھی..... تُو اِن دن''۔ تھانیدار تیجا نے بڑے تمسخرانہ انداز میں یہ جملہ کہا۔

''خبردار، اپنے غلیظ منہ سے میری بیٹی کا نام لیا''۔ نصیر شاہ غصہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک پاکیزہ کردار کی حامل لڑکی ہے۔ ارے ہم بھلا کیوں ایک لفنگے، چور ڈاکو اور گھٹیا انسان سے اپنی بیٹی بیاہیں گے؟''

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے شاہ صاحب؟'' میں نے صدمے سے بھری آواز میں کہا۔ ''کیا میں آپ کا ہونے والا داماد نہیں ہوں؟''

''ارے تُو پاگل تو نہیں ہو گیا کیا؟'' نصیر شاہ نے کہا۔ ''یہ کیا ڈرامہ کر رہا ہے اور اول فول بک رہا ہے''۔

''آپ فکر نہ کریں شاہ صاحب!'' تیجا رام نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کا دماغ ایسا درست کروں گا کہ پھر کبھی آپ کی بیٹی کا نام نہیں لے گا۔ ارے یہ پورا خاندان نوسرباز، چور، ڈکیت ہے''۔

''کیا مطلب؟'' ساجدہ نے چونک کر کہا۔

''ارے بیٹی! مجھے تو موسیٰ خان نے ان کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بڑی لمبی چوڑی تفصیل بتائی ہے''۔ تیجا رام نے کہا۔ ''اور تو اور اس کا مولوی باپ جو مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتا ہے، وہ پس پردہ بذات خود چوروں ڈکیتوں کا بہت بڑا سہولت کار ہے۔ میری ابتدائی انکوائری کے مطابق یہ اپنے گروہ سے تعلق رکھنے والے وارداتیوں سے چوری شدہ مال متاع لے کر ایک مخصوص چوری کا مال خریدنے والے کو بیچتا ہے''۔

میں نے ابا کے بارے میں یہ بات سنی تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکا۔

''خبردار! جو میرے باپ کے بارے کچھ الٹا سیدھا کہا''۔ میں نے گالی دے کر کہا۔ ''میرا باپ ایک شریف النفس، صوم وصلوٰۃ کا پابند امام مسجد ہے''۔

''میں نے تیری تسلی کے لئے ہر اس شخص کو تھانہ بلانا ہے جس کو میں تیرا اور موسیٰ خان کا شریکِ جرم سمجھتا ہوں''۔ انسپکٹر تیجا میرے نزدیک آیا اس نے میرے کان مروڑتے ہوئے کہا اور وہ تیرے سامنے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ تُو عادی مجرم ہے۔ تُو نے لاتعداد ڈکیتیاں، چوریاں اور نوسربازیاں کی ہیں اور تُو جسے چاہے بلالے میں تجھے بہت وقت تیری دلی تسلی کے لئے دوں گا۔ میرے پاس تیرے خلاف درجنوں گواہ اور ثبوت ہیں۔ بتا تیری تسلی کے لئے کس کس کو بلاؤں؟ میں نے فی الحال تیرے شریک جرائم ابا مولوی اسمٰعیل کو بلوایا ہے''۔

''شیدے! کیا تُو نے مجھے موسیٰ خان کا پستول نہیں دیا تھا؟'' میں نے شیدے کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تھانیدار تیجا صاحب کو بتا کہ میں کیا نصیر شاہ کا ہونے والا داماد نہیں ہوں؟''

''میں تیرے کسی بھی سوال کو سمجھ نہیں پا رہا''۔ اس نے ابا کو اپنے پاؤں سے بڑی بے رحمی سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''تُو کیا چاہتا ہے۔ میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ تُو میرا بچپن کا کلاس فیلو ضرور ہے لیکن یہ تُو کیا پاگلوں کی طرح مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں، وہ جانتا ہوں، ہاں میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ تُو سکول کے زمانہ ہی سے آوارہ ذہن، معصوم لڑکیوں کو ورغلا پھسلا کر ان کی نہ صرف عزتوں سے کھلواڑ کرتا رہا ہے بلکہ ان سے مال بھی اینٹھتا رہا ہے۔ یہ نصیر شاہ، موہن داس، فریدہ کون ہیں مجھے کیا علم۔ مجھے بھلا موسیٰ خان ڈکیت، قاتل کا پستول رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''شیدے! اتنا بے دید، مطلب پرست نہ بن''۔ میں نے عاجزی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ میں تیرا بچپن کا جگری یار ہوں''۔

شیدا ابا کو ایک زوردار لات مار کر میرے قریب آیا اس نے مجھے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''میں ایک ایماندار سرکاری ملازم ہوں، میں تجھ جیسے ڈکیت، چور وارداتی ذہن رکھنے والے شخص کے سایہ کے قریب بھی نہیں پھٹکتا''۔

''ارے یہ انسپکٹر موہن داس کو بھی اپنے گناہوں میں رگید رہا ہے''۔ تیجا رام نے کہا۔ ''یہ کہتا ہے کہ اس نے مجھے سونے کا ہار صراف جھنڈر رام کو فروخت کرنے کے لئے دیا تھا''۔

''اسے بلاؤ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں موہن داس ہی نے مجھے یہ ہار دیا تھا''۔ میں نے کہا۔

''موہن داس آنے والا ہے''۔ تیجا رام نے کہا۔ ''اسے میں نے سپاہیوں کو بھیج کر بلایا ہے''۔

ابا کو شیدا اور ایک سپاہی گھونسے مارے جا رہے تھے۔ وہ بیچارے تکلیف سے کراہ رہے تھے۔

''کم بختو! میں بے قصور ہوں۔ شیدے! میں تیرا استاد باپ کی جگہ ہوں، میں نے تجھ قرآن پڑھایا

ہے''۔ وہ منت سماجت کر رہے تھے۔

شیدا اپنی کمینگی کا آخری حد تک مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں بُری طرح پیٹ رہا تھا۔

''بکواس بند کر بڈھے!'' شیدے نے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔ ''چوروں، ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرنے والے، خبردار تجھ خبیث نے اپنے آپ کو میرے باپ کے برابر کہا''۔

پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑے سپاہی سے ڈنڈا لے کر ابا کی کمر میں زور سے مارتے ہوئے کہا۔ ''ارے اس حرامی چوروں کے باپ کو اس طرح مارتے ہیں۔ تجھے تو ڈنڈا چلانا بھی نہیں آتا''۔

شیدا بجلی کی مانند ان کی بوڑھی کمر پر ڈنڈے کی ضربات لگانے لگا۔ اس دوران اے ایس آئی موہن داس تھانہ کے چند سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ اس نے تھانیدار تیجا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک چوری کی واردات کی انکوائری میں وقوعہ پر گیا ہوا تھا۔ آپ کے آدمی مجھے بلا کر لائے ہیں، خیر تو ہے؟''

اس ڈکیت، چور، نوسر باز کو جانتے ہو؟'' تیجا رام نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔

''ارے یہ تو مشہور ڈکیت موسیٰ خان گروپ کا بڑا اہم کارندہ عبدالرحمان ہے''۔ موہن داس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ سامنے اس کا بڈھا دھاڑیل بدمعاش باپ اس کی تو مجھے بہت عرصہ سے تلاش تھی۔ ایک آدھ دفعہ میں نے اسے تھانہ میں ایک واردات کی تفتیش کے لئے بلوایا تھا لیکن اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا تھا۔ ہاں تو مجھے کیوں بلوایا گیا ہے؟''

''موہن داس جی! یہ کہہ رہا ہے کہ موہن داس اس کا دوست ہے''۔ انسپکٹر تیجا رام نے کہا۔ ''اور تم ہی نے اسے جھندر رام کو سونے کا ہار فروخت کرنے کے لئے دیا تھا''۔

''یہ کیا بکواس ہے، یہ اپنے جرائم سے بچنے کے لئے ناٹک کر رہا ہے''۔ موہن داس نے مجھ سے لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تیجا صاحب! آپ مجھے نہیں جانتے، میں نے کتنی ایمانداری سے پولیس کی وردی کا احترام کیا ہے۔ بھگوان گواہ ہے میں نے آج تک اپنے بچوں کو ایک دھیلہ بھی گھوس (رشوت) کا نہیں کھلایا، یہ جھوٹ کہہ رہا ہے''۔

مختصر یہ کہ اے ایس آئی موہن داس نہ صرف مجھ سے اپنی جان پہچان اور دوستی سے مکر گیا بلکہ اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے مجھے سونے کا ہار دیا تھا۔

''اتنے ظالم، بے رحم نہ بنو''۔ میں نے دیوانوں کی طرح چلا چلا کر کہا۔ ''میں تمہارا اور شیدے کا پرانا ہم نوالہ ہم پیالہ یار ہوں''۔ لیکن میری آہوں، التجاؤں کا تھانہ میں موجود کسی پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔

''اچھا میں تجھ سے چند مزید باتیں کروں گا تُو ابھی تھانہ ہی میں بیٹھ''۔ انسپکٹر تیجا نے موہن داس کو حکمیہ انداز میں کہا۔ اس دوران جھندر رام اور صرافہ یونین کا صدر کلیام جی تھانہ میں

جھندر رام اور کلیام جی کو تھانیدار تیجا نے بڑی عزت سے بٹھایا۔ کلیام جی صراف یونین کا بڑا کاروباری شخص تھا اور برٹش حکومت کا پسندیدہ رسوخ والا شخص تھا۔ کلیام جی نے تیجا تھانیدار کو بتایا کہ میری دکان جھندر رام سنار کی بغل میں ہے، میں اکثر اس کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ یہ شخص عبدالرحمان اپنے اس بڈھے باپ کے ساتھ اکثر ہماری دکانوں میں آ کر زیورات فروخت کرتے ہیں اور یہ عبدالرحمان چند روز پہلے سائیکل پر بیٹھ کر آیا تھا۔ اس نے اسے سونے کے چند سیٹ اور نگینے فروخت کے لئے دیئے تھے۔ یہ میرے پاس بھی آئے تھے۔ جھندر رام نے تھانہ میں سونے کے سیٹ دکھائے جنہیں دیکھتے ہی نصیر شاہ اور ساجدہ بیک وقت بولے۔

''اوہو یہ تو ہمارے سیٹ ہیں''۔ ساجدہ نے اپنا سینہ پیٹتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بسورتے ہوئے کہا۔ ارے اس کمینے نے تو اسے تو زمروڑ کر رکھ دیا ہے''۔

''جو چیز ہماری غرضی کی تھی وہ ہم نے رکھ لی۔ باقی اس کے حوالے کر دی''۔ جمندر رام بولا۔

تھانیدار تیجا کو کلیام جی نے کہا کہ ہم لوگ صرف گاہک اور مال کو دیکھتے ہیں۔ مال چوری کا ہے یا مالک کا ہمیں تو صرف مال سے غرض ہوتی ہے۔ بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں میں اس بڈھے کی سفید داڑھی کی وجہ سے کئی بار دھوکہ میں آیا ہوں۔ اس مولوی اور اس کے بیٹے نے ہمیں بعض دفعہ ان زیورات کی جعلی رسیدیں بھی دکھائی تھیں''۔

ابا نے ان دونوں کو لعن طعن کرنا شروع کر دی۔

''بڈھے! اپنی زبان کو لگام دے''۔ تھانیدار تیجا نے ابا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں بڑے نامی گرامی صراف ہیں۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ تُو نے تو پچھلے تفتیشی آفیسر تیلم کمار کو یہ بیان دیا تھا کہ تُو سائیکل چلانا نہیں جانتا۔ ابے یہ کیا کہانی ہے؟ دوسرے موسیٰ خان کی لاش کے قریب سے ایک بائیسکل بھی ملی ہے جس پر یقیناً تُو بیٹھ کر آیا تھا''۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

''بچو! میرے پاس تیرے خلاف کم از کم درجن گواہ ثبوت موجود ہیں جو تجھے سیدھا پھانسی کے پھندے تک لے جائیں گے''۔ تیجا رام نے کہا۔ ''اب تجھے وہی لوگ موت کے گڑھے کی طرف لے کر جائیں گے جنہوں نے تجھے پچھلی دفعہ پھانسی سے بچایا تھا۔ تین چار تو یہیں بیٹھے ہیں اور تُو اور موسیٰ خان نے میرے سامنے یہ بات قبول کی ہے کہ یہ دونوں باپ بیٹا میرے دیرینہ ساتھی تھے، میرے پاس اس کا تحریری بیان موجود ہے جس پر اس کا انگوٹھا لگا ہوا ہے''۔

''شیدے! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی تُو میرا بچپن کا جگری دوست ہوتے ہوئے مجھے سانپ بن کر ڈس رہا ہے''۔ میں نے شیدے سے شکوہ کیا۔

''اس ناخلف نے مجھ استاد کا بھی خیال احترام نہیں کیا۔ خدا اس پر اپنی لعنت برسائے گا''۔ ابا نے درد کی شدت بھری آواز میں جب یہ جملے بولے تو شیدے نے انہیں ایک زوردار لات مار کر کہا۔

''اپنی بکواس بند رکھ بڈھے!'' پھر میرے قریب آ کر بولا۔

''سانپ تو تُو نے یونس کی شکل میں پالا ہوا تھا۔ اس کی دوستی اور اس کی آوارہ بہن کومل کے عشق کے اژدھوں نے تجھے ڈسا ہے۔ تُو نے ہمیشہ اس کو مجھ پر ترجیح دی اور تُو نے اپنی بہن شاہدہ کے رشتہ کے لئے مجھے ٹھکرایا۔ تیری انہی حرکتوں کی چنگاریوں نے میرے دل و دماغ میں بہت بڑا دہکتا ہوا الاؤ پیدا کر دیا ہے۔ اب تجھے اس الاؤ میں جھلسنا پڑے گا کیونکہ یہ الاؤ تیرا ہی دہکایا ہوا ہے''۔

''ارے یہ اور اس کا باپ لاکھوں کی حویلیوں کے خواب دیکھ رہے ہیں''۔

انسپکٹر تیجا نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے اور بکری کی طرح پتلی آواز میں مجھے کہا۔ ''عبدالرحمان تیرے خلاف اتنے بھیانک الزامات ہیں کہ جن کو سن کر لازماً تیرے کندھوں پر چڑھے فرشتے بھاگ گئے ہوں گے''۔ اس نے میرے منہ میں ڈنڈا پھنساتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ننھے سے دماغ کو سوچوں کے گرداب میں گھما گھما کر خواہ مخواہ اذیت نہ دے۔ بس ذہنی طور پر پھانسی پر لٹکنے کے لئے تیار ہو جا۔ میں تو کہتا ہوں تجھے مرنے میں صرف چار پانچ منٹ لگیں گے''۔

''بکواس بند کرو''۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ''میں اپنے اوپر آئے کسی الزام کو مرتے دم تک تسلیم نہیں کروں گا''۔

''اچھا تیری مرضی''۔ انسپکٹر تیجا نے طنزیہ ہنسی ہنستے

ے کہا۔ ''چند روز بعد میں جب تیرا اور تیرے باپ کا
انی ریمانڈ لوں گا تو تیری نس نس تیرے ماضی کے
لے لرتوتوں کا کچا چٹھا بیان کرے گی۔ یقیناً وہ وقت
ے باپ کی بوڑھی ہڈیوں کے لئے بہت تکلیف دہ ہو

''اس سے جو پستول برآمد ہوئی ہے اس سے
دنوں ایک خونی ڈکیتی کے دوران ایک غریب
ار کا قتل ہوا ہے''۔ موہن داس نے کہا۔ ''میرے
ینی گواہ موجود ہیں''۔

''اوہو، یہ تو اس کے خلاف نیا کھاتہ کھل گیا ہے۔
یں دو دو قتل، ہوسکتا ہے یہ جسمانی ریمانڈ میں کوئی
طون بھی قبول کرلے''۔

ساجدہ نے تھانیدار تیجا سے پوچھا کہ ہمارے
ا حکم ہے۔

''آپ لوگ جائیں''۔ اس نے نصیر شاہ سے کہا۔
ی نے چاہا تو آپ کے چوری شدہ زیورات،
ہ وغیرہ مل جائیں گے۔ آپ کا رشتہ دار ڈکیت
ے قابو میں ہے بلکہ یہ ڈکیت سے بھی بڑھ کر قاتل
رناک مجرم ہے''۔

''اس کی بہن بدقسمتی سے ہماری بھاوج ہے''
ے نے بڑی طنزیہ نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔
ی بڑی چنڈال اور اکڑو ہے، ہم تو پھنس گئے

''ساجدہ بیٹی! تم نے خدا کو جان دینی ہے، میری
ب شریف النفس تابعدار بچی ہے''۔ ابا نے ساجدہ
پ کر کے کہا۔

''بڈھے! جیسا تُو ہے میرا دل کرتا ہے تیری بیٹی
ا پکڑ کر اپنے ڈیرے سے باہر نکال دوں''۔ نصیر
ے بڑے دل دکھانے والے انداز میں کہا۔

''اگر آپ لوگوں کو مجھ یا میرے باپ سے کوئی
ناراضگی ہے تو ہم سے اس کا شکوہ کرو۔ ہماری
بہن کو اس معاملہ میں کیوں رگید رہے ہو؟'' میں نے بھڑک کر کہا۔ ''شاہ صاحب ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''کیا بگاڑا ہے؟'' نصیر شاہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ارے تم لوگوں نے ہمارے گھر کا سکون برباد کر دیا ہے، یہی نہیں ہمیں اپنا چہرہ کچھ دکھایا اور نکلے تم کچھ اور ہی''۔

''میں بے قصور ہوں''۔ میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں کہا۔ ''آپ لوگ میرے بارے میں غلط سوچ رہے ہیں۔ فریدہ میری چاہت اور میری زندگی ہے''۔

''بکواس بند کر اوئے!'' نصیر شاہ نے بھڑک کر کہا۔ ''تھانیدار صاحب! مجھے پستول دیں میں ذرا اس پاپی کی ناپاک زبان بند کروں''۔

''شاہ صاحب! آپ اپنے جذبات اور غصہ کو قابو میں رکھیں اور قانون اپنے ہاتھوں میں نہ لیں''۔ تیجا رام نے کہا۔ ''اسے تو لازماً عدالت پھانسی کا جھولا جھلائے گی اور یہ مولوی بھی جیل کی سلاخوں میں سڑے گا''۔

''میرے نیک، صوم وصلوٰۃ کے پابند باپ کو کچھ نہ کہنا۔ میں تمہارا خون پی لوں گا''۔ میں نے غصے سے مغلوب ہو کر کہا۔

''تھانہ میں پولیس والوں کو دھمکی دیتا ہے''۔ تھانیدار تیجا نے مجھے مکے مارتے ہوئے کہا۔ ''یہ تیرے خلاف ایک نیا کیس ہے''۔

تھانیدار تیجا نے دونوں ساروں اور نصیر شاہ کی تمام فیملی کو واپس بھیج دیا۔ اب تھانہ میں شیدا، انسپکٹر تیجا رام، اے ایس آئی موہن داس اور ہم باپ بیٹا رہ گئے۔

''تیری آنکھوں میں سور کا بال کیوں آ گیا ہے؟'' میں نے شیدے کو کہا۔ ''کچھ تو دوستی کا خیال کر''۔

''اوئے ہم پولیس والے کسی کے دوست نہیں

ہوتے"۔ شیدا کمینگی کی حدوں کو کراس کرتے ہوئے بولا۔ "ہم ہوا کے رخ کے ساتھ اڑنے والے لوگ ہیں۔ تیرے اچھے دن ختم اور موت کی جانب بڑھتے لمحات شروع ہو گئے ہیں۔ بھول جا اپنے روشن مستقبل اور شان و شوکت والی زندگی کے خواب اور آرام سے پھانسی پر چڑھ جا۔ خس کم جہاں پاک!"

میں اپنے غصے پر قابو نہ پا سکا، میں نے دل کھول کر اسے گالیاں دیں۔ وہ ڈھیٹ بنا بے غیرتوں کی طرح میری نقلیں اتار کر میرا مذاق اڑاتا رہا۔ اے ایس آئی موہن داس اور انسپکٹر تیجا طرح طرح کے طنزیہ جملوں سے مجھے اور ابا کو کچوکے لگاتے رہے۔

اس دوران انسپکٹر تیجا میرے اور ابا کے خلاف جھوٹے سچے گواہان، ثبوت تھانہ میں لاتا رہا۔

خواہ مخواہ ایسے شاہدین، گواہ لے آیا جو یہ کہہ رہے تھے کہ میں ڈکیت، قاتل گروپ کے ساتھ تھا اور میں نے چوکیدار کا قتل کیا ہے۔ میری حیثیت ان کم بختوں نے ایسی کر دی تھی جیسے کہ میں کوئی بے بس، کمزور بکری ہوں جو خونی درندوں، شیروں کی کچھار میں آ گئی ہوں۔ مجھے جن دوستوں پر مان تھا وہی مجھے موت کے گڑھے میں دھکیلنے پر تلے ہوئے تھے۔ اب میری آخری امید فریدہ تھی، مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میرے خلاف اٹھنے والی موت کی آندھی کے خلاف ڈھال بنے گی۔ میں نے تھانیدار تیجا کو چیخ چیخ کر کہا۔ میں فریدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔

"ارے وہ تو خود تیرے خون کی پیاسی ہوئی ہے"۔ اس نے کہا۔ "وہی تو تجھے پھانسی کے پھندے پر جھولتے دیکھنے کی تمنائی ہے"۔

"یہ جھوٹ ہے"۔ میں نے کہا۔ "تم سب کمینے مطلبی ہو سکتے ہو، میری فریدہ کسی قیمت پر مجھ سے دھوکا، بے وفائی نہیں کر سکتی"۔

"تیری تسلی کے لئے میں کل صبح ہی اسے تھانے بلواؤں گا"۔ انسپکٹر تیجا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تُو اس سے گھنٹوں بات کرنا اور دیکھنا اس کے دل میں تیرے لئے کتنی محبت ہے"۔

شیدا، موہن داس اور تھانیدار بھنا ہوا مرغ کھاتے اور شراب پیتے ہوئے قہقہے لگانے لگے۔

"چل بے بڈھے بتا تُو موسیٰ خان، کومل اور چوکیدار کے قتلوں اور دیگر واردات کے بارے میں کیا کیا جانتا ہے؟" تیجا رام نے مرغ کھاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے مجھے کچھ نہیں پتا"۔ ابا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم تینوں کمینے اور لالچی انسان ہو۔ تم پیسوں کے پجاری ہو"۔

"ہاں، یہ تُو ٹھیک کہہ رہا ہے بڈھے!" انسپکٹر تیجا نے ابا کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"تُو نے مجھ سے ہزاروں روپے کھائے ہیں"۔ میں نے چلا کر کہا۔

"ابے اگر کھائے ہیں تو اسے ثابت کر"۔

"میرے پاس عدالت سے کومل کے قتل کے مقدمہ سے بریت کا (No Proceeding) سرٹیفکیٹ ہے" میں نے کہا۔

"میری اس بات پر تینوں دوبارہ قہقہہ مارتے ہوئے ہنسے۔

"ابے وہ عارضی اور بیکار عدالتی کاغذ تھا"۔ شیدا اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے بولا۔ "اس پر رکھ کر پکوڑے کھا"۔

میں نے حوالات کی سلاخوں کو پکڑ کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے انہیں گالیاں اور کوسنے دینے شروع کر دیئے۔

"کل صبح تیری سابقہ پریمیکا آئے گی"۔ شیدے نے کہا۔ "کچھ گالیاں اور کوسنے اس کے لئے بچا کر

رکھ۔ آج سے زیادہ کل صبح تجھے پاگل پنے کا دورہ پڑے گا''۔

وہ دونوں تھانہ میں رات گئے تک رہنے کے بعد چلے گئے۔ ابا کو مجھ سے علیحدہ سیل میں رکھا گیا۔ ان سے میرا رابطہ کٹ گیا تھا۔

☆☆☆

تھانے میں گزرنے والی وہ پہلی رات کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ میرے دل و دماغ میں بے ربط سوالات، اندیشوں، امیدوں اور پریشانیوں کا طوفان مچا ہوا تھا کہ میں کس طرح اپنے سر آئے دو قتل، ڈکیتی اور نوسر بازیوں کے جھوٹے سچے مقدمات کا مقابلہ کر پاؤں گا۔ مجھے اپنے سے زیادہ فکر بوڑھے بے قصور ابا کی تھی۔ وہ بیچارے گیہوں میں گھن کی مانند پس گئے تھے۔ دراصل انسپکٹر تیجا کا ابا کو گرفتار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے بچانے والی تمام مشینری کو جام کرنا چاہتا تھا۔ ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ میرے خلاف نصیر شاہ، انسپکٹر تیجا، شیدا، اے ایس آئی موہن داس سب ایک ہو گئے تھے۔

فریدہ کا ردعمل کیا ہوگا، یہ سوال میرے لئے شش و پنج کا باعث تھا۔ مجھے فریدہ کی آخری آس تھی کیونکہ وہ میرے دفاع میں ہر جگہ آہنی دیوار بن کر کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے حوالات کی سلاخوں میں رات کانٹوں پر ننگے بدن جاگ کر گزری صبح تڑکے مجھے اور ابا کو حوالات میں ناشتہ کروایا گیا۔ ناشتہ کیا تھا، کالی چائے اور سوکھی روٹی۔ مجھے اپنی حالت کو دیکھ کر رونا آ رہا تھا۔ ابا سامنے والی حوالات میں مجھے نظر آ رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا دل پھٹنے کو آ رہا تھا۔

''اللہ میرے حق میں بہتری کر، میری خطائیں معاف کر دے۔ تُو بڑا غفور الرحیم ہے''۔ اسی قسم کی دعائیں التجائیں فطری طور پر میرے دل سے نکل رہی تھیں۔ انسپکٹر تیجا تقریباً آٹھ بجے میرے پاس اپنی وردی میں تیار ہو کر آیا۔

''تجھے اپنی پریمیکا پر بڑا مان ہے نا؟'' اس نے اپنی مخصوص پتلی آواز میں کہا۔ ''وہ تیری تسلی کے لئے آ رہی ہے۔ تُو خود دیکھ لے گا کہ وہ اب تجھ سے کتنا پریم کا جذبہ رکھتی ہے''۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے فریدہ اور اس کی پرانی سہیلی شگفتہ تھانہ آئے۔ فریدہ کو دیکھ کر میں چہک اٹھا۔

''فریدہ! دیکھو میرے ساتھ سب نے کتنا بڑا دھوکہ کیا ہے''۔ میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''اس مشکل وقت میں تم تو میرا ساتھ دو گی نا؟ تم دوسروں کی طرح مجھے دھوکا تو نہیں دو گی؟''

''تم ہو ہی اس قابل''۔ اس نے بے رخی سے کہا۔ ''تمہیں جیل کی سلاخوں کی زینت بنانے کے منصوبے میں اوروں کے ساتھ میں برابر کی شریک ہوں''۔

''یہ نہیں ہو سکتا فریدہ!'' میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتی، تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟''

''عبدالرحمان! تم نے مجھے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر کئی بار دھوکے دیئے''۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''میرا کیا حق نہیں کہ میں بھی تمہیں صرف ایک بار دھوکہ دوں جس کے واقعی تم قابل ہو۔ تم نے میرے دل، اعتماد، قربانیوں کے ساتھ کھلواڑ کیا''۔

''ایسا نہ کہو فریدہ!'' میں نے گھبرا کے اس سے کہا۔ ''خدا کی قسم میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا''۔

''عبدالرحمان! تم جھوٹے مکار اور نوسر باز ہو''۔ فریدہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہارے بارے سب کچھ پتا چل گیا ہے۔ میں نے تمہارا اصل مکروہ چہرہ دیکھ لیا ہے۔

''لگتا ہے، تم ہوش میں نہیں ہو''۔ میں نے

پریشان ہو کر کہا۔ ''اپنی خرابی کے اثرات تمہارے اندر موجود ہیں۔ یہ تم میرے بارے میں سراسر غلط سوچ رہی ہو''۔

''اب تو مجھے ہوش آیا ہے''۔ فریدہ نے مجھے سرخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھ سے جھوٹی محبت کا فریب کر کے مجھ سے نہ صرف دولت سمیٹی، مجھ سے وقت گزاری کی، مجھ سے کئی حسین لڑکیاں بیک وقت تمہاری زندگی میں تھیں کومل، زینب، حمیدہ''۔ تین چار کے اس نے نام لئے واقعی ایک آدھ کو میں نے اپنی دل پشوری کے لئے خطوط لکھے تھے۔ فریدہ نے مجھ سے کہا۔

''تم اؤ یہ لڑکیاں اس وقت تمہاری محبوبائیں نہیں تھیں۔ جب تم مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتے تھے''۔ فریدہ نے کہا۔ ''کومل کو تم نے موسیٰ خان کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے۔ زینب تجھے ٹھکرا کر بھاگ گئی۔ حمیدہ تیری عارضی محبوبہ تھی۔ تیرے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط شگفتہ نے مجھے دکھائے ہیں''۔

''فریدہ! میں تمہیں کیسے اپنا دل چیر کر دکھاؤں کہ میں نے اپنے ماضی سے توبہ کر لی ہے۔ میں نے اپنے دل سے سچا وعدہ کیا ہے کہ تم سے شادی کے بعد ایک خوبصورت وفادار زندگی گزاروں گا''۔

''عبدالرحمان! میرے اعتماد کا شیشہ تمہاری طرف سے ٹوٹ گیا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''یہ جڑ بھی جائے تو اس میں سے بداعتمادی کا بال نہیں جائے گا۔ تم اگر جلتے توے پر بھی بیٹھ کر کہو تو میں ہرگز تم پر اعتماد نہیں کروں گی''۔

''شگفتہ تم ہی اپنی سہیلی کو سمجھاؤ''۔ میں نے شگفتہ سے کہا۔

شگفتہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ایک سفید ان سلا کپڑا میری جانب حقارت سے پھینکا۔

''یہ تیری شادی کا جوڑا میں نے پسند کیا ہے''۔ شگفتہ نے بڑے غصہ سے مجھے کہا۔ ''یہ کفن تُو اپنی شادی میں پہنے گا۔ عبدالرحمان! تُو نے تو فریدہ کو اپنی جھوٹی محبت کا شاک لگا کر اسے پورا پاگل ہی بنا دیا تھا۔ شکر ہے اسے وقت سے پہلے تیرا اصل کالا کردار نظر آ گیا۔ یہی نہیں اس کا پورا خاندان پریشانی کی سولی پر چڑھا رہا''۔

''فریدہ میں بھٹک گیا تھا''۔ میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''میں بھی جوانی کے نشے میں تمہارے لئے بھٹک گئی تھی لیکن شکر ہے مجھے وقت سے پہلے تمہاری حقیقت کو دیکھ کر ہوش آ گیا۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو میں ایک خواب کی مانند لوں گی۔ رات کو نیند کی مدہوشی میں اچھے بُرے خواب تو آتے ہیں۔ صبح انسان انہیں بھول جاتا ہے''۔

''فریدہ! میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں''۔ میں فریدہ کے قدموں میں بیٹھ گیا اور روتے ہوئے کہا۔ ''تم اس وقت نفرت کے الاؤ میں جل رہی ہو''۔ فریدہ نے اپنے پیروں دور ہٹاتے ہوئے کہا۔

''عبدالرحمان! میرے دل میں تمہاری بے وفائی کے بھڑکتے ہوئے الاؤ کی شدت کبھی کم نہ ہو گی۔ اس تپش میں اب ساری زندگی جلوں گی۔ میں نے اپنے دل کے اندر بسی تمہاری محبت کا گلا گھونٹ دیا ہے''۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''عبدالرحمان! مجھے تم سے آخری حد تک نفرت ہے''۔

پھر اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ میں لرز کر سہم گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے وجود پر میرے حسین مستقبل کے خواب کی عمارت کا ملبہ مجھ پر گر پڑا ہو۔

''فریدہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں''۔ میں پاگلوں کی طرح فلک شگاف آواز میں چلانے لگا۔ ''خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو، رک جاؤ''۔

مگر وہ نہ رکی اور میرا دل تڑپا کر چلی گئی۔

تھانیدار تیجا میرے قریب آیا اور اس نے میرے چہرے پر پڑے فریدہ کے تھوک کو ملتے ہوئے کہا۔ ''لے مل لے اپنی پریمیکا کی محبت کا پوتر جل۔ اس کی نفرت کا ثبوت..... ارے اب تیرے لئے موت کے سوا اور کون سا راستہ رہ گیا ہے؟ زیادہ نہ سوچ روز روز کی ذہنی پریشانی کوفت، جگ ہنسائی، ذلت سے بچنے کے لئے صرف چار منٹ موت کی اذیت سہہ لے اور ویسے بھی اب تجھے کوئی بھی پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکتا''۔

صبح ہوتے ہی موہن داس اور شیدا دونوں اکٹھے تھانے میں آئے۔

''ہاں بھئی ہو گئی تیری پریمیکا فریدہ سے تسلی؟'' شیدے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس نے تجھے کیا کہا؟ بڑی پریم بھری باتیں کی ہوں گی اس نے''۔

انسپکٹر تیجا نے ہنستے ہوئے انہیں کہا کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھو۔

موہن داس بولا۔ ''ہاں بھئی اسے دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے زنخوں کی طرح آنسو بہا رہا ہو''۔

''ارے نہیں یہ اس کے چہرے پر آنسو نہیں، فریدہ کا تھوک ہے جو اس نے آج صبح اس کے منہ پر پھینکا ہے''۔ وہ تینوں میرا دل جلاتے ہوئے جملے مجھے سناتے ہوئے میرا مذاق اڑانے لگے۔

میری حالت سکتہ، پریشانی کے عالم میں بالکل نیم مردہ سی ہو گئی تھی میں ان کی باتیں برداشت کرتا رہا۔ فریدہ کے منفی رویے کی وجہ سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ مجھے ہر طرف اپنی موت منڈلاتی اپنی جانب کھینچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح حوالات کی سلاخوں میں بے بس ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے پاس نہ تو اتنا روپیہ تھا کہ میں اپنی وکالت کے لئے کوئی اچھا وکیل کروں۔ انسپکٹر تیجا نے مجھے 14 چھوٹے بڑے الزامات میں ملوث کر دیا تھا۔ کومل، ملو چوکیدار مجھ پر ایک کسی نامعلوم کا قتل، موسیٰ خان کو جیل سے بھگانے میں معاونت، اس کا مختلف وارداتوں میں ساتھ دینا، ناجائز اسلحہ، چوریاں، ڈکیتیاں۔ اس نے میرے خلاف لاتعداد جھوٹے سچے گواہ اکٹھے کر لئے تھے۔ اس نے ان سے میری اور ابا کی شناخت پریڈ بھی کروائی۔ انہوں نے ہم دونوں کی تصدیق، تائید کروائی۔ مجھے عدالت میں جھوٹی گواہیاں اور ضمانتیں دینے کے الزامات بھی لگائے گئے۔ یہ کام بھی اے ایس آئی موہن داس اور شیدے نے مجھ سے کروائے تھے۔

الغرض ہر لحاظ سے مجھے کیسوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ مجھ سے ابا کا مکمل طور پر رابطہ نہ ہونے دیا جا رہا تھا۔

چار روز بعد انسپکٹر تیجا نے ایک طویل ایف آئی آر بنا کر ہمیں متعلقہ کورٹ میں جسمانی ریمانڈ کے لئے پیش کیا گیا۔ متعلقہ جج نے ہمارے خلاف طویل الزامات کی فہرست مع ثبوتوں گواہوں کی دیکھتے ہی پولیس کو ہم دونوں کا چودہ روزہ جسمانی ریمانڈ دے دیا اور بدقسمتی سے انکوائری آفیسر تیلم کمار کو یہ کیس دے دیا۔ وہ پہلے ہی میری کومل کے قتل کے سلسلہ میں ضمانت پر بریت کی وجہ سے جھلسا کڑھا بیٹھا تھا۔

انسپکٹر تیلم کمار نے مجھے اور ابا کو دل کھول کر تشدد، اذیت کا شکار بنایا۔ میں تو اس کی مار اور تشدد حوصلہ سے برداشت کر رہا تھا لیکن ابا کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ انسپکٹر تیلم کمار انہیں بالکل جوانوں والی بے رحمانہ مار مار رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر جل سے نکلی مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔

''میں تیرے باپ کو ایک شرط پر تشدد کا نشانہ نہیں بناؤں گا''۔ تیلم کمار نے میرے آگے شرط رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تو مجھے سچ سچ سب وارداتوں کی تفصیل بتا

دے"۔

میں نے بالآخر ہمت ہار دی، مجھے ایک طرف ابا کی حالت کا خیال آیا تو دوسری طرف میں نے سوچا کہ اب میری زندگی میں کیا لذت اور سکون رہ گیا ہے سب کچھ تو ختم ہو گیا ہے۔ اچھا چلتا ہوا کاروبار، روپیہ پیسہ، عزت فریدہ جو میری محبت تھی وہ بھی مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی وہ گہرے دوست شیدا اور موہن داس جن پر مجھے مان تھا، وہ بھی مجھ سے حسد کرنے لگے تھے۔ وہ لالچ میں آ گئے اور انہوں نے مجھ سے آنکھیں بدل لیں۔ نصیر شاہ نے جب یہ دیکھا کہ اس کی بیٹی ٹھیک ہو گئی ہے اور میں نے اس کا سکون برباد کیا ہے، اس نے بھی مجھے بے کار لنگڑے گھوڑے کی مانند مارنے کا پروگرام بنایا۔

"کب اور کیسے میرے خلاف میرے اپنے یہ دونوں دوست نصیر شاہ، ساجدہ اور میری محبوبہ جو میری خاطر مرنے مٹنے اور اپنی جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی اور اس نے میری خاطر چوریاں کیں، وہ کس طرح میری جان کی دشمن بن کر میرے خلاف سازشی ٹولہ کا حصہ بن گئی۔

فریدہ کو لازماً میرے ان دونوں دوستوں اور اس کی سہیلی نے میرے خلاف بھڑکایا ہو گا۔ مجھے اس کا پورا یقین تھا۔ مجبوراً معاہدے کے مطابق تیلم کمار کو میں نے اپنی ان وارداتوں کے متعلق صاف صاف بتا دیا۔ کومل کے قتل میں موسیٰ خان کے ساتھ ملوث ہونا۔ اس کی پستول کا شیدے کے پاس ہونا، فریدہ سے پیسے روپے اینٹھنا، اے ایس آئی موہن داس، شیدے کے ساتھ مل کر عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں، ضمانتیں دینا وغیرہ وغیرہ لیکن میں نے چوکیدار ملو کے قتل میں ملوث ہونے سے انکار کیا۔ زیورات جو بھی فروخت کئے تھے، الغرض میں نے کئی الزامات کا اقرار اور کئی کا انکار کیا۔

انسپکٹر تیلم کمار نے اپنے وعدہ کے مطابق ابا پر تشدد بند کر دیا۔ اس نے انسپکٹر تیجا اور اپنی رپورٹوں کو ملا کر ایک طویل استغاثہ ہم باپ بیٹے کے خلاف بنایا اور متعلقہ سیشن جج کی عدالت میں پیش کر دیا۔ میرا ایک نیا بیان مجسٹریٹ کی عدالت میں دلوایا گیا۔ متعلقہ جج نے ابا کی ضمانت تو لے لی جبکہ مجھے پولیس کسٹڈی میں رکھنے کا حکم دیا کیونکہ مجھ پر لگے 9 الزامات ناقابل ضمانت اور سنگین نوعیت کے تھے۔ ابا مجھ سے کافی دن بعد ملے تھے وہ ذہنی طور پر بڑے منتشر ہو گئے تھے۔ میں نے رو رو کر ان کے پاؤں چھو کر ان سے معافی مانگی۔

"بیٹا! جو ہوا سو ہو گیا ہے"۔ انہوں نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "گیا وقت واپس نہیں آئے گا۔ میں تمہیں اس جیل کے عذاب سے نکالنے کی بھرپور کوشش کروں گا"۔

ابا نے نہ جانے کیسے کس طرح میری اور اپنے سر لگے مقدمے کی وکالت کے لئے ایک درمیانی قابلیت کے مسلمان وکیل ملک راشد کو کر لیا۔ وہ غالباً ان کے شاگرد کا بیٹا تھا۔ ملک راشد وکیل نے ہم دونوں کی بڑی محنت سے وکالت کی۔ اس نے مجھے ملو کے قتل اور 3 چھوٹے مقدمات سے اور ابا کو 6 میں سے 2 مقدمات سے بریت دلوا دی لیکن وہ مجھے کومل کے قتل، دیگر مقدمات میں عدالت کے چنگل سے نہ چھڑا سکا۔ درحقیقت اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ دراصل ہمارے حق میں کوئی بھی نصیر شاہ، موہن داس، شیدے کے خوف اور دباؤ کی وجہ سے گواہی دینے کو تیار نہ تھا۔ مجھے عدالت سے بڑی سے بڑی سزا دلوانے کے لئے شیدے اور موہن داس نے اپنا پورا زور، پیسہ لگا دیا۔ جھوٹے گواہ مہیا کئے۔

مختصر یہ کہ دولت اور اثر و رسوخ کی جیت ہوئی۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ میرے ساتھ کیا انوکھا ہوا۔ ان سب نے مل کر مجھے قانون کی شطرنج پر گھیر گھار کر بے بس کر دیا۔ عدالت نے مجھے مجموعی طور پر دو بار

سزائے موت اور 14 سال قید سنائی۔

ہم دونوں نے اپنی سزاؤں کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی وہاں بھی ہماری اپیلیں خارج کر دی گئیں متعلقہ جسٹس نے پچھلی عدالتوں کا فیصلہ بحال رکھا۔

بقول عبدالرحمان فریدہ ہائی کورٹ میں اپنے باپ کے ساتھ آئی تھی، وہ مجھ سے خصوصی طور پر عدالت کے کمرہ کے باہر ملی۔ وہ پہلے کی طرح مجھ پر شدید برہم تھی اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھ جیسے کہ ان کے اندر انگارے بھڑک رہے ہوں۔ اسے میں نے بہت سمجھانے یقین دلانے کی کوشش کی کہ فریدہ غصہ تھوک دو، تجھے میرے بارے اور میرے خاندان کے بارے میں کسی نے غلط بھڑکایا ہے لیکن میری تمام التجائیں، معافیاں اس کے سامنے صفر ہو کر رہ گئیں۔ اس نے مجھے عدالت کے باہر کہا۔

''عبدالرحمان! تمہارا دین ایمان سرف پیسہ، روپیہ ہے۔ تم نے میرے علاوہ لاتعداد لڑکیوں کو اپنی جھوٹی محبت کے چکمے دیئے ہیں۔ مالدار لڑکیوں سے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے روپیہ اینٹھا ہے۔ میں یہاں عدالت میں تمہاری رسوائی دیکھنے آئی ہوں''۔

پھر اس نے پولیس والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اتنی دولت دوں گی کہ تم اس کے لئے سونے کی بنی پھانسی کی رسّی بنواؤ پھر دولت زیور اس کی قبر میں ٹھونس دینا''۔

''اچھا اگر تمہیں میرے مرنے سے سکون ملتا ہے تو مجھے موت قبول ہے''۔ میں نے آخر میں تن بہ تقدیر ہو کر کہا۔ ''لیکن خدا کے لئے میری بہن کو اپنی نفرت کے الاؤ میں نہ جلانا۔ مجھے بے شک بھسم کر دو''۔

''نہیں نہیں وہ کیوں چین، سکون سے رہے''۔ فریدہ نے جلتے لہجے میں کہا۔ ''اسے بھی میں اپنے حساب سے سزا دوں گی''۔

''خدا کے واسطے، وہ معصوم ہے، اسے کچھ نہ کہنا''۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

نصیر شاہ نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ ''تیری بہن سے میں اپنے بھینسوں کے باڑے سے بھینسوں کا گوبر اٹھواؤں گا۔ وہ اب میری بہو نہیں نجاست اٹھانے والی بھنگن ہو گی''۔

بقول راوی کہانی ڈاکٹر اصغر عثمان: عبدالرحمان نے مجھے اپنی دکھی آپ بیتی کئی نشستوں میں سنائی۔ یہ کہانی اتنی طوالت اختیار کر گئی تھی کہ بہت سے واقعات لکھنے سے رہ گئے ہیں۔

عبدالرحمان کو ایکٹ 16 کے تحت سزا دی گئی یعنی دیگر کیسوں میں دی جانے والی سزاؤں میں سے بڑی سزا وہ سزائے موت تھی۔ اس کی سزائے موت میں چند روز رہ گئے تھے۔ دوسری جانب پولیس کا تھرڈ ڈگری تشدد سہنے، مناسب خوراک کے نہ ہونے کی وجوہات کی بنا پر وہ ٹی بی کا مریض بن چکا تھا۔ وہ میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہتا تھا کہ خدا کے واسطے میری کسی طرح فریدہ سے ملاقات کروا دوں۔ میں مرنے سے پہلے اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

میں نے جیلر بھیسال سنگھ سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کسی طرح عبدالرحمان کی فریدہ سے ملاقات کرا دیں؟ اس نے مجھے کہا کہ میں نے کئی بار نصیر شاہ کو پیغام بھیجا ہے کہ نیہ اس کی بیٹی سے چند منٹوں کے لئے ملاقات کرنا چاہتا ہے لیکن وہاں سے انکار میں جواب آتا ہے۔ میں نے بھیسال سنگھ کو کہا کہ ہو سکتا ہے یہ جواب نصیر شاہ کا ہو اور اس نے فریدہ کو اس سے ملنے کے لئے روکا ہو۔ ہمیں کسی طرح فریدہ سے ملنا چاہئے، اس سے مل کر قائل کرنا چاہئے کہ وہ چند لمحوں کے لئے عبدالرحمان سے ملے۔

جیلر نے مجھے کہا کہ تم ایک سرکاری ملازم ہو اور میں بھی، ہمیں اس سزائے موت کے قیدی کی اتنی حمایت نہیں کرنی چاہئے جس سے ہماری نوکری خطرہ

میں پڑے۔

''یہ مر رہا ہے''۔ میں نے جیلر کو کہا۔ ''انسانیت کے ناطے ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ تم نہ کرو چاہے میری نوکری جائے میں تو اس کی مدد کردوں گا''۔

''زیادہ جذباتی بے وقوفی والی باتیں نہ کرو''۔ جیلر نے کہا۔ ''میرا نہیں خیال فریدہ اس سے ملاقات کرے گی۔ آگے تمہاری مرضی ہے جو تمہارا دل کہے''۔

میں نے عبدالرحمان کی حالت کو دیکھ کر یہ اندازہ کرلیا تھا کہ طبعی نقطۂ نگاہ سے وہ چند روز کا ہی مہمان ہے یہ شاید پھانسی لگنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو جائے۔ مجھے نہ جانے اس پر کیوں ترس آ رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس کی فریدہ سے آخری ملاقات کرا دوں۔ اس طرح اس کی آخری خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا لیکن مجھے کوئی سبیل ایسی نظر نہیں آ رہی تھی کہ میں اس کی ملاقات کس طرح فریدہ سے کراؤں۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچ بچار کیا۔ اردگرد دوستوں سے مشورہ کیا۔ بالآخر میری کوشش رنگ لائی اتفاق سے مجھے فریدہ کا خالو کسی حوالہ سے ملا۔ اس سے میں نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ آپ کسی نہ کسی طریقہ سے فریدہ سے رابطہ کر کے اسے کہیں کہ وہ موت کی دہلیز پر کھڑے عبدالرحمان سے چند لمحوں کی ملاقات کرلے۔

اس کا خالو اچھی طبیعت کا بزرگ قسم کا انسان تھا، اس نے مجھ سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے عبدالرحمان کو کہا کہ تم فریدہ کے نام اپنے دل کا حال لکھو، ہو سکتا ہے اس کا دل پسیج جائے۔ عبدالرحمان نے ایک طویل درد بھرا خط لکھا۔ جس میں اس نے اس سے اپنی سچی محبت کا ذکر کرنے کے علاوہ یہ لکھا کہ عارضی طور پر بھٹک گیا تھا۔ مجھے تیری قدر آئی۔ تم مجھ سے مل لو میری خواہش ہے کہ میں مرتے وقت تمہارا چہرہ دیکھ لوں۔ تم بے شک ایک بار پھر میرے چہرے پر تھوک دینا۔ میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔

میں نے یہ خط فریدہ کے خالو کے حوالے کر دیا۔ ادھر عبدالرحمان کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں۔ موت کا فرشتہ کبھی بھی اس کی زندگی کی ڈور توڑ سکتا تھا۔

''فریدہ..... فریدہ.....!'' اس کے منہ سے بس یہی کلمات نکل رہے تھے۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے اس کی موت کے درد کو کم کرنے کے لئے مخصوص انجکشن لگا دیا۔ وہ ذرا سا سنبھلا۔ میں نے ایک چٹ پر اس کے خالو کے نام یہ لکھا کہ خدا کے واسطے فریدہ کو عبدالرحمان سے ملوا دو، یہ کبھی بھی مر سکتا ہے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد فریدہ اور عبدالرحمان کی بہن شاہدہ اکٹھے آئے۔ ان کا خالو پیچھے دور کھڑا ہو گیا۔

''لے آ گئی فریدہ!'' میں نے عبدالرحمان کو کہا تو وہ خوشی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ جبکہ بہن شاہدہ بڑے تڑپے ہوئے انداز میں اس سے لپٹ کر رونے لگی جبکہ فریدہ خاموشی سے کھڑی ہو کر اسے بغور دیکھنے لگی۔

''مرتا ہوا انسان جھوٹ نہیں بولتا فریدہ!'' عبدالرحمان نے پھولتے سانسوں کے درمیان ٹوٹے، رکتے الفاظ میں اسے کہا۔ ''تم میری سچی محبت تھی میں مانتا ہوں کہ میں نے کئی لڑکیوں سے محبت کا ڈرامہ کیا۔ کومل، زینب کے معاملہ میں بھٹک گیا تھا''۔ اس نے فریدہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے واسطے میری بہن کو میری نفرت کی وجہ سے اپنے غصہ کے الاؤ میں نہ جلانا۔ تمہارا گناہگار میں ہوں اور میں مر رہا ہوں۔ یقین کرو مجھے پھانسی پر جھولنے سے اتنی تکلیف نہ ہو گی جتنی تمہاری نفرت کے الاؤ میں جلنے سے ہو رہی ہے''۔

''تم اس حال تک اپنی غلطیوں اور لالچ کے ہاتھوں پہنچے ہو''۔ فریدہ نے اس سے کہا۔ ''میں تمہیں کسی صورت معاف نہیں کر سکتی۔ میرے دل میں تمہاری

ماضی کی محبت کی جگہ حال کی نفرت کا الاؤ دہک رہا ہے۔ یاد کرو، میں نے تمہیں ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر تم نے کبھی مجھے دھوکا دیا تو میں اس کا انتقام سود سمیت لوں گی۔ جاؤ، میں نے تمہیں اپنے انتقام کا سود معاف کیا۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہاری بہن کو کبھی دکھی نہ ہونے دوں گی۔ یہ ہمارے گھر میں باعزت بہو کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارے گی''۔

''میں تمہارا شکرگزار ہوں فریدہ!'' عبدالرحمان نے فریدہ کے پاؤں پکڑ کر کہا۔ ''تم میرے دل میں آخری سانسوں تک ہو..... کیا تم ایک مرتے ہوئے انسان کو معاف نہیں کرو گی؟''

''نہیں، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی''۔ فریدہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ ''عبدالرحمان! تم نے میرا محبت بھرا دل توڑا۔ اب اسی دل میں تمہاری نفرت کے الاؤ جل رہے ہیں۔ میرا سینہ جل رہا ہے۔ میں چاہوں بھی تو یہ تپش کم نہیں ہو سکے گی..... تم ابھی عورت کی نفرت اور اس کے انتقام سے واقف نہیں ہو''۔

''ایک بات یاد رکھو فریدہ!'' عبدالرحمان نے جاندار آواز میں کہا۔ ''ایک مرتے ہوئے انسان کو معاف نہ کر کے تم بھی نہیں رہ سکو گی''۔

فریدہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

شاہدہ اپنے بھائی کو سینے سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ دیوانہ وار اس کا منہ سر چوم رہی تھی۔ ان کی ماں نہیں تھی اور اس نے عبدالرحمان کو ماں کی طرح پرورش کیا تھا۔ اس کے ناز اٹھائے تھے۔ دونوں بہن بھائی کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں شاہدہ نے ایک ایسا انکشاف کیا کہ عبدالرحمان کے پاؤں تلے سے زمین نکلنے لگی۔

نصیر شاہ نے ساجدہ کی شادی شیدے سپاہی کے ساتھ طے کر دی تھی۔ شیدے نے یار مار کا کردار ادا کرتے ہوئے نصیر شاہ سے فریدہ کا ہاتھ مانگا تھا لیکن فریدہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ فریدہ ابھی تک عبدالرحمان کو بھول نہیں سکی تھی۔

شاہدہ نے نصیر شاہ کے گھر میں رہ کر جو دیکھا اور جو سنا اس کے مطابق اس سارے کھیل کے پیچھے شیدے کا ہاتھ تھا۔ وہ بہ ظاہر تو عبدالرحمان سے دوستی کا دم بھرتا تھا لیکن باطن میں اس سے حسد کرتا تھا۔ اسی نے فرید، کی سہیلی شگفتہ کو اپنے ساتھ ملا کر نصیر شاہ اور فریدہ کے دل و دماغ میں یہ باتیں ڈالی تھیں۔ شیدا چونکہ پولیس ملازم تھا اس لئے اس نے موہن داس کو ساتھ ملا کر عبدالرحمان کو دوستی کے پردے میں قانون کے پھندے میں پھانسنے کا پلان بنایا۔ اس کی پلاننگ اے ایس آئی موہن داس اور تیجا رام نے مل کر کی تھی اور اس میں نصیر شاہ، فریدہ اور ساجدہ کی رضامندی شامل تھی۔

شاہدہ ابھی عبدالرحمان سے مزید باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن باہر کھڑی فریدہ نے اسے سختی سے آواز دے کر باہر بلا لیا۔ شاہدہ نے عبدالرحمان کو گلے لگا کر بہت پیار کیا۔ کہا سنا معاف کرایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے آنسو بہاتی واپس چلی گئی۔

ان کے جانے کے بعد عبدالرحمان نے بڑی عاجزی سے میرا شکریہ ادا کیا کہ میری وجہ سے یہ ملاقات ممکن ہو سکی۔

''اب میں سکون سے مر سکوں گا ڈاکٹر صاحب!'' اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ''اب میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں''۔

وہ مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ میرے گھر والوں کو کہہ دیں کہ مجھے فریدہ کے گھر کے قریب جو قبرستان ہے وہاں دفن کیا جائے۔ پھر اس نے درخواست کی کہ میں کسی طرح اس کے چھوٹے بھائی رحمت کو نصیر شاہ کی ملازمت چھڑوا کے کسی اور جگہ کام پر

لگوادوں۔

عبدالرحمان نے اپنے باپ کے نام ایک خط بھی لکھا تھا جو مجھے پورا یاد نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ اس نے مولوی صاحب کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ میری قسمت میں یہ نہ تھا کہ آپ میرا نکاح پڑھاتے لیکن اب میری خواہش ہے کہ آپ مجھ بدنصیب کا جنازہ خود ہی پڑھائیں۔ اس نے اپنی غلطیوں کوتاہیوں کی معافی مانگی تھی۔

میں نے یہ خط مولوی صاحب کو پہنچا دیا تھا۔

باتیں کرتے کرتے عبدالرحمان کی حالت بگڑنے لگی اور اس کے سینے سے خرخراہٹ کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ پھر کھانسی کے ساتھ خون کے لوتھڑے آنے لگے جن میں بلغم بھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے پھیپھڑوں کے زخم کھل گئے ہیں، وہ ٹی بی کی آخری سٹیج پر تھا، اس کا سانس رک رہا تھا۔

میں نے فوری طور پر خون روکنے کے لئے ایک انجکشن لگایا اور سانس کی بحالی کے لئے آکسیجن کا انتظام کیا لیکن موت کے فرشتے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے کے حکم سے اس کی روح قبض کر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے ابل کر باہر کو نکل آئے اور اس نے ایک خراٹا نما لمبا سانس کھینچا اور بڑی مشکل سے ''فریدہ'' کہا اور بے جان ہو گیا۔

کاش! اس نے فریدہ کی بجائے ''اللہ'' کہا ہوتا۔

میں نے انا للہ وانا الیہ راجعون زیر لب پڑھا۔

اس کی موت کا منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو دیا۔ مجھے روتا دیکھ کر جیل کے سنگ دل سپاہی اور مجرم قیدی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بڑا جذباتی منظر اور سوگوار ماحول تھا۔

عبدالرحمان مرحوم کی وصیت کے مطابق اس کا جنازہ اس کے باپ نے ہی پڑھایا اور اسے فریدہ کے گھر کے نزدیک قبرستان میں دفن کیا گیا۔ جوان بیٹے کا جنازہ پڑھانے کے بعد مولوی اسمٰعیل اپنے قدموں پر کھڑے نہیں رہ سکے تھے اور انہیں دو آدمی سہارا دے کر قبرستان تک لے کر گئے تھے۔ شیدے کو عبدالرحمان کی پھانسی کی اطلاع دے دی گئی تھی اور جنازے کا وقت بھی معلوم تھا لیکن وہ سنگ دل انسان اس کے آخری دیدار اور جنازے میں شامل ہونے کے لئے نہیں آیا تھا۔

عبدالرحمان کی تدفین کے ٹھیک ایک ہفتے بعد مولوی اسمٰعیل بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ اتنا بڑا غم برداشت نہ کر سکے تھے۔

عبدالرحمان نے مرنے سے پہلے فریدہ کو ٹھیک کہا تھا کہ مجھے معاف نہ کر کے سکون سے تم بھی نہ رہ سکو گی۔ پھر یہی ہوا۔ آہستہ آہستہ فریدہ کی ذہنی حالت پھر بگڑنے لگی۔ وہ عبدالرحمان کو پکارتی، کبھی وہ اسے بلند آواز میں گالیاں دیتی اور کبھی ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگنے لگتی۔ وہ اکثر گھر سے نکل کر عبدالرحمان کی قبر پر چلی جاتی اور اس کی قبر پر پتھر مارتی یا پھر دو ہتھڑ مار مار کر اپنے ہاتھ زخمی کر لیتی۔ جب اس کی یہ کیفیت ختم ہوتی تو وہ قبر سے لپٹ کر رونے لگتی۔ وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔

شیدے نے ساجدہ سے شادی کر لی تھی اور اسے ایس آئی موہن داس نے اپنی رشوت کے طور پر عبدالرحمان کی دھرم پورے والی دکان پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ لائبریری پر شیدے نے قبضہ جما لیا تھا۔

جب تک میں زندہ ہوں عبدالرحمان کی عبرت ناک کہانی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ دنیا جائے عبرت ہے اور آنکھ والوں کے لئے عبرت ہے۔ لوگو! دوسروں کے حال سے عبرت پکڑو ورنہ دوسروں کے لئے باعث عبرت بن جاؤ گے۔

.....ختم شد.....

جگ بیتی

منزلیں اور راستے

ایک ایسے شخص کا فسانہ عبرت جو زندگی کی یکسانیت سے اکتا گیا تھا اور وہ اپنی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی چاہتا تھا۔ زندگی کی نئی لذتوں سے ہمکنار ہونے کی خواہش میں اس نے اپنی وفادار بیوی اور معصوم بیٹی کو چھوڑ دیا۔

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

سہیل، بانو کو کچھ دنوں سے غیر مانوس لگنے لگا تھا، اکتایا ہوا سا، بات بات پر الجھ پڑتا، ردِعمل کا اظہار بھی کرتا، پھر شکوہ کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اس کے رویوں میں یہ تغیر بلا جواز تھا، بانو یہی سمجھتی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ حالات کا دباؤ کارفرما رہے تو انسانی مزاج میں عارضی تبدیلیاں آ جایا کرتی ہیں جو وقت کے ساتھ رفع بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر سہیل کے برتاؤ میں گھاؤ کچھ گہرے دکھائی دیتے تھے جن کے باعث گھرانے کے شب و روز میں اداسی عود کر آئی تھی۔ گھر میں اب نہ تو خوش گپیاں ہوا کرتیں اور نہ ہی بات بات پر قہقہے برسا کرتے، صبح شام بس آہیں سنائی دیتیں۔ بانو کی نظریں سہیل کی حرکات پر جم جاتیں۔

''میں زندگی کے کٹھن راستوں سے تھک گیا ہوں''۔ ایک صبح سہیل جاگا تو بڑبڑانے لگا، سرد آہ

بھری۔ اس کا یہ رویہ اس کی عمومی عادات کے قطعی خلاف تھا۔

اس کی بیوی اس دم بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ حسب معمول دن کا آغاز تھا، بیداری کا وقت ہو چکا تھا۔ سہیل نے آہستگی سے الفاظ بار بار دہرا دیئے۔

''کیوں..... خیر ہے؟'' بانو ساعتوں پر ٹکراتے الفاظ ذہنی گرفت میں لاتے ہوئے قدرے بے خیالی میں بولی۔ سہیل واقعی کسی سوچ میں الجھ گیا تھا۔

''چند روز سے آپ روزمرہ حالات میں مجھے اچاٹ سے دکھائی دیتے ہیں۔ بتائیں، معاملہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، اپنی زندگی میں بہت بور ہو گیا ہوں، سوچتا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ دوں اور کہیں دور نکل جاؤں۔ تنہا، بالکل اکیلا اور زندگی کے بوجھل دھارے بدل ڈالوں، یکسانیت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ وجود میں جمود کے پھوڑے سرطان کی طرح پلنے لگے ہیں''۔ سہیل نے کہا۔

بانو کو یہ اظہار انوکھا سا لگا۔ بات بھی سراسر انوکھی تھی۔ اس سے پہلے سہیل نے کبھی نہیں کی تھی۔ ہلکی سی لرزش بانو کی قلبی دنیا میں برپا ہوئی جیسے حالات کے جمود میں پتھر سا گرا ہو، پھر بہت سارے گرداب اس کے وجود میں بننے اور ٹوٹتے گئے۔ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ نظرانداز کر دیا جاتا مگر بانو اس دم گردابوں میں مزید الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس کے پاس حوصلہ ہی نہیں تھا، نہ ہی اس پہلو اس کے پاس وقت تھا۔ اس نے دن کا آغاز کرنا تھا۔ بیڈ سے اٹھتے ہوئے اس نے گھومتی ہوئی نگاہ خاوند پر دوڑائی، لمحہ بھر کے لئے سہیل کا چہرہ اس کی آنکھوں میں الجھ گیا۔ اسے لگا کہ وہ رتجگے کا شکار ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سرخی تھی۔

''شاید آپ اچھی طرح سو نہیں سکے''۔ بانو نے کہا اور فطرتاً ہلکی سی جماہی لی، پھر تیکھی نظر سے خاوند کی طرف دیکھا اور بال عادتاً دلفریب نزاکت سے جھٹک دیئے۔ اگلے پل اس کا وجود اپنے ہی بالوں میں چھپ گیا۔ چند لمحے اسی طور گزر گئے۔ زلفوں کی گھٹا سمٹی تو سہیل بانو کے روشن چہرے کے سحر میں کھو گیا۔ بانو کے اظہار میں ہمدردی تھی جو اس کی پلکوں تلے سمٹ گئی تھی، یہ کایا اس کا خاصہ تھی۔

''دل نشین لڑکی تھی وہ''۔ مرد کے دل نے گواہی دی۔ ''پیار کے خمیر میں گندھی ہوئی''۔ اس کے ذہن نے کہا، پھر یہ خیال ابھر کر اس کے دل میں مچل گیا۔ بانو کا پیار سفید پانیوں کی طرح تھا، شفاف، اس کے وجود سے دلبری کے جھرنے پھوٹا کرتے تھے، خالص اور روح پرور جھرنے جو کبھی سہیل کی ذات پر سحر طاری کر دیا کرتے۔ انہی معمور جھرنوں نے اسے پیار کا قرینہ سکھایا تھا، تب یہ آبگینے اسے سدا بہار رکھتے، کسی بھی تغیر سے بعید مگر دوراں کو ثبات نہیں، اس نے خیال کیا۔ اگلے ہی پل لہو میں گردش کرتی بے چینی اس کے ماتھے کی شکنوں میں ڈھل ہو گئی۔ تغیر اسے اپنے چہرے کی جھریوں کی طرح اٹل بھلائی دینے لگا۔ تناؤ اس کے وجود میں لوٹ آیا۔ اسے لگا کہ اس کی زندگی میں اب کچھ بھی شفاف نہیں بچا تھا، ہر طرف یاس اور گزرے وقت کا گدلا پن تھا۔ ناطوں کے سوتوں پر بھی کائیاں جم چکی تھیں۔ اسے زندگی میں ان کائیوں کی سڑاند محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گھریلو حالات کے علاوہ اس کے دفتری امور بھی ابتری کا شکار ہو رہے تھے۔

بات آئی گئی ہو جاتی اگر سہیل دو روز بعد اپنی خواہش دہرا نہ دیتا، پھر اس بار تو اس کے لفظوں کے انتخاب میں شدت بھری تپش بھی تھی۔

''بانو! میں اپنے کنبے سے ناطہ تمام کرنا چاہتا ہوں''۔ وہ بولا۔ بانو کی جیسے سانسیں رک گئیں، دل تھم سا گیا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، پھر اندر کی طوفانی

کیفیت اس کے چہرے پر نقش ہوگئی۔

''کیا کہا؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے دیکھا تو سہیل کے چہرے پر پتھریلی سختی تھی۔ وہ سنجیدہ تھا اور نظریں ملانے سے بھی اجتناب نہیں کر رہا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے ذہن میں یہ کیسے شعلے جل پڑے ہیں؟ بظاہر آپ کی آتش فشانی کی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟'' بانو نے پریشان، اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ لرز رہی تھی اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''ہاں بانو! میں واقعی زندگی میں تبدیلی چاہتا ہوں، کوئی بڑی تبدیلی۔ میں موجودہ سڑاند سے نکل کر تازہ ہوا میں جینا چاہتا ہوں۔ اپنے لئے زندگی کی لطافتیں تلاش کرنا چاہتا ہوں، شب و روز کا بے کار بوجھ اتار پھینکنا چاہتا ہوں''۔ سہیل نے کہا اور خلاؤں میں گھورنے لگا۔

''کیا یہ ممکنات میں ہے؟'' بانو کو سہیل پر حیرانی بھی ہو رہی تھی۔

''کیوں نہیں؟'' سہیل کی آواز میں اعتماد تھا۔

بانو اور سہیل کی باہمی زندگی میں اب یہ موضوع الجھ گیا تھا۔ گردشِ حالات میں کبھی کھو جاتا، ظاہر ہوتا تو گھر میں تلخیاں بڑھا دیتا۔ بانو کو لگتا کہ لاوا، جو سہیل کے دل میں مدفون تھا، اب اس کی ازدواجی زندگی میں عیاں ہو کر پکنے لگا تھا۔ محبت کے روایتی جذبے اسے قلبی دنیا میں اب راکھ کی صورت محسوس ہوتے، جس میں دبی چنگاریاں بھی وقت کے ساتھ دم توڑ رہی تھیں۔

گھر بجھا بجھا رہتا تھا، قبل ازیں سہیل سرکاری دوروں پر جاتا تو عموماً ایسا ہوا کرتا تھا۔ تب بانو شدت سے اس کا انتظار کیا کرتی تھی مگر گزرتے دنوں کی یاس میں وہ خود بھی بجھ گئی تھی۔ نہ اس کے گھر میں چراغ جلتے تھے، نہ اس کے دل کے چراغ جلتے تھے۔ وہ گھر کے تاریک کونوں میں بیٹھ کر سوچا کرتی مگر بجھائی کچھ نہ دیتا۔ سوچتی تو سمجھ نہ آتا۔ ایک شام، افسردگی میں کوئی بجھتی ہوئی چنگاری بھڑکی اور کرن کی صورت اس کے دل و ذہن میں ٹمٹمانے لگی۔

''ایک آخری کوشش''۔ اس نے اپنے آپ سے کہا، ساتھ ہی تازہ ولولہ اس کے وجود میں انگڑائیاں لینے لگا۔ اس نے بچا کھچا حوصلہ جمع کیا اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے پر کمربستہ ہوگئی۔

بانو ہمت والی تھی، وہ سب کچھ کر گزری جو اس نے سوچا تھا۔

سہیل گھر لوٹا تو عمارت کی بدلی ہوئی ہیئت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہاں سبھی کچھ بدل چکا تھا، کچھ فرنیچر بالکل نیا تھا جو پرانا تھا، وہ بھی نئی ترتیب میں دیدہ زیب نظر آتا تھا۔ یہی نہیں، قالین اور پردوں کا نیا امتزاج بھی ہوشربا دکھائی دیتا تھا۔ گھر کا ہر کونہ کھدرا سنور گیا تھا۔ پورچ میں نئی گاڑی کھڑی تھی، سبزہ زار پر تازگی تھی، مالی بھرپور محنت کر رہا تھا۔ بانو نے خاوند کا پُرتپاک استقبال کیا۔ وہ انتہائی دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہیئر سٹائل بھی بدل لیا تھا۔ چہرے پر میک اپ سلیقے سے کر رکھا تھا۔ اس کی مسکان میں دلآویزی تھی۔ بھرپور اور تر و تازہ دکھائی دیتی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے سہیل ان مناظر کی جدت میں کھو گیا، پھر مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ گھر میں شاندار ڈنر تیار تھا۔

''آپ کا دورہ کیسا رہا؟'' بانو نے چاہت سے پوچھا۔ وہ صوفے پر اس کے قریب تر براجمان رہی۔ سہیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، پھر بازو پر اٹکایا ہوا کوٹ صوفے پر پھیلا دیا۔ لمبی سی آہ بھری اور خود بھی وہیں نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے چہرے پر

اکتاہٹ لوٹ آئی جوانجانی سی یاس کی طرف مائل تھی۔

''میں نے نوکری چھوڑ دی''۔ اس نے انکشاف کیا۔

''وہ کیوں؟'' بانو کو دھچکا لگا۔ اچانک وہ یوں نظر آنے لگی جیسے بدن سے جان نکل گئی ہو۔

''وجہ شاید میں بھی نہیں جانتا''۔

''حیرت ہے، گھر کیسے چلے گا؟''

''گھرانوں کے سربراہ کبھی مر جاتے ہیں، پھر بھی تو گھر چلتے ہیں''۔

''خدا نہ کرے کہ میں ایسا کوئی سانحہ دیکھوں''۔ بانو نے دہل کر کہا۔ ''آپ تو ماشاء اللہ زندہ ہیں، پروردگار آپ کو سلامت رکھے''۔

''سمجھ لو کہ تم نے غلط آدمی سے شادی کر لی''۔

''سہیل! آپ تو زندگی کو بہت سنجیدہ لیا کرتے تھے''۔

''میں اپنے فیصلوں میں اب بھی سنجیدہ ہوں''۔

''دیکھو، سہیل! میں نے آپ کے پسندیدہ پہاڑی مقام پر بہترین ہوٹل میں بکنگ کرا لی ہے، اگلا ہفتہ ہم وہاں گزار سکتے ہیں۔ زندگی کی موجودہ گھٹن روش بدلے گی تو معاملات پر سوچنے کا بہتر موقع بھی ملے گا۔ ہم نے ہمیشہ ہی ایک دوسرے کی مدد کی ہے، مل جل کر کوشش کریں تو دوبارہ اپنے حالات سنوار سکتے ہیں۔ حالات سے فرار عقلمندی نہیں سمجھی جائے گی''۔ بانو نے کہا، سہیل نے نیم دلی سے سنا مگر خاموش رہا۔ بانو بولتی رہی۔ ''ہم نے گھرانہ مل جل کر بنایا ہے، اس ناطے اَن تھک محنت بھی کی ہے۔ لوگ ہمارے گھرانے کو مثالی جانتے ہیں۔ ہمیں کیا کچھ نہیں ملا؟ پیسہ ہے، پیار ہے، سبھی کچھ ہے۔ کنبہ جو قدرت کے انعامات سے مالا مال ہے، بکھر گیا تو بہت بڑی تباہی آئے گی اور حالات بے قابو ہوئے تو ہم معاملات نہیں سمیٹ سکیں گے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، سو ہم گھرانہ مضبوط کر کے بھی تو ذاتی تمنائیں تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ ازدواجی تعلق ختم کیے بغیر بھی تو پردیس جا سکتے ہیں؟'' بانو کے لہجے میں منت سماجت کا عنصر تھا۔

''تبدیلی کے جو پہلو تم نے چنے ہیں میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ اس قسم کی تبدیلی حقیقی نہیں ہو سکتی، میں بوجھ، جو ڈھو رہا ہوں، اتار کر زندگی کا نرم رخ دیکھنا چاہتا ہوں، اس کا آلودگی سے مبرہ لمس محسوس کرنا چاہتا ہوں''۔

''میں نے بھی تو گھرانے کا بوجھ تمہارے ساتھ مل کر ڈھویا ہے''۔ بانو نے کہا۔ ''کبھی شکوہ نہیں کیا۔ درست کہ آپ کے شانوں پر روزمرہ کا بار زیادہ ہے مگر میں بھی تو نوکری کرتی رہی ہوں، آپ کا بوجھ بانٹا ہے، گھر بھی بطریق احسن چلایا ہے۔ سماجی ضروریات میں ہر جگہ آپ کا ساتھ دیا ہے۔ اس گھر میں جو کچھ بھی ہے ہماری مشترکہ جدوجہد کا حاصل ہے۔ ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے یہاں تک پہنچے ہیں''۔

''یہی وجہ تھی جو مکان میں نے تمہارے نام کر دیا ہے''۔ سہیل نے اسے بتایا۔

بانو نے آہ بھری اور خاموش ہو گئی، اب اس کی نظریں جھک گئی تھیں، چہرے پر یاس اور تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ انتہائی غیر متوقع صورتِ حال سے دوچار تھی اور کسی حد تک ہار بھی مان چکی تھی۔

''بیٹی کیا سوچے گی؟'' اس بار بولی تو اس کی آواز میں کھوکھلاپن نمایاں تھا۔ ''اس کی کائنات تو لٹ چکی؟''

''وہ تمہارے ساتھ جئے گی''۔

''میرا قصور؟''

''تمہاری بدقسمتی''۔

''دنیا کیا سوچے گی؟''

''کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ دوسروں کے معاملات پر سوچتا رہے''۔

''ٹھیک ہے سہیل! میرا گمان کہہ رہا ہے کہ بیس سال پر محیط ہمارا خوشگوار ساتھ ٹوٹ چکا، کنبہ ختم ہو چکا اور اس پر ہمارا فخر بھی ملیامیٹ ہو چکا''۔ بات کر کے بانو رو پڑی جبکہ سہیل خاموش ہو گیا۔ بانو کو وہ اتنا کٹھور کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کا دل یوں سفاک کیوں ہوا تھا، وہ نہیں جان پائی تھی۔ اس گھریلو ابتری میں اگر اس کی کوئی کوتاہی ہوتی تو وہ اس کے لئے جان لیوا بن جاتی۔

اگلے روز سہیل نے اسے طلاق دے دی۔ کاغذ خاموشی سے اسے تھمائے اور خود شہر سے باہر چلا گیا۔ دو روز بعد لوٹا تو مکمل طور پر اجنبی نظر آیا، جیسے اس کا گھرانے سے کوئی رشتہ نہ تھا۔

بانو کالج سے واپس آئی تو وہ ٹیکسی پر ضروری ساز وسامان لادرہا تھا۔ اس کی بیٹی، ہما بُری طرح رو رہی تھی اور اپنے باپ سے گھر میں رک جانے کی التجا کر رہی تھی، اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی اور اپنی ناکردہ خطاؤں پر معافیاں مانگ رہی تھی مگر سہیل اپنے ارادوں پر بدستور قائم رہا اور بیٹی اور بیوی کو ماتم کناں چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا جس کا راز صرف وہی جانتا تھا۔ بانو اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

یہ جدائیوں کے رستے بہت دور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا، میری جاں مان جاؤ

ایک شعر اس کے ذہن میں جاگ پڑا تھا جو تادیر اس کے خیالوں پر چھایا رہا، بار بار اس کی زبان پر آ جاتا۔ جانتی تھی کہ وقت کی شاہراہ پر جو لوگ اپنے خاندان کی یکجہتی کو خیرباد کہہ دیتے ہیں وہ اپنی حیثیت کبھی دوبارہ نہیں پا سکتے چاہے اس کے لئے وہ کتنا بڑا کفارہ ہی کیوں نہ ادا کر دیں۔ جو الوداع ہوا وہ سدھار گیا، کچھ اسی طور سہیل بھی چلا گیا۔

وہ گیا تو گھر کی فضا سوگوار ہو گئی۔ چھوٹا سا گھرانہ تھا، مزید مختصر ہوا تو فقط دو افراد پر مشتمل رہ گیا۔ ماں کا اکلوتا سہارا چودہ سالہ ہما تھی جبکہ ہما کے لئے ماں نے باپ کا روپ بھی دھار لیا مگر ہر دو کی زندگی سے روح عنقا ہو گئی۔ روزمرہ کے امور سمٹے تو ممکن حدود میں صرف لازمی امور رہ گئے، ان میں بھی ذہنی تناؤ عود کر آتا۔ تفریحی پہلو معدوم ہو گئے، رعنائیاں قصۂ پارینہ بنتی گئیں۔ محرومی کے بوجھ نے ماں بیٹی کو گزران کا قیدی بنا دیا۔ طویل عرصہ حالات یونہی دگرگوں رہے۔

وقت اپنی رفتار چلتا رہا، پھر گھرانے کے کچھ غم اس نے اپنی ساعتوں میں سمیٹ لئے۔ شامیں ڈھلیں تو کئی سویرے اس کی گردش میں طلوع ہوئے۔ پھر ان سویروں کی لو دھیرے دھیرے ہما اور بانو کی زندگیوں میں بھی لوٹ آئی، جنہیں حالات نے بالآخر جینے کا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ سمجھوتوں میں اب وہ جیون کا سلیقہ بھی پانے لگی تھیں۔ بانو کی ملازمت بدستور جاری رہی، اس نے ترقی بھی پالی جبکہ ہما کالج میں جا کر پُراعتماد دکھنے لگی، زندگی اس کی ذات میں پوری طرح نظر آنے لگی۔ پھر کڑے حالات کا چلچلاؤ مدھم پڑ گیا اور قدرت مختصر کنبے پر مہربان ہو گئی۔

کچھ ضروریات درپیش تھیں جو مدت بعد بانو نے خاوند کے بریف کیس کھولے اور کاغذات کا جائزہ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ سہیل اپنے ذاتی کاغذات ساتھ لے جا چکا تھا۔ مکان کے کاغذات البتہ وہاں موجود تھے جبکہ بزنس شیئرز اور پرائز بانڈز والا خانہ بھی خالی تھا۔ ایک مڑا تڑا پرائز بانڈ کسی طرح وہاں بچ گیا تھا، غالباً سہیل کی عدم توجہی کے باعث۔ بانو نے چند دیگر کاغذات بھی چھان بین کے لئے نکال لئے۔ چند روز بعد اسے پتہ چلا کہ وہ یک دم بہت امیر ہو چکی تھی۔ پرائز بانڈ کی

بدولت قدرت نے اسے نواز دیا تھا۔ راہِ زندگی پر اس کا اعتماد بڑھ گیا۔ انہی دنوں اسے ایک دوسری خوشخبری بھی ملی۔ وہ اپنے کالج کی پرنسپل متعین ہوگئی۔ اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اعتماد ملا تو وہ شیئرز کے کاروبار میں بھی خوش قسمت رہی اور قلیل عرصے ہی میں شہر کے متمول افراد میں شمار ہونے لگی۔ ہما بھی صابر اور ہونہار ثابت ہوئی۔ دونوں نے مل کر اپنی راہوں کا انتخاب کر لیا جبکہ سہیل اس بابت مناسب دانشمندی سے محروم رہا۔

اس نے گھر چھوڑا تو وطن بھی چھوڑ دیا۔ اس کے کوئی خواب تھے تو انہیں سمیٹے وہ نیوزی لینڈ چلا گیا۔ اپنے وطن میں وہ خاصا بارسوخ تھا جہاں اس کے تعلقات بھی وسیع تھے۔

ایک معیاری ہوٹل میں ملازم تھا، افسرانہ ٹھاٹھ باٹھ رکھتا تھا۔ سہولیات میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ پردیس گیا تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ملازمت کے آغاز پر اسے ویٹر بننا پڑا۔ اسے اسی قابل سمجھا گیا تھا۔ دیسی ڈگری وہاں اس کے کسی کام نہ آئی۔ دنیا میں کچھ سچائیاں بہت تلخ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خواب راتوں کی رونق ہوتے ہیں مگر کئی لوگ انہیں جاگتے میں بھی دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ خواب دیکھنے پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی مگر خوابوں کے پیچھے بھاگنا سود و زیاں کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ وہ خواب جو احمقوں کی جنت میں پہنچا دیں، ضرر رساں ہوتے ہیں۔ سہیل کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ چمکتی ہوئی ہر چیز سونا نہیں ہوتی۔ دنیا، جسے وہ جنت نظیر سمجھا کرتا تھا، اس میں بسا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دور کے ڈھول تھے جو سہانے لگتے تھے۔

ایک خلش تکمیل پاتی البتہ اسے ضرور نظر آنے لگی۔ وہاں صنفِ نازک کی فراوانی تھی اور اس کے لئے راہوں کا انتخاب بھی مشکل نہیں تھا۔ گمراہی کی راہ پر چلا تو اس پر منکشف ہوا کہ شاید وہ یہی چاہتا تھا۔ ادھیڑ عمری کبھی خواہشوں میں ہوس کی جوت جگا دیتی ہے۔ لاشعوری طور پر شاید یہی اس کا مطمع نظر تھا۔ اس میں بھی کوئی دوسری رائے نہیں کہ برائی اپنے ساتھ دوسری برائیوں کو جنم دیتی ہے۔

ویسے بھی عورت کی طرف رغبت برائی کا روپ دھار کر آئے تو وہ تنہا نہیں آتی۔ نسوانی نشہ دیگر لوازمات کا تقاضا بھی کرنے لگتا ہے، پھر نشے کی علتیں مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اخلاقیات کا پہلو شخصیت سے غائب ہو جاتا ہے۔

پانچ برس سہیل نے پردیس میں گزار دیئے تھے، اب حقائق کا بوجھ اس کی شخصی زندگی پر بڑھ گیا تھا۔ آوارہ خیال جو پہلے وہ ذہن سے جھٹک دیا کرتا تھا، اب اسے ستانے لگے تھے۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ انسانوں کی بھیڑ میں تنہا ہو چکا ہے۔ اس کے استوار کردہ تمام رابطے کھوکھلے تھے بلکہ پردیسی معاشرے میں اس کے روابط صرف بیوپاریوں سے تھے۔ مشقت کے مطابق اسے محنت کا معاوضہ مل جاتا، رقم خرچ کرتا تو کسی ریسٹوران پر کھانا کھا لیتا، بھری ہوئی جیب اسے ابھارتی تو کلب کی طرف چل پڑتا، جام پر جام پیا کرتا اور غم دنیا کو شراب میں غرق کر دیتا۔ پھر شب گزاری کے جتن شروع کر دیتا۔ مگر اس روز معاملہ یکسر مختلف تھا۔ حرکات و سکنات بتاتی تھیں کہ سہیل کا سکون غارت ہو چکا ہے۔ کچھ دنوں سے وہ بجھا بجھا رہتا تھا۔ تن کی رنگ برنگ دنیا میں اس کی دلچسپی معدوم ہو چکی تھی۔ اب اسے اپنی روح کسی خشک باغیچے کی طرح بھائی دیتی تھی، پیاسی، بنجر اور پتھریلی جسے سیراب کرنے کے لئے ایک سمندر درکار تھا، پیار اور بے لوث محبت کا آب بیکراں مگر ایسے تمام امرت دھارے وہ زندگی کی پچھلی منزل پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ جان چکا تھا۔

''میری روح میں ایک سرد آگ جل پڑی ہے جو بجھائے کسی طور نہیں بجھتی''۔ وہ اپنی پیاس کا ذکر کرتا۔

اس شام اس کی انگلیاں متواتر بند بوتل کا طواف کر رہی تھیں، کبھی وہ خالی پیمانے سے کھیلنے لگتا، چند دنوں سے آوارہ خیال اس کے ذہن میں منڈلا رہے تھے، کبھی ان میں عہد رفتہ کے الاؤ جل پڑتے۔

سہیل نے جلدی سے بوتل کھولی اور پیمانہ شراب سے بھر لیا لیکن وہ یہ مائع حلق سے نہ اتار سکا، اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کے سامنے میز پر اس کی میڈیکل رپورٹ پڑی تھی، اس پر تحریر سرخی مائل حروف سلگ رہے تھے، شراب نوشی کی کثرت نے اس کا جگر برباد کر دیا تھا، ڈاکٹر نے اسے یہی بتایا تھا۔

''چمک کی تلاش میں مَیں نے سونا کھو دیا''۔ وہ بڑبڑایا۔ اسے لگا کہ اس کے تمام وجود میں بھی کوئلے بھرے تھے، جس میں جہنمی آگ سُلگی ہوئی تھی۔ اسے اپنا جگر شعلہ بار محسوس ہوتا تھا، درد کی تپش میں سلگتا ہوا پھوڑا۔

سہیل نے شراب کی بوتل اٹھائی اور پوری قوت سے دیوار پر دے ماری۔ ایک دھماکہ ہوا اور شیشے کے ٹکڑے خوفناک انداز میں چاروں طرف بکھر گئے۔ شرابی اس پر بُری طرح خوفزدہ ہو گئے۔

چارلس اینڈریوز کرک کا پادری تھا، اس دم سافٹ ڈرنک سے جی بہلا رہا تھا، اس نے معاملہ دیکھا تو اٹھا اور سہیل کے پاس چلا آیا۔ وہ سہیل کی کہانی بھی کسی حد تک جانتا تھا۔

''کوئی شخص کبھی تنہا نہیں جیا، دوست!'' اس نے سہیل سے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''ہر شخص نظام قدرت کا حصہ ہے۔ اسی ناطے نسلیں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ معاشروں کی تخلیق انسانی ضرورت تھی، انسان اکٹھے چلے تو حقوق و فرائض کا تصور آیا، نیکی اور بدی میں تمیز ہوئی، انصاف کا پہلو پہچانا گیا۔ ہم اہل کتاب پروردگار کو سب سے اعلیٰ منصف مانتے ہیں مگر اندرون خانہ جنم لینے والی تمام ناانصافیاں اپنے جبر سے دبا دیتے ہیں۔ طاقتور ہیں تو من مانیاں کرتے ہیں، حقوق کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ فرائض نہیں پہچانتے۔ پھر جب کبھی مکافاتِ عمل کا شکار ہو جائیں تو روتے ہیں''۔

لمحہ بھر کے لئے خاموشی چھا گئی، سہیل بے چین نظر آتا تھا۔

''بھائی! زندگی نبھاہ کرنے کا دوسرا نام ہے''۔ چارلس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، پھر دوبارہ اسے سمجھانے لگا۔ ''ہم ناطوں اور حالات سے نبھاہ کرتے ہیں۔ ہمیں درد دل دیا گیا اور نبھاہ کرنے کو کہا گیا۔ تم اسے امتحان کہہ لو، سمجھ لو کہ ہر دو جاں میں سرخروئی ہمارے رویوں کے طفیل ہے۔ دکھ دینا بدی اور درد بانٹ لینا نیکی ہے''۔

''میرے پاس تو کفارہ ادا کرنے کو بھی کچھ نہیں بچا''۔ سہیل نے ٹھنڈی آہ بھری، اس کے لفظوں اور لہجے میں ہار کی چبھن تھی، اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چارلس تھوڑی دیر اسے ہمدردی سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''اپنے وطن لوٹ جاؤ دوست!'' چارلس نے اسے تھپکی دی اور گفتگو ختم کر دی۔

سافٹ ڈرنک تو کجا پانی بھی سہیل کے حلق سے نہ اتر سکا۔

ہوٹل میں سہیل کی نوکری ختم ہو گئی، اس کی صحت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ جلد ہی ہوٹل انتظامیہ نے اسے وطن واپسی کا ٹکٹ تھما دیا۔ سہیل کو واپسی کا سفر درپیش ہوا تو اسے یاد آیا، وہ جب پردیس کے لئے روانہ ہوا تھا تب اسے لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی میلہ دیکھنے جا رہا تھا اور وہ مجبوراً واپس چلا تو اسے لگا، جیسے اس کے گرد موت

کے سائے منڈلا رہے تھے اور اس نے ناتواں کندھوں پر اپنا ہی جنازہ اٹھا رکھا تھا۔ اس کے سامنے نہ کوئی آس تھی، نہ امید اور نہ ہی کوئی ایسی توقع تھی جس پر وہ تکیہ کرتا۔

وہ وطن لوٹا تو فوراً ہی اپنے شہر چلا گیا جسے کبھی وہ شہرِ آرزو کہا کرتا تھا۔ شہر اب بھی وہی تھا مگر وہ جس گمان کے سہارے یہاں پہنچا تھا، اسے محض خود فریبی کا نام دیا جا سکتا تھا۔

''جو شخص چلتی گاڑی سے اتر جاتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ کسی دوراہے پر گم ہو جاتا ہے جبکہ گاڑی وقت کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے۔ ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ جائے تو چند ہی گام راہی کو بھٹکا دیتے ہیں اور جو ایک بار انجانی منزل کی طرف بڑھ جائے، وہ لوٹ کر کبھی واپس نہیں آتا''۔ سہیل کو بانو کی یہ باتیں یاد تھیں، اس روز بار بار اسے رُلاتی رہیں۔ اس کے ذہن میں برپا طوفان بارہا اس کی بساط سے بڑھ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طوفان نے اس کا لاغر وجود لرزا دیا تھا۔ راہ پر وہ بارہا رکا، سوچا کیا، کبھی بے اختیار ہوا، آخر قدم قدم فاصلے پاٹتا ہوا اس آبادی کے کنارے پہنچ گیا جہاں کبھی مقیم رہا تھا۔

اس آبادی کے بعد اس کی منزل کیا ہو سکتی تھی؟ اس خیال سے اس کے قدم بندھ گئے اور وہ سوچنے لگا۔ ''کیا سچے اور حقیقی رشتے جو زندگی میں روح کے مترادف ہوتے ہیں، وہ رشتے بھی لایعنی تعلق کا روپ دھار سکتے ہیں؟'' اسے ایک اچھوتا خیال آیا، وہ لرز گیا ور سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ سفر کی مسافت سے اب وہ تھک گیا تھا، اسے لگا کہ وہ زندگی سے بھی تھک چکا تھا۔

ایک رکشہ اس کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ متذبذب تھا، پھر بھی رکشے پر بیٹھ گیا۔ رکشہ آبادی کی پختہ گلیوں میں چکر کاٹنے لگا۔

یکدم سہیل کو احساس ہوا کہ وہ اسی جگہ کھڑا تھا جہاں کبھی اس کی خوبصورت دنیا آباد تھی۔ وہ یہاں کھڑے ہو کر دنیا کے تماشے دیکھا کرتا تھا۔

مقام وہی تھا مگر اس کا نقشہ پوری طرح بدل چکا تھا۔ کبھی یہاں وسیع جگہ خالی ہوا کرتی تھی، جس کے ایک کونے میں چھوٹا سا کاشانہ تھا، جہاں اس کا کنبہ آباد رہا تھا۔ کنبہ جس کا خاصہ باہمی پیار ہوا کرتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ باوجود تبدیلی کے اس مقام کی ہر اکائی سے پیار ٹپک رہا تھا، میٹھا سا سچا پیار جس کی گم گشتہ لذت اس دم اس کی روح میں بھاگ پڑی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا، مبہوظ اور مسحور، لمحوں کا ٹکراؤ ہوا اور اس کا خواب یکدم ٹوٹ گیا۔

دھیرے دھیرے تلخ حقائق اس پر غلبہ پانے لگے۔ اس نے دیکھا کہ ماضی کا منظر خاصا بدل چکا تھا۔ اب وہاں نہ تو خالی جگہ باقی رہی تھی اور نہ ہی کہیں اس کا نشیمن نظر آتا تھا بلکہ اس مقام پر ایک وسیع و عریض دِلا ایستادہ ہو چکا تھا، جس کی اونچی چار دیواری میں نصیب سنہری صدر دروازہ عمارت کے مکینوں کے ذوق اور ان کے مرتبے کی گواہی دے رہا تھا۔ حال اور عہدِ رفتہ یکجا ہوئے تو اس کے ذہنی افق پر ادغام کی جنگ لڑنے لگے۔

اچانک ایک لمبی سی کار گیٹ کے سامنے آ کر رکی، اس پر ایک نوجوان لڑکا سوار تھا جو اپنے سیل فون پر مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ نے دروازہ کھولا اور ایک خوبرو لڑکی عمارت سے باہر نکلی۔ الہڑ سی دوشیزہ اسے بانو کی طرح دکھائی دی، نوجوان بانو کی زندہ تصویر۔ وہ جان گیا کہ یہ ہما تھی، اس کی بیٹی۔ یہ منظر یکدم اس کے ماضی میں پیوست ہو گیا۔ اس کے دل میں لہر سی اٹھی، جو مقدر کے ریگزاروں پر پھیل گئی۔ وہ

زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ بے اختیار وہ اپنی بیٹی کی طرف بڑھا مگر اگلے ہی لمحے زمین نے جیسے اس کے پاؤں تھام لئے، وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ لڑکی نے اچٹتی سی نظر اس کی حالتِ زار پر ڈالی، پھر اس کا دھیان بٹ گیا اور وہ نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئی جس کی آنکھوں میں اس کے لئے اتھاہ پیار تھا۔ دونوں کی مسکانوں میں زندگی رقص کرتی تھی۔ لمحہ بھر سہیل منظر میں کھو سا گیا، سنبھلا تو تمام منظر سمٹ چکا تھا۔ اب اس کے سامنے انسانوں کی بھیڑ تھی۔

گزرے ہوئے وقت کا بوجھ یکدم اسے اپنے دل پر محسوس ہوا پھر اس کے تمام جذبے اس بوجھ تلے دبتے گئے، دب کر بے معنی ہونے لگے۔ لمحے الجھ کر رہ گئے، سلجھے تو وہ جان چکا تھا کہ خونی ناطوں کے زمرے میں اس کی ہستی بلاشبہ بے معنی ہو چکی تھی۔ حقائق پر وہ لرز سا گیا۔ کس بنیاد پر وہ سراب دیکھ رہا تھا، وہ سوچنے لگا۔ اس کی بانہیں ابھی تک بیٹی کی طرف پھیلی ہوئی تھیں، مٹھیں تو آنکھوں کی خشک ویرانی میں سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگے۔

یہ احساس اس پر حاوی ہو چکا تھا کہ وہ بے برگ وثمر اور کرم خوردہ تھا، جو کسی بھی لمحے دھڑام سے زمین بوس ہو سکتا تھا۔ وہ ان لمحوں کا انتظار کرنے لگا جو مقدر نے اس کے بارے میں لکھ دیئے تھے۔

''صاحب جی! آپ؟'' ایک لرزیدہ آواز نے اسے متوجہ کر لیا، وہ پہلو پر گھوم کر سنبھلا تو سامنے امبر کھڑی تھی، گھر کی دیرینہ اور وفا شعار ملازمہ، وہ انتہائی حیران اور پریشان تھی کشمکش کا شکار، اچنبھے نے اس کے شفاف پختہ چہرے پر داستان لکھ دی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں پر سمجھوتہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کی بابت گزران کی کتاب میں محض ایک ورق پلٹا تھا جبکہ سہیل کی کہانی کئی باب آگے جا چکی تھی۔

''کون؟.....امبر!'' آواز سہیل کے حلق سے نکلی جو اسے اپنی ہی سماعتوں پر غیر مانوس بھائی دی۔

''ہاں، صاحب جی! لیکن آپ یوں باہر کیوں کھڑے ہیں؟'' اس نے کہا لیکن اگلے پل وہ خود اپنے ہی سوال میں الجھ گئی، پریشانی پسینے میں ڈھل کر اس کے چہرے پر ناچنے لگی۔

سہیل کا ذہن بھی بوجھ تلے ماؤف ہو چکا تھا، وہ زندہ بت کی طرح امبر کے سامنے کھڑا تھا۔

''شام پڑ چکی ہے، صاحب! اندر چلتے ہیں''۔ امبر نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

سہیل عمارت میں داخلے کے لئے صدر دروازے سے گزرا تو بدستور جذبات سے عاری تھا۔ وہ ہوا میں اُڑتے پتوں کی طرح رستوں پر لڑھکنے لگا۔ عمارت کے گیٹ پر آڑی ترچھی لکیروں سے ''بانو'' کا نام لکھا ہوا تھا۔ زیادہ نمایاں حروف انگریزی میں تحریر تھے۔ وہ عمارت کے سبزہ پر وارد ہوا اور کنارے کنارے سرخ اینٹوں پر چلنے لگا۔ جلد ہی اسے پرانی عمارت بھی نظر آ گئی جہاں کبھی اس نے اپنا کنبہ پروان چڑھایا تھا مگر اب عمارت جدید رنگ وروغن سے سجی ہوئی تھی۔

''اب اسے مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے''۔ امبر نے بتایا۔ ''اس کے دوسری طرف چھوٹا سا کوارٹر میرے لئے بھی بنایا گیا ہے''۔ وہ بولی۔

''تمہارے اہلِ خانہ کیسے ہیں؟'' سہیل نے سوال کیا۔

''سر! میں تو کب کی اجڑ چکی، والدین نے شادی کر دی تھی، خاوند نشئی نکلا۔ زدوکوب کرتا تھا، اس سے خطرہ تھا جی مجھے، کچھ عرصہ شادی بمشکل چلی، پھر جبر کی رات ختم ہو گئی''۔

''تم گاؤں میں نہیں رہا کرتی تھیں؟''

''نہیں جی، گاؤں نہیں تھا، اسی شہر کا ایک محلّہ تھا،

اچھی خاصی آبادی تھی، میں والدین کے ساتھ وہاں رہتی رہی تھی، وہ چل بسے تو میں یہاں آ گئی تھی۔ مکان تو دو مرلے کا تھا مگر تھا سڑک کے کنارے، میں نے کرائے پر اٹھا دیا، کچھ پیسے مل جاتے ہیں''۔

امبر نے دیکھا، سہیل کے ماند جذبے لوٹ رہے تھے، وہ بے چین تھا اور چہرے پر رنج و غم کے بادل منڈلانے لگے تھے، اس کی آنکھوں میں میگھا تیر رہی تھی۔ اس دم فلک کا موسم بھی ابر آلود تھا، یہی وجہ تھی یا پھر ہوا کے جھونکوں کا سحر کمال تھا جو دونوں کو ارٹر سے ملحقہ برآمدے میں بیٹھ گئے۔

''غریب کی زندگی بھی عجب ہوا کرتی ہے، ہر قسم کے فرائض سے تو اٹ جاتی ہے مگر اس کے بدلے میں حقوق نہیں ہوتے''۔ امبر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بانو کہاں ہو گی؟'' سہیل نے کرسی میں گرتے ہوئے پوچھا۔ امبر کو لگا کہ اس کی آواز کسی لمبی سرنگ سے گزر رہی تھی حالانکہ سوال چند لفظوں پر محیط تھا۔

''صاحب جی! وقت کا قافلہ بہت آگے نکل چکا''۔

''یہ میں جانتا ہوں، اپنی تکان اور اپنے کھوکھلے پن سے''۔

''بانو باجی کاروباری سلسلوں میں بہت محنتی ہیں''۔

''مجھے اندازہ ہو چکا ہے''۔ بانو کی ترقی سہیل کو حیران کن نہ لگی۔ ''اور ہما؟'' اس نے اگلا سوال کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی لو جھلکنے لگی تھی۔

''بہت پیاری بچی ہے، صاحب جی! ہے تو چھوٹی سی مگر ماں کے لئے بہت بڑا سہارا ہے اور اب تو.....''

''کہو چپ کیوں ہو گئیں؟''

''اب تو نوروز بھی ماں بیٹی کی زندگی میں آ گیا ہے، ان دونوں کی بہت مدد کرتا ہے''۔

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے، ہما گاڑی پر اسی کے ساتھ گئی ہو گی؟''

''جی! تھوڑی دیر پہلے وہ پہلے آیا تھا''۔

''مجھے لگا کہ دونوں کے بیچ یقیناً گہرا ناطہ ہو گا؟''

''ان کا نکاح ہو چکا ہے''۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر امبر نے موضوع بدل دیا۔ ''سر! آپ کو گھر چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا''۔ اس نے کہا۔

دو اشک سہیل کی آنکھوں میں مچلے، پھر گالوں پر پھسلنے لگے۔ ہوا میں سرسراہٹ بڑھتی سی گئی، پھر بارش کے چند قطرے دھرتی پر بکھر گئے۔ لمحوں کے ساتھ جذبوں میں ٹھہراؤ آنے لگا۔ ماحول میں گری اور سردی کا امتزاج تھا، ہوا کے جھونکے سرد تھے۔

''میں ہمیشہ لاابالی رہا''۔ سہیل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''لوگ یہی کہتے ہیں''۔

''نہ جان سکا کہ یہ صفت زندگی کے کسی موڑ پر ترک کر دینی چاہئے ورنہ صفت وبال بن جاتی ہے؟''

''کیا یہ صفت ہے؟'' امبر نے پوچھا۔ اس سوال پر سہیل خاموش رہا، خاموش اور افسردہ۔

''بانو جی نے زندگی میں بہت محنت کی''۔

''مجھے برا بھلا کہتی ہو گی''۔

''نہیں، صبر کر لیا تھا اس نے۔ ہما البتہ آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ زندگی کے ہر اہم مرحلے پر اس نے آپ کی کمی محسوس کی، اب سنبھل چکی ہے''۔

''میں بانو کو طلاق دیئے بغیر بھی پردیس جا سکتا تھا''۔

''یہی بانو باجی کو گلا تھا، ہر کوئی آپ کے رویوں کو نامعقول سمجھتا تھا''۔

دکھ سہیل کے چہرے پر بکھر گیا، لگا کہ اس کے وجود میں طوفان کا مدوجزر گرہا تھا۔ وہ اپنے اشکوں سے

لرز رہا تھا۔

''میں متوقع انجام تک پہنچ چکا''۔ اس نے کہا، آنسو اس کی آنکھوں سے ابل پڑے۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' امبر نے کڑا سوال کیا مگر وہ جانتی تھی کہ درپیش صورتِ حال میں رکھ رکھاؤ بالکل بے معنی تھا۔

''ہمدردی کی تلاش میں''۔ سہیل نے جواب دیا اور نظریں جھکا لیں۔

''کیا آپ کو یہاں پذیرائی ملے گی؟''

''نہیں، اس کے باوجود میرے قدم اسی طرف اٹھے اور میں بے اختیار چلا آیا۔ صرف ارادہ کرنے کی دیر تھی پھر لگا کہ میں کسی پتھر کی طرح ہوں، جو راستوں پر لڑھک رہا ہو''۔ امبر ابھی تک ماضی میں الجھی ہوئی تھی، سہیل کی کیفیت بھانپتے ہوئے بولی۔

''جیون کے جس پہلو کا انتخاب آپ نے کیا تھا، اس میں پائیداری نہیں تھی''۔

''درست''۔ سہیل نے کہا، پھر بات جاری رکھی۔

''امبر میں اب کیا کروں، سچ جانو کہ میں اب تھک چکا ہوں اور مزید تنہا سفر کے قابل نہیں رہا''۔ اس نے سچ بیانی کی۔ بے چارگی اس کے چہرے پر ثبت ہو گئی، رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کی کیفیت سے واضح تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہت کھوکھلا ہو چکا تھا مگر کیا سچائی جھٹلائی جا سکتی تھی۔

''سچ کہوں تو یہ منزل آپ کے لئے پرائی ہو چکی''۔ امبر نے ہمت کر کے اسے باور کرا دیا، وہ خود بھی دکھی دکھائی دیتی تھی۔

''کبھی آدمی جان بوجھ کر بھی اپنے ساتھ دھوکہ بازی کرتا ہے''۔ سہیل نے اعتراف کر لیا۔

بارش تیز ہو چکی تھی، اندھیرا گہرا ہو چکا تھا، بظاہر کوئی جواز نہیں تھا کہ سہیل وہاں مزید بیٹھا رہتا، اب وہ بے چینی میں پہلو بدل رہا تھا۔

''کیا میں بانو سے مل سکتا ہوں؟'' اس کے ذہن پر حاوی آرزو آخر زبان پر آ گئی۔ ''بس اسے دیکھنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ماحول میں یکدم لرزش سی ابھری، چمک کے بعد دور کہیں بادل گرجا۔ سہیل کی بات نے منظر یکسر بدل دیا تھا۔ امبر چونکی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اس نے بے اختیار سہیل کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر یاس، اشتیاق اور امید کا امتزاج تھا۔ اسے لگا کہ اس کی سعی بسیار کے باوجود وہ حقائق جھٹلا دینے پر تلا ہوا تھا۔

''کبھی آدمی جان بوجھ کر بھی اپنی ذات سے دھوکہ دہی کرتا ہے''۔ سہیل کا کہا گیا فقرہ امبر کے ذہن میں گونجنے لگا۔

''میں نہیں چاہتی کہ آپ کے لئے ایسی صورتِ حال پیدا ہو جو آپ برداشت نہ کر سکیں''۔

''تم مجھے سڑک پر نہ ملتیں تو میں نہ جانے کتنے روز اس گھر کا طواف کرتا رہتا''۔

''ٹھیک ہے تو پھر سن لیں۔ بانو باجی جنید صاحب سے نکاح کر چکی ہے، ہما بیٹی کی رخصتی کے بعد وہ جنید صاحب کا سہارا اپنانا چاہتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ جب آپ عمارت میں داخل ہوئے تو بانو باجی نے آپ کو دیکھا تھا''۔ امبر نے انکشاف کیا۔ یکدم کائنات سرخ چکا چوند سے بھر گئی۔

آسمان پر بادل زور سے گرجا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سہیل کو لگا کہ کوئی بم اس کے دل کی گہرائیوں میں پھٹا تھا اور اب وہ آگ کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس کے وجود پر ٹکراتی ہوئی ابر کی بوندیں انگاروں کی طرح بھڑک رہی تھیں۔

وہ باہر کی راہ چلا تو امبر انٹر کام پر کسی سے مخاطب

تھی۔

''باجی کہہ رہی ہیں کہ آپ طوفانی شب باہر نہ جائیں''۔ امبر نے انٹرکام پر بات کر کے سہیل سے کہا۔ ''مہمان خانے میں قیام کرلیں''۔

امبر کی آواز اس کی سماعتوں پر ٹکرائی اور اس کے دماغ میں گونجنے لگی۔ وہ لڑکھڑایا مگر چلتا رہا۔ امبر برستی برکھا میں اس کی طرف لپکی اور ہاتھ پھیلا کر اس کے مقابل کھڑی ہوگئی۔ وہ اسے روک لینا چاہتی تھی، کسی نہ کسی طرح۔

''یکین سے دل کا مسافر بننے تک کا سفر لمحوں کی قطار میں عذاب سے کم نہیں گزرا ہوگا، سمٹا تو آج چند لمحوں میں طے ہوگیا''۔ سہیل نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور نقوش میں وحشت ناچ رہی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے اپنے خالی ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیئے اور جا بجا ایستادہ مدھم روشنیوں کے قریب سے گزرتا ہوا عمارت سے باہر نکل گیا۔

''میں اپنے آپ کو دھوکے دینے کا عادی ہو چکا ہوں''۔ اس کی آواز امبر کے دماغ میں گونجتی رہی، رات بھیگ چکی تھی، جب وہ بانو سے ملی۔

بارانی طوفان تھا کہ ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

صبح عمارت کے دروازے کھلے تو امبر کو رات کے واقعات کا علم ہوا۔

''وہ شخص، جو رات عمارت سے نکلا تھا، تاریک سڑک کے کنارے بینچ پر بیٹھا رہا، ہم نے بارہا اسے پناہ کی پیشکش کی لیکن وہ ہماری خواہش متواتر ٹھکراتا رہا، حتیٰ کہ طوفان اس کی بساط سے بڑھ گیا اور وہ وہیں گیلے بینچ پر ڈھیر ہوگیا''۔ پہریداروں نے امبر کو بتایا۔

ڈرائیور رات گئے سہیل کو ہسپتال پہنچا آیا تھا۔ امبر اسے وہیں ملی۔

''مجھے اپنے اردگرد ہر وقت موت کے سائے دکھائی دیتے ہیں''۔

''میں شاید اب مزید نہیں جی سکوں گا''۔ سہیل نے اسے بتایا۔ ''میرا بدن کھوکھلا ہو چکا ہے اور جگر ناکارہ ہو رہا ہے''۔ اس نے کہا۔ امبر نے بانو کی طرف سے اسے مالی امداد کی پیشکش کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''میں پردیس سے تہی دست واپس نہیں آیا''۔ اس نے جواباً کہا۔ ''مجھے صرف انسانی سہاروں کی ضرورت ہے''۔ اس نے وضاحت کی۔

''سہارے آپ کو کیسے مل سکتے ہیں؟'' امبر نے اس سے استفسار کیا مگر سہیل کوئی جواب نہ دے سکا۔

چند روز بعد امبر کو سہیل کی جانب سے ایک پیغام ملا، جس میں لکھا تھا۔

''امبر! میری حالت ایسی ہے کہ اگر مجھے کوئی ہمدرد ساتھی نہ ملا تو میں موت کی آغوش میں چلا جاؤں گا۔ تم میرے عارضے کے متعلق جان چکی ہو۔ ایک پچھلی ملاقات میں تم نے کہا تھا کہ غربت کی بھٹی انسانوں کو مجبور بنا دیتی ہے اور انہیں محض فرائض کی ادائیگی پر محدود کر دیتی ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ فرائض کو حقوق پر ترجیح دینے والوں کے دل امیر ہوتے ہیں، اس ناطے درخواست ہے کہ مجھ تنگ دل کو اپنے جیون میں اپنا لو، شاید میں تمہاری کوشش سے دوبارہ جی اٹھوں اور مجھے توبہ اور تلافی کی مہلت مل جائے''۔

تحریر پڑھ کر امبر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ حیرت اس کے چہرے پر نقش ہوگئی، ذہن سوچ اور سمجھ سے عاری ہوگیا۔ اسے لگا کہ لکھے گئے لفظوں کی کم مائیگی اس کے دل میں سمٹ گئی تھی۔

وہ پیلی سی شام تھی، جب امبر عمارت سے نکلی تو سہیل بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ موسم میں خنکی تھی، ہوا میں ٹھہراؤ تھا۔ امبر نے سہیل کو دیکھا تو اس کے دل میں تلاطم مچ گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اپنا تماشہ بن گیا ہوں''۔ سہیل نے اسے کہا۔

''آپ نے مجھے کشمکش و پنج میں ڈال دیا ہے''۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس گھر میں میرے لئے راہیں موجود ہیں مگر اس کے آگے صرف نقش قدم ہیں، راستے مسدود ہیں۔ میں اپنی منزل تک پہنچ چکا۔ قدموں کے نقوش پر چل پڑا تو مر جاؤں گا''۔

''شاید آپ ہمت ہار چکے ہیں''۔

''ہاں، میں ہار چکا ہوں''۔

''دیس میں واپسی پر کوئی تو سہارا ملا ہوگا؟''

''نہیں، نہ سہارا ہے نہ نشیمن''۔

''کہیں تو بسیرا ہوگا؟''

''دیس میں بھی اتنا ہی پردیسی ہوں جتنا پردیس میں رہا''۔ سہیل نے کہا۔ ''قریب ہی چھوٹا سا گیسٹ ہاؤس ہے، وہاں مقیم ہوں''۔

''میرا چھوٹا سا مکان شاید اگلے ماہ خالی ہو جائے گا''۔ امبر نے کہا پھر دھیرے سے مسکرائی، لجائی اور آہستہ آہستہ عمارت میں چلی گئی۔ عمارت کا صدر دروازہ کھلا رہا مگر سہیل جانتا تھا کہ وہ کھلا در بھی اس کے لئے بند ہو چکا تھا۔ اس پر نصب روشنیاں البتہ اس کے لئے راہ منور کر رہی تھیں۔

پیلی شام رات میں ڈھل چکی تھی مگر اس فسوں میں سہیل اب تنہا نہیں تھا، اس احساس پر اس کے وجود میں زندگی کے الاؤ جل پڑے تھے۔ تنکے کا سہارا اسے زندگی کا پیغام دے رہا تھا۔ اس نے اپنی توانائیاں جمع کیں تو بل کھاتی نیم تاریک شاہراہ پر قدرے اعتماد سے چلنے لگا۔ اس کے ذہن میں سوچیں ابھر کر ڈوبنے لگیں۔ اس دم اسے شب تار میں ٹمٹماتی کرنوں کا احساس ہوا۔ کرنیں امید کا رخ کیوں کہلاتی ہیں؟ وہ سوچنے لگا، تاریکی کو برائی کی علامت کیوں گردانا جاتا ہے؟ گھٹاٹوپ اندھیرا سچائی کی نرم کرن بھی فنا نہیں کر سکتا۔ اجالا ہی اصل زندگی ہے۔ دلوں کی لو کیا ہوتی ہے؟ کیا سچائی اور امید کی کرنیں مقفل قلوب میں بھی اتر سکتی ہیں اس کی سوچیں نقطوں پر مرکوز ہونے لگیں اور دل میں ہیجان تھمنے لگا۔

یکا یک اشک اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے، پھر راہ کے ایک تاریک موڑ پر وہ ٹھہر گیا اور ایک درخت کا سہارا لے کر بُری طرح رو پڑا۔ وہ اتنا رویا کہ اشکوں سے اس کا دامن تر ہو گیا اور وجود ہچکیاں بھرنے لگا۔

سکون ملا تو وہ دوبارہ محوِ خرام تھا۔ مگر اس بار ایک یقین کے ساتھ راہ حیات آہستہ آہستہ اس پر واضح ہونے لگی تھی۔ ''مجھے جینا ہے''۔ یہ اس کا پہلا فیصلہ تھا، اٹل فیصلہ۔ وہ میڈیکل سٹور پر گیا اور اہم ادویہ خریدیں، جن کی ہدایت اسے پردیس میں کی گئی تھی لیکن وہ انہیں ترک کر چکا تھا حالانکہ مجوزہ دوائیں اس کے جان لیوا امراض کے خلاف ڈھال تھیں۔ تھوڑی دیر سڑکوں پر گھومتا پھرا پھر وہ قریبی گارمنٹس شاپ پر چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو سامنے ہی باربر سیلون تھا، وہاں آئینوں نے اسے اپنی طرف راغب کر لیا۔ مدت بعد وہ چاہت سے کسی آئینے کے مقابل گیا تھا۔ بغور اپنا حلیہ دیکھا تو وہ بے یقینی کا شکار ہو گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی اجنبی کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہی عکس سے نظریں چرانے لگا۔ اگلے پل اس کا وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا اور وہ قریبی بینچ پر ڈھیر ہو گیا مگر پھر بھی آئینوں کی دسترس سے نہ نکل سکا۔ اس کا عکس ہر آئینے سے جھانکنے لگا۔

''کاش! تم اپنے باطن کا روپ بھی آئینوں کی گہرائیوں میں سجا دیکھ سکتے''۔ قد آدم آئینے نے اس

سے سرگوشی کی۔ اس نے چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''کبھی اپنے جرائم پر بھی سوچا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کر دیا۔ اگلے ہی لمحے سرگوشیوں نے چیخوں کی صورت ڈھال لی اور اس کی سماعتوں پر کوڑوں کی طرح برسنے لگیں۔ وہ اس کیفیت سے لاچار ہونے لگا۔ آخر اس نے انگلیاں کانوں میں داب لیں اور زمین کی طرف جھک گیا۔

''میرے خدا!'' اس کے لبوں سے نکلا۔

''کیا ہوا سر! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' حجام پریشان دکھائی دیتا تھا۔ سہیل کھوکھلی آنکھوں سے گھورتا رہا۔

''شیو یا خط؟'' حجام اس سے بار بار پوچھ رہا تھا۔

''خط''۔ سہیل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر وہ اٹھ کر کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ باربر نے اس کا چہرہ تھام لیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کی انگلیوں میں مہارت تھا اور رویوں میں ملائمت۔ مسلسل باتیں کرتا رہا، سہیل سے کہنے لگا۔

''آپ مسلسل بڑبڑا رہے تھے، آپ کی باتیں سن کر لوگ پریشان بھی ہوئے''۔ سہیل نے یہ سنا تو افسردہ ہو گیا۔ باربر نے گفتگو جاری رکھی۔ ''صاحب جی! برا نہ مانیں تو عرض کروں۔ دل کے معاملے بھید ہوا کرتے ہیں مگر دل کے آئینوں پر ذاتی عکس دیکھنا مشکل نہیں ہوتا مگر ہم اس فرض سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو اپنا محاسبہ کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اسی کو توبہ کی توفیق بھی ملتی ہے۔ بہتری کی طرف راغب ہونا مشکل نہیں ہے، باوجودیکہ نیکوکاری انسانی خصلت ہے۔ کیا کہتے ہیں صاحب؟'' باربر نے کہا اور نظریں سہیل کے چہرے پر گاڑھ دیں۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر سہیل نے سکوت توڑا۔

''ٹھیک کہا، دوست!'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''من کا احوال سلجھانے کے لئے کبھی کسی دوسرے کی مدد بھی لینی پڑتی ہے''۔ باربر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور ایسے شخص کی تلاش بھی کرنی پڑتی ہے۔ آپ تو خیر سے پڑھے لکھے ہیں، میں تعلیم و تربیت سے عاری رہا۔ آپ کو اونٹ سی مثال دیتا ہوں۔ آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا کہ میں آپ کی ضرورت تھا۔ آپ کے چہرے پر بے ہنگم بالوں کا الجھاؤ حدوں سے بڑھ گیا تھا اور یہ ظاہری بدصورتی آپ کی شخصیت مسخ کر رہی تھی، ایسے ہی تاریک جنگل انسانی باطن میں بھی نمو پاتے ہیں، صاحب جی! میں اپنے ہنر میں یکتا نہ سہی لیکن اتنی صلاحیت ضرور رکھتا ہوں کہ آپ کی ظاہری صورت پر کشش بنا دوں۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اعلیٰ شخصیت تب ہی تکمیل پاتی ہے جب انسانی باطن اس کے ظاہر سے زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے''۔

باربر نے کہا جبکہ سہیل چپکا سنتا رہا۔ گفتگو سمٹی تو وہ اپنی قیام گاہ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

کئی ماہ سالوں کی گنتی میں ڈھل گئے۔ وقت کے اس سفر میں امبر اور سہیل باہم کامرانی کی راہ پر چل پڑے۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت کے دھارے نے دونوں کی شخصیات کو حد درجہ بدل دیا۔

ایک خوشگوار صبح ڈرائیور نے بانو کو بتایا۔

''باجی! مولانا جی آ گئے ہیں، بچے کے کانوں میں اذان کہہ دیں گے''۔

''کون سے مولانا؟'' بانو نے چونک کر پوچھا۔

''وہی، جو بٹیا کی یونیورسٹی میں آئے تھے، درس دینے کے لئے۔ بقول بٹیا، دعا میں اس قدر روئے کہ

سب کو رُلا دیا۔ بعد میں ان پر رقت طاری ہوگئی۔ بیٹیا نے انہی کو لانے کے لئے کہا تھا۔ میں نے انہیں ڈھونڈ لیا"۔

"اللہ کے بندے عجز کی حالت میں بہت روتے ہیں"۔ بانو نے کہا۔ "میں بٹیا کو خبر کر دیتی ہوں، آپ مولانا کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیں اور کچن میں بھی بتا دیں"۔

بانو کمرے میں پہنچی تو مولانا نومولود بچہ ہما کے حوالے کر رہے تھے۔ بچہ بہت پُرسکون تھا۔

مولانا کی شباہت دیکھ کر بانو کا دل بیٹھ گیا۔ حیرت اور پریشانی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ اس کے قدم ڈگمگائے اور وہ بمشکل سنبھلی، دروازے کے سہارے کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کرنسی نوٹ فرش پر بکھر گئے، کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ ہما اپنی ماں کی طرف لپکی، پریشان اور اسے سہارا دینے کی کوشش کرنے لگی۔

سہیل کے چہرے پر گہرا سکون تھا، وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

"نومولود بیٹا تمام خاندان کو مبارک ہو۔ اللہ اسے سب کے لئے قابلِ فخر بنائے، بڑی چاہت اور تمناؤں سے آیا ہے، اللہ کرے کہ ہمیشہ تمناؤں کا محور رہے اور خاندان کی تمناؤں پر پورا اترے۔ اللہ اسے طویل عمر عطا کرے"۔ اس نے دعا کی، اس کی آنکھوں میں اشک لرزنے لگے۔

اسی بیچ خادمہ نے فرش پر بکھرے کرنسی نوٹ سمیٹے اور سہیل کی جانب بڑھی۔

"حضرت مولانا! یہ....." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سہیل نے اس کی بات کاٹ دی، ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"یہ رقم صدقہ کر دیجئے، کسی غریب شخص کو دے دیں"۔ اس نے کہا اور پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر لمحے رینگ کر گزرتے رہے بالآخر سکوت ٹوٹا۔

"میں چلتا ہوں"۔ سہیل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نو وارد بچے کے سلسلے میں قدرت نے مجھے جو شرف عطا کیا ہے وہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکوں گا۔ باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کا خاندان ہمیشہ ہنستا بستا رکھے"۔

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ گھر سے باہر نکل گیا، ہما اس کے ساتھ صدر دروازے تک گئی۔

"عجیب شخص تھا امی! میں نے اسے یونیورسٹی میں دیکھا تھا مگر آج اس کے رویے میری توقع کے خلاف تھے"۔ ہما نے ماں سے کہا، وہ پریشان نظر آئی۔

"وقتِ رخصت اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو رو پڑا"۔ ہما نے بتایا۔ "کہنے لگا بٹیا! مجھے معاف کر دینا۔ جاتے وقت دکھی بھی دکھائی دیا"۔

"ہاں، واقعی وہ عجیب آدمی تھا، دنیا بھر سے نرالا"۔ بانو نے دھیمی آواز میں کہا، جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔

"امی! آپ بھی مجھے بدحواس لگتی ہیں، آخر معاملہ کیا ہے؟"

"ہما! ذرا تم اس شخص کے خد و خال ذہن میں لاؤ، پھر سامنے دیوار پر آویزاں تصویر دیکھنا، نہ سمجھ پاؤ تو میں تمہاری الجھن سلجھا دوں گی"۔

ہما نے ذہن پر زور دیا۔

"میرے خدا!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اگلے پل وہ سر تھام کر قریبی صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔

❁❁❁

آپ بیتی
آخری قسط

ہم عزت والے لوگ ہیں۔ پیر صاحب دور دور تک مشہور ہیں، ان کا ایک نام ہے اور تم ایک کتے سے بھی بدتر ہو جو ہمارا ہی کھا کر ہمیں بھونک رہے ہو۔

☆ حکیم مختار احمد ناز
0336-5938583

ہوٹل کا مالک مجھے کھونا نہیں چاہتا تھا، مجھ پر وہ بہت اعتماد کرتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور نہ ہی مالک کے اعتماد کو کبھی ٹھیس پہنچائی۔ میں اس کام میں کافی ماہر ہو چکا تھا لیکن ہوٹل کے مالک پیر کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی وہ تو پیر کا اندھا عقیدت مند تھا اور پیر کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ پیر مہینے بھر میں ایک چکر تو ہوٹل کا ضرور لگاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہر بار چند مرید بھی ہوتے تھے، کوئی حقہ اٹھائے ہوتا تھا تو کوئی اور سامان ساتھ لئے ہوتا تھا۔ غالباً اس سامان میں نئے کپڑے اور دوسری اشیاء ہوتیں جو مریدین سے پیر کو بطور تحفہ یا شیرینی ملتی تھیں۔ پیر نے جب مالک سے مجھے مانگ لیا تو ہوٹل کا مالک انکار نہ کر سکا۔

ادھر میں سوچ رہا تھا کہ میری بھی کیا زندگی ہے، سدھائے ہوئے جانور کی طرح جس کے ہاتھ رسّی آ گئی اسی نے ہانک لیا۔ بے گھر اور پردیسی کا بھی کوئی ٹھکانا ہوتا ہے۔ کاش! کہ میرا بھی کوئی رشتہ دار ہوتا، ماں ہوتی، باپ ہوتا، اپنا گھر ہوتا، غربت ہوتی، فاقہ کشی ہوتی لیکن یہ دربدر کی ٹھوکریں تو نہ ہوتیں۔

''ابے او چھوٹے، ادھر سامنے چائے رکھ''۔ ہوٹل کے ملک کی آواز پر میرا سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

پیر کے جانے کے بعد جب ہوٹل پر گاہکوں کا رش کم ہوا تو ہوٹل کے مالک نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''دیکھو بچے! میری بات غور سے سن لو''۔ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''پیر صاحب بڑی پہنچ والے اللہ کے ولی ہیں، ہمارے خاندانی پیر ہیں۔ ان کے والد بھی بڑی پہنچ والے بزرگ تھے، ان کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات یا الٹی سیدھی حرکت بھول کر بھی نہ کرنا۔ کسی قسم کی بے ادبی نہ ہو۔ تم اچھے بچے ہو، میں

تمہیں یہاں سے کبھی بھی نہ جانے دیتا چاہے کوئی میرا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہوتا لیکن پیر صاحب کی خواہش کو میں کسی صورت رد نہیں کر سکتا۔ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، صرف گھر کے اندر زنان خانے میں تھوڑا بہت کام ہو گا یا بازار سے سودا سلف لانا ہو گا باقی میرے پاس تمہاری رقم امانت پڑی ہے۔ جب تمہیں ضرورت ہو آ کر لے جانا۔ اور ہاں، اپنا بکس ساتھ لے جانا''۔ ہوٹل کے مالک نے کہا۔

بکس میں کیا تھا ایک یا دو جوڑے کپڑے اور ایک جوڑا چپل کا تھا۔ چند دن بعد پیر صاحب مع اپنے چیلوں کے ہوٹل پہنچ گئے۔ کچھ لوگ پیر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید انہیں آج کے دن کا بتایا گیا تھا کہ آج کے دن پیر صاحب کی آمد ہو گی۔ پیر نے آنے والوں کو باری باری اپنے پاس بلوایا۔ کسی کو تعویذ دیئے، کسی کو پانی دم کر کے دیا، کسی کو ویسے ہی جھاڑ پھونک کی تقریباً تمام لوگوں نے ہی حسبِ توفیق پیر کو نذرانہ پیش کیا۔

میں بھی ہوٹل کے مالک کے کہنے پر تیار بیٹھا تھا، پیر صاحب نے کھانا کھایا اور جانے کے لئے اٹھے، خصوصی چیلے بھی ساتھ تھے۔ تانگہ تیار تھا، پیر صاحب تانگے کی اگلی نشست پر براجمان ہو گئے۔ تینوں چیلے اور میں پیچھے بیٹھ گئے۔ کافی لمبا سفر تھا، مغرب سے کچھ پہلے ہم چلے تھے اور تقریباً اڑھائی تین گھنٹے بعد ایک بہت بڑے محل نما مکان کے سامنے تانگہ جا رکا تھا۔ پیر صاحب تانگے سے اتر آئے۔

''ٹھیک ہے، اب تم لوگ آرام کرو''۔ پیر صاحب نے کہا۔ ''اور اس بالکے کو بھی اُدھر ہی سلا لو''۔ یہ کہہ کر پیر صاحب اپنے محل مین چلے گئے۔

ہم لوگ ایک طرف بنے بہت بڑے کمرے میں داخل ہوئے جس کے فرش پر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ چیلوں نے بیٹھتے ہی سگریٹ سلگا لئے۔ ایک دم کمرا گاڑھے بدبودار دھوئیں سے بھر گیا۔ جو سگریٹ وہ پی رہے تھے ان میں شاید چرس بھری ہوئی تھی۔ میرا تو دم گھٹ رہا تھا، میں اٹھ کر باہر برآمدے میں آ گیا اور تازہ ہوا میں سانس لینے لگا۔

دوسرے دن دوپہر پیر صاحب تشریف لائے، اپنے تینوں مریدوں سے کچھ عجیب سی باتیں کیں جو میں نہ سمجھ سکا۔ دوپہر کے بعد اکا دکا حاجت مند آنے شروع ہو گئے، انہیں اسی کمرے میں بٹھایا جاتا تھا جس میں ہم نے رات گزارنی تھی۔ یہ شاید دم کرانے والوں کے لئے انتظار گاہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ملحقہ کمرے میں پیر صاحب بیٹھتے تھے۔ یہ کمرہ انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور خوشبو دل کو مسرور کر دینے والی تھی۔ اپنے کمرے سے ہو کر پیر صاحب باہر آئے اور مجھے بلایا اور کہا اپنا بکس اٹھاؤ اور میرے ساتھ آؤ۔ میں بکس اٹھائے پیر کے پیچھے چل دیا۔ ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے پیر صاحب اندر داخل ہوئے، یہ ان کا گھر تھا۔ یہ کسی امیر کبیر ہندو سیٹھ کی چھوڑی ہوئی (ماڑی) محل نما مکان تھا۔ مجھے اندر لے گئے، تین خواتین دو چھوٹے بچے اور ایک نوجوان لڑکی گھر میں موجود تھے۔ ایک پیر کی بیوی، یک بھابی اور ایک ماں تھی۔ دونوں بچے اور لڑکی پیر کی اولاد تھی۔

''یہ بچہ اب ادھر زنان خانے میں ہی رہے گا''۔ پیر صاحب نے اپنی بیوی کو بتایا۔ ''اسے کام سمجھا دینا، بڑا اچھا لڑکا ہے''۔

پیر کی بیوی نے جو کام سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ گھر کا کام کوئی زیادہ تھا ہی نہیں، زیادہ کام تو پیر صاحب کا تھا۔ دن رات میں دو تین دفعہ حقہ بھرنا، بھنگ کے پتوں کو پانی میں ابال کر کچھ دیر دھوپ میں رکھ کر سکھانا اور پھر چند دانے بادام، کالی، مرچ اور خشخاش کو بھنگ کے پتوں کے ساتھ گھوٹنا اور چھان کر حجرے سے پیر کو زنان

خانے میں بلا کر ایک بڑے مٹی کے پیالے جسے (دوری) کہتے تھے، پیسا کرتا تھا۔ پیر غٹاغٹ پی کر دوبارہ مریدوں میں جا بیٹھتا تھا اور دوبارہ اپنا دھندا جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا شروع کر دیتا تھا۔

آہستہ آہستہ مجھے پیر کے اسرار و رموز سمجھ آ رہے تھے۔ اب پیر کافی دیر تک مجھے اپنے پاس بھی بٹھائے رکھتا تھا۔ شام کو جب سائلین چلے جاتے تو پیر زنان خانے میں آ جاتا، دن بھر کی آمدن جو ایک ٹوکری میں ہوتی وہ اپنی بیگم کے سامنے رکھ دیتا جس میں رائج الوقت سکے زیادہ ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد حویلی کے اندر ہی ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہو جاتا تھا۔ میرے وہاں آنے کے چند ماہ بعد ایک روز مجھے بھی اندر بلوا لیا۔ اندر کیا تھا، ایک کباڑ خانہ تھا، ایک دری فرش پر بچھی ہوئی تھی اور دو تین تکیے پڑے تھے باقی کچھ سامان بے ترتیب بکھرا پڑا تھا۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''دیکھ بچہ! مجھے اکثر گھر سے باہر دور دراز جگہوں پر جانا ہوتا ہے''۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''اور وہاں جن لوگوں کے گھر ہم جاتے ہیں وہاں پر ان کے مخالفین یا دشمنوں کی طرف سے کئے گئے کالے علم کی کاٹ کرتے اور مخالفین کی طرف سے متاثرہ گھر سے تعویذ وغیرہ بھی نکالنے ہوتے ہیں۔ میں تم کو کچھ طریقے سمجھا دیتا ہوں تم کچھ دن اس کام کی مشق کرنا''۔

اس نے لوگوں کے گھروں سے نکالنے کے لئے جو چیزیں بنا کر رکھی ہوئی تھیں ان میں مٹی کے تین چار انچ کے بت، دو تین لال مرچوں پر الٹے سیدھے الفاظ لکھ کر دھاگہ لپیٹ رکھا ہوتا تھا۔ آٹے کے بت میں ایک یا دو سوئیاں چبھو رکھی ہوتیں۔ انڈے پر آڑی ترچھی لکیریں ڈال دیتا۔ کئی تعویذوں پر وہ کسی جانور کا خون لگا کر سکھا لیتا۔ ساتھ کھوپڑی وغیرہ بنا دیتا اور ان تعویذوں پر مٹی مل دیتا تاکہ کاغذ پرانے نظر آئیں۔ وہ خود ہی تعویذ بنا کر لوگوں کے گھروں سے نکالتا تھا۔ پیر نے کئی دن تک مجھے سمجھانے پر لگائے کہ کس طرح تم نے لوگوں کے گھروں میں تعویذ چھپانے ہیں۔ وہ مجھے مختلف طریقے سمجھاتا رہا۔ جب اس نے محسوس کیا میں اب مکمل ٹرینڈ ہو چکا ہوں تو اس نے مجھے اپنے پاس بٹھانا شروع کر دیا۔ میرا ذمہ صرف دو تین ہی کام تھے حقہ بھرنا، بھنگ کی سردائی تیار کرنا اور کبھی کبھار پیر کی بیٹی کو سکول چھوڑنا یا لے آنا۔ وہ اس دن جب تانگے والا نہ آتا تھا۔ پکی سڑک پر چل کر جانا پڑتا تھا۔ اب میں پیر کے ساتھ پکا پکا لگ گیا تھا اور پیر مجھ سے مطمئن بھی تھا۔ کئی لوگ آ کر پیر کو اپنا دکھڑا سناتے، پیر انگلیوں اور کاغذ پر حساب کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا۔ کسی کو کہتا تمہارے ساتھ سایہ ہے، کسی کو کہتا تمہارے گھر میں حاسدوں نے تعویذ دبا رکھے ہیں اور کالا علم کر رکھا ہے۔ تمہارے گھر جانا پڑے گا اور تعویذ نکال کر ایسا حصار کھینچوں گا کہ پھر کوئی سفلی علم یا جادو ٹونہ نہیں چلے گا۔ اپنی چرب زبانی کی وجہ سے وہ لوگوں کو مرعوب کر لیا کرتا تھا۔

پیر کے ساتھ مجھے کئی گھروں میں جانا پڑتا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کس گھر میں مَیں نے کیا کیا۔ جس گھر میں تعویذ نکلنے ہوتے تھے پہلے بہانے بہانے سے پیر ان کی آمدن معلوم کر لیتا تھا۔ اسی حساب سے مجھے حکم ملتا کہ فلاں چیز اٹھا لو، میں اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ جس گھر میں یہ عمل کرنا ہوتا تھا یعنی تعویذ نکالنے ہوتے تھے اس گھر میں پہنچ کر پیر پہلے سارے کمروں اور صحن کا چکر لگاتا پھر ایک مخصوص جگہ بیٹھ جاتا۔ مجھے اپنے سامنے بٹھا لیتا اور کچھ بڑبڑانے لگتا۔ کئی قسم کے اشارے کرتا اور پھر مجھے کہتا چل بچہ پھاوڑا لے اور فلاں جگہ کھود اور ورد جو میں نے تمہیں بتا رکھا ہے، وہ

پڑھتے رہو۔

میں کھدائی اور مٹی ہٹانے کے دوران جبکہ موقع پر موجود افراد کو پیر اپنی دل فریب باتوں اور پُراسرار حرکات میں الجھائے رکھتا، موقع دیکھ کر اپنی آستین سے پیر کا دیا گیا تعویذ نیچے گرا دیتا اور اوپر مٹی ڈال دیتا جب میں مخصوص نظروں سے پیر کی طرف دیکھتا تو پیر گھر کے کسی فرد کو کہتا کہ جاؤ اور مٹی کو اِدھر اُدھر کر کے تلاش کرو کہ کیا چیز ملتی ہے۔

گھر کا بندہ مٹی اِدھر اُدھر کرتا تو اسے انڈے میں سوئیاں، کسی کپڑے میں لپٹا ہوا تعویذ اور اسی قسم کا کوئی نہ کوئی تعویذ مل جاتا۔ گھر والوں پر مزید دباؤ بڑھانے کے لئے ان کو خوب ڈرایا جاتا اور پھر اس کا توڑ کرنے کے لئے بھی الٹے سیدھے عمل کئے جاتے تھے۔

پیر روز بروز چمک رہا تھا، دور دور تک اس کی دھوم تھی، پیر کا دن عید اور رات شب برأت ہوتی تھی۔ اس کے دیگر چیلوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ بھنگ کا تو رسیا تھا ہی لیکن شراب بھی پیتا تھا لیکن یہ سب کچھ وہ الگ تھلگ رہ کر کرتا تھا۔ ایک دو چیلے بھی اس کے رازوں سے واقف تھے۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا جو اسی گھر میں ساتھ ہی رہتا تھا، گھر کا سودا سلف پیر کا بھائی لاتا تھا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔

پیر کے کرتوت سنانے لگوں تو سینکڑوں صفحات کالے ہو جائیں۔ میں بات مختصر کرتا ہوں۔ میں پیر کے کس کس فراڈ کا ذکر کروں لیکن میر، اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوں۔ اب میں نوجوان ہو چکا تھا، پیر صاحب کی بیٹی بھی دسویں کلاس میں پڑھ رہی تھی، خدا نے اس کو حسن سے نوازا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی نکھرتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھار میں اس کو سڑک کے پار تانگے پر بٹھانے جاتا تھا۔ میرا اس گھر میں ماحول اپنے گھر جیسا ہی ہو چکا تھا گویا کہ میں بھی اس گھر کا فرد تھا۔ پیر کی بیٹی جس کا نام جمیلہ تھا، جسے سب گھر والے پیار سے جمی بلاتے تھے۔ وہ گھر والوں کے لئے جمی تھی لیکن میرے دل میں وہ جم چکی تھی۔

میں اکثر تو پیر صاحب کے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن جب بھی تنہائی میں موقع ملتا میں جمی کے ساتھ ہلکی پھلکی طنز و مزاح یا چھیڑ خانی کر لیتا لیکن وہ میری کسی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔ یہ ہلکا پھلکا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، جمی نے میٹرک پاس کر لیا اور پھر اس کو گھر بٹھا دیا گیا۔ میرا گھر کے اندر آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا، حقیقت یہ ہے وہ میرے دل میں اتر چکی تھی۔

ایک دن گھر میں جمی اور ملازموں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، میں پیر کے حجرے میں بیٹھا تھا، پیر ان دنوں دورے پر تھا۔ آنے والے سائلین کو میں بتا رہا تھا کہ پیر صاحب فلاں دن واپس آئیں گے۔ اسی دوران گھر میں کام کرنے والی ملازمہ میرے پاس آئی اور کہا کہ میں ذرا کسی کام سے جا رہی ہوں، گھر کا خیال رکھنا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ آج کیوں نہ جمی سے دل کی بات کہہ دوں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔

آئے ہوئے لوگوں کو میں نے فارغ کیا اور اٹھ کر اندر زنان خانے چلا گیا۔ جمی برآمدے میں بیٹھی کشیدہ کاری کر رہی تھی۔ میں ساتھ پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کوئی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

''جمی! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں''۔ میں نے حوصلہ کر کے بات کا آغاز کیا۔

''ہاں، کہو کیا بات ہے؟'' جمی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''جمی! میں تمہیں پسند کرتا ہوں''۔ میں نے کہا۔

''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو.....'' ابھی میں کچھ اور کہنا ہی

چاہتا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پڑا میں بوکھلا سا گیا۔ سوچا بھی نہ تھا کہ اتنا شدید ردعمل ہوگا۔

''یہاں سے دفعہ ہو جا، کتے کمینے نمک حرام''۔ جمی کی آواز گونجی۔ ''شام کو میرا چچا آتا ہے تو میں ساری حقیقت اس کو بتا کر تیری ہڈی پسلی ایک کرا دوں گی۔ تیری یہ جرأت؟''

جمی وہ کچھ کہے جا رہی تھی جو میری توقع کے خلاف تھا، میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ خوبصورت ہے تو مجھ میں کیا کمی ہے، میں بھی تو ایک خوبصورت نوجوان ہوں۔ مجھ میں صرف یہ خامی ہے کہ میں ایک پردیسی ہوں جس کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ وطن۔ میرے اندر بھی پتہ نہیں کیا ابال اٹھ رہا تھا۔

''میرا اپنے دل پر اختیار نہیں ہے جمی!'' میں نے اپنے جذبات کو زبان دیتے ہوئے کہہ دیا۔ ''میرے سینے میں جو دل ہے وہ صرف تمہارے لئے ہی دھڑکتا ہے۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ اگر تم نہ ملی تو اس حویلی کی چوکھٹ پر اپنی جان دے بھی سکتا ہوں اور تمہاری جان لے بھی سکتا ہوں''۔ یہ کہہ کر میں پیر کے حجرے میں چلا گیا۔

گو کہ میں ایک اَن پڑھ اجڈ دیہاتی تھا لیکن پیر کی صحبت میں بیٹھے رہنے سے میں اب بچہ نہیں رہا تھا بلکہ ایک پختہ مرد بن چکا تھا۔ اب میں جمیلہ کو حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ شام کو نوکرانی کے ذریعے پیغام بھجوا کر مجھے اندر بلوایا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جمیلہ نے دن والا واقعہ چچا کو ضرور بتایا ہوگا لیکن میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ کئی سالوں سے میں اس گھر میں رہ رہا تھا گھر کے کسی فرد کو مجھ سے کوئی شکایت نہ تھی بلکہ میں پیر کا دست راست تھا اور گھر کا ایک فرد شمار ہوتا تھا۔ گھر والوں کو مجھ پر اندھا اعتماد تھا لیکن میں اپنے دل کے

ہاتھوں مجبور تھا۔ جمیلہ کا عشق میرے بدن میں خون کی طرح دوڑنے لگا تھا۔ یہ جذبہ صرف چند ماہ پہلے پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا اور اب عروج پر پہنچ چکا تھا۔

حویلی کے اندر داخل ہوا تو ایک کونے والے کمرے کے دروازے میں جمیلہ کا چچا کھڑا تھا اور کوئی آدمی سامنے نہیں تھا۔

''ادھر آ اوئے بے غیرت کی اولاد!'' چچا کی آواز گونجی اور ساتھ ہی اس نے مجھ پر لاتوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ جب وہ زور آ مائی کر کے تھک گیا تو چارپائی پر بیٹھ گیا، مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ میں سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جب اس کا سانس بحال ہوا تو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''یہ تیرے لئے آج پہلا نسخہ ہے۔ ہم عزت والے لوگ ہیں۔ پیر صاحب دور دور تک مشہور ہیں، ان کا ایک نام ہے اور تم ایک کتے سے بھی بدتر ہو جو ہمارا ہی کھا کر ہمیں بھونک رہے ہو۔ یاد رکھو، یہ تمہاری پہلی سنگین غلطی ہے ہم اپنی عزت کی خاطر تمہیں چھوڑ رہے ہیں اگر دوبارہ ایسی حرکت کی تو اس صحن کی مٹی میں تمہاری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی۔ اب میں یہ بات اپنے تک رکھ کر تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ اگر محترم پیر صاحب کو پتہ چل جاتا تو اب تک تم زیر زمین ہوتے''۔

اب میرے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ آتش عشق یکطرفہ تھی، دو طرفہ ہوتی تو کئی راستے کھلے تھے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی مستانی ہوتی ہے اور صرف اس پر بات ختم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی سرپرست والد والدہ بھائی رشتہ دار دوست ہو تو گرتے ہوئے کو سنبھال سکتا ہے۔ بے راہ روی کے شکار ہونے والے کو راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ کوئی اچھا دوست ہو تو اچھا مشورہ دے سکتا ہے یا پھر اپنا گھر جھکا ہو تو بندہ کوئی ناز نخرہ یا مان کر سکتا ہے۔ میرا نہ گھر، نہ کوئی رشتہ میں کس سے دل کی بات کہوں۔ دل ہی دل میں اپنا خون پی رہا تھا۔ ایک بے سہارا انسان جس کا اپنا ماضی ہے نہ حال اور نہ ہی مستقبل کا پتہ ہے۔ ایک سرائے کا مسافر کسی کا مرہون منت پرائے دیس میں کس کو سنائے اپنے دل کا حال۔ مار کھانے کے بعد میں بجھا بجھا رہنے لگا۔ حسب ضرورت پیر اپنے ہاتھ دکھانے کے لئے اور چولھوں تنوروں اور دیگر جگہوں اپنے ہی ہاتھوں بنے ہوئے تعویذ گنڈے میرے ہاتھوں سے نکالنے کے لئے مجھے ساتھ لے جاتا رہا لیکن اب مجھ میں وہ پہلے والی بات نہیں رہی تھی، میں اکثر غلطیاں کرنے لگ گیا تھا جو مجھ سے نادانستہ سرزد ہوئے جا رہی تھیں۔ اب میرا ذہن الجھ چکا تھا۔ جمیلہ میرے دل و دماغ پر مکمل حاوی ہو چکی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

پیر کے دورے پر جانے کے بعد اکثر فراغت ہی ہوتی تھی۔ جب کبھی دس پندرہ دن یا مہینے بعد موقع ملتا تو میں ہوٹل پر چلا جاتا جہاں میں نے بطور ملازم کام کیا تھا۔ پیر سے مجھے ماہانہ تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ پیر کے ساتھ جانے پر پیر کو کہیں سے اچھا نذرانہ ملتا تو واپسی پر وہ مجھے چند سکے یا کبھی کبھار ایک روپیہ دے دیتا تھا۔ میں جب ہوٹل پر آتا وہ رقم جو میرے پاس ہوتی ہوٹل کے مالک کو دے دیتا۔ اب جبکہ عشق کا بھوت میرے اعصاب پر سوار تھا، سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کیوں نا اپنے دونوں پرانے دوستوں سے مشورہ کر لوں لیکن ان کو کہاں تلاش کروں۔ پتہ نہیں کہاں ہوں گے۔ یہی سوچ کر ہوٹل کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہوٹل کے مالک سے دونوں دوستوں کے بارے میں پوچھا کہ یہاں آتے ہیں تو ہوٹل کے مالک نے کہا۔ فرزند تو کبھی کبھار آتا

Pakistanipoint
Waqar Azeem

ہے لیکن دوسرے کا پتہ نہیں، نہ میں ن اس سے پوچھا ہے۔

''اب جب فرزند یہاں آئے تو اسے کہنا کہ پیر کے ڈیرے پر مجھے ملے''۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، آیا تو میں اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا''۔ ہوٹل کے مالک نے کہا۔

میں واپس پیر کے ڈیرے پر چلا گیا۔ میرے شب و روز انتہائی تلخ ہو چکے تھے۔ کبھی تو جی کرتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں، جب دور چلا جاؤں گا تو جمیلہ آہستہ آہستہ بھول جائے گی لیکن ساتھ ہی یہ آواز بھی اندر سے اٹھتی کہ وہ کسی اور کی ہو جائے گی اور تم ہر وقت تڑپتے رہو گے، نہ جی سکو گے نہ مر پاؤ گے۔

ہفتہ دس دن اسی طرح گزر گئے، میں اندر پیر کے پاس حجرے میں بیٹھا تھا کہ باہر سے کسی نے میرا نام پکار کر کہا کہ تمہیں کوئی ملنے آیا ہے۔ مریدین کافی موجود تھے، پیر اپنے کرتب دکھا کر رقم بذریعہ ٹوکری وصول کر رہا تھا۔ میں نے پیر سے تھوڑی دیر کے لئے اجازت لی اور باہر نکل آیا۔ باہر میرا دوست فرزند کھڑا تھا۔ وہاں میں اس کو صرف پانی پلا سکتا تھا جس کے لئے ایک بڑا مٹکا پانی کا رکھا ہوا تھا جبکہ اس دور میں چائے کا رواج کافی کم تھا۔ صرف خاص خاص افراد کے لئے چائے بنتی تھی اور کھانا بھی صرف خاص مہمانوں کو ملتا تھا جبکہ مہینے میں ایک بار چاند کی گیارہویں کو دال روٹی کا لنگر چلتا تھا۔ میں نے دوست کو پانی پلایا اور ایک طرف لے گیا۔

''تم میرے بچپن کے دوست ہو فرزند!'' میں نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اور عبداللہ کے علاوہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ اگر میری بات غور سے سنو اور کوئی اچھی رائے دو تو میں بات کروں۔ اگر مذاق اڑاؤ اور میری بات کو ہوا میں اڑا دو تو بات کرنے کا

جناب پروفیسر نیامت ہنجرا کی اساتذہ کرام، اینکر پرسن، تجزیہ نگار، کالم نگاروں اور طلبا و طالبات کا تلفظ درست کرنے والی کتاب اہم کتاب ''تجویز تلفظ'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

پروفیسر نیامت ہنجرا نے 15 سال کی ریاضت کے بعد 21 ہزار مشکل ترین الفاظ پر لغات ''آؤ ہم دریافت کریں'' تیار کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں 95% اساتذہ کرام کا اُردو تلفظ درست نہیں ہے انہوں نے درست لفظ کی ادائیگی کیلئے ایک خوبصورت کتاب ''تجویز تلفظ'' تیار کی ہے۔ آرٹ پیپر 3 کلر خوبصورت انداز سے شائع کی ہے۔ اس کتاب پر محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان ،علامہ عبدالستار عاصم، محمد فاروق چوہان کی آرا شامل ہیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا ہے کہ یہ کتاب ہر صحافی، اینکر پرسن، اساتذہ کرام، خصوصاً تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو ضرور پڑھنی چاہیے اور پروفیسر نیامت ہنجرا نے 15 سال کی ریاضت کے بعد اس قدر سکہ بند علمی کام کیا ہے کہ انہیں اہل وطن کو سونے میں تولنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا علمی فنی کارنامہ ہے بلکہ یہ کتاب تمام تعلیمی اداروں کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ کتاب کا ہدیہ: 500 منی آرڈر یا چیک ارسال کر کے کتاب حاصل کر سکتے ہیں شکریہ

ملنے کا پتہ: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل والٹن روڈ بینک سٹاپ لاہور کینٹ

qalamfoundation3@gmail.com 0300-0515101 / 03008422518

کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

"تم بات کرو میری سمجھ میں تمہاری بات آ گئی تو ضرور تمہیں اچھا مشورہ دوں گا"۔ فرزند نے کہا۔

میں نے جمیلہ کے بارے میں تمام بات فرزند کو بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اس کو ہر حالت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے"۔ فرزند نے میری بات سن کر کہا۔ "بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال رہے ہو۔ تمہارا نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے، نہ تمہارا کوئی گھر ہے نہ منزل، تم غلط راہ پر چل پڑے ہو۔ یاد رکھو، گلو! تم موت تو حاصل کر سکتے ہو لیکن پیر کی بیٹی نہیں، کسی قیمت پر نہیں"۔ فرزند نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں اگر جمیلہ بھی تمہیں چاہتی ہوتی تو پھر بات کچھ اور تھی۔ میرے دوست! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے دھکے کھا رہا ہوں، میں سب اونچ نیچ سمجھ چکا ہوں جبکہ تم ایک حویلی کے قیدی ہو، تمہیں باہر کے حالات کا علم نہیں، دنیا بڑی تیزی سے آگے بڑھ چکی ہے۔ تمہارے اس اقدام کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ تم کو اس دھرتی سے اس طرح اٹھا دیا جائے گا کہ کبھی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو گی"۔

"لیکن میں نے تو تمہیں مشورے کے لئے بلوایا ہے کہ جمیلہ کو کس طرح حاصل کر سکتا ہوں"۔ میں نے کہا۔ "تم نے نصیحتوں کی پٹاری کھول دی ہے"۔

"میں نے چند دن تمہارے ساتھ ایک پلیٹ میں کھایا"۔ فرزند نے جذباتی انداز میں کہا۔ "تم نے مجھ سے راز کی بات کہہ دی ہے تو میں بھی اتنا بے نسل نہیں کہ تمہیں غلط مشورہ دوں۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا..... ایک آخری بات تمہیں بتا رہا ہوں کہ پیر بڑی پہنچ والا ہے اور اس کا چرچا دور دور تک ہے۔ یہ اپنی کرامات یا جادو ٹونہ سے تمہیں شدید سے شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے بڑی پہنچ والی سرکار ہے یہ لہٰذا میں اس سلسلے میں تمہیں اچھا مشورہ تو دے سکتا ہوں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا"۔ یہ کہہ کر فرزند خاموش ہو گیا۔

"میں پیر کی ہر حرکت، ہر کرتوت اور حیثیت سے واقف ہوں"۔ میں نے کہا۔ "اس کے پلے کچھ بھی نہیں ہے، یہ سب زبان اور ہاتھ کا کھیل ہے"۔ میں نے کہا۔

"میں مان لیتا ہوں کہ یہ ہاتھ کا کھیل ہے لیکن اس کے ہاتھ بھی تو اس کے اس کھیل کی وجہ سے بہت لمبے ہیں"۔ فرزند نے کہا۔ "بڑے بڑے پائے کے لوگ اس کے ہاتھ میں ہیں۔ میں اب جا رہا ہوں، تم اپنا خیال رکھو، اس خیال کو دل سے جھٹک دو"۔ اور پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

حسب معمول میرا زنان خانے میں آنا جانا تو رہا اور گھر کے افراد کا رویہ میرے ساتھ پہلے جیسا ہی تھا سوائے جمیلہ اور اس کے چچا کے۔ یہ ہونے والا واقعہ شاید جمیلہ اس کے چچا اور مجھ تک محدود تھا۔ شاید انہوں نے کسی کو نہ بتایا ہو گا۔ اسی طرح ڈیڑھ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ میرے اندر لگی ہوئی عشق کی آگ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جب محبت عقل کو روندتی ہوئی آگے نکل جائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کئی منصوبے ذہن میں آئے، دن گزرتے گئے کوئی تدبیر بھی سوجھ نہیں رہی تھی۔ پھر ایک پلان ذہن میں آیا اور میں نے اس کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر لیا۔

ایک دن میں ہوٹل پر چلا گیا، ہوٹل کے مالک سے اپنی رقم میں سے کچھ رقم مانگی تو اس نے اتنے سوال کر ڈالے کہ میں بوکھلا سا گیا۔

"بس ایک دوست نے ادھار مانگے ہیں جلد واپس کر دے گا"۔ میں نے کہا۔

کافی پس و پیش کے بعد اس نے مجھے چند سو

روپے دیئے پیر کی طرف سے دی گئی کچھ رقم پہلے میرے پاس تھی۔ اب میں موقع کی تلاش میں رہنے لگا اور وہ موقع آ گیا۔ حویلی میں اس دن کوئی نہ تھا، گھر میں کام کرنے والی کسی کام کے لئے کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھی، میرے اندر سے آواز اٹھ رہی تھی کہ یا تو خود اسی چوکھٹ پر مر جاؤ یا جمیلہ کو کسی اور کا نہ ہونے دینا۔ مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ حجرے میں آئے ہوئے مرید واپس جا چکے تھے، میں اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا۔ جمیلہ چارپائی پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں جا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

''جمی بی بی! میری ایک بات غور سے سن لو، اگر تم میری نہ بن سکی تو پھر کسی کی بھی نہیں بن سکو گی''۔ میں نے کسی اور ہی کیفیت میں کہا۔ ''میں اپنی جان اسی دروازے پر دے دوں گا پھر تم کہیں کی نہیں رہو گی''۔ میرے منہ سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، ایک ہاتھ سے میرے گریبان کو پکڑا اور بولی۔

''میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں لیکن تجھ جیسے کمی کمین سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں''۔ اس نے میری قمیص کو اتنے زور سے پکڑ رکھا تھا کہ چھڑانے کی کوشش میں میری پوری قمیص سامنے سے چاک ہو گئی۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہو چکی تھی اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی۔ میں اپنی جنونی کیفیت میں کچھ سن نہیں رہا تھا، بس یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا منہ اور بازو اس کے ناخنوں سے زخمی ہو چکے ہیں۔ میں پہلے تو دفاعی پوزیشن پر رہا لیکن پھر میں نے جوابی حملہ کیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ وہ میرا منہ اور بال نوچے جا رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ پھر اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور دھڑام سے چارپائی پر گر چکی گئی۔ میرے ہاتھ اسی مضبوطی کے ساتھ اس کی گردن پر تھے۔ اچانک ''ہائے اللہ یا اللہ'' کی آواز میرے کانوں میں پڑی دائیں طرف دیکھا تو ملازمہ اندر داخل ہو چکی تھی۔

''او ظالم! تم نے یہ کیا ظلم کر دیا''۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر مارتے ہوئے کہا۔

میں جمی کی گردن کو چھوڑ کر باہر کو بھاگا، نوکرانی مجھے روکنے کے لئے آگے بڑھی میں اسے زور کا دھکا دیتے ہوئے حجرے میں آ گیا۔ میری قمیص سامنے سے چاک تھی، حجرے سے اپنی دوسری قمیص اٹھائی اسی کے اوپر پہن کر حجرے سے نکل کر تیز تیز چلتا ہوا سڑک کے مخالف سمت دور نکل گیا۔ مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ جمیلہ مر گئی تھی یا زندہ بچ گئی۔

کافی دور جا کر ایک تانگہ جاتا نظر آیا، اسے روکا، لاری اڈے جانے کا کہا۔ لاری اڈے پہنچ کر سوچا کہ بس میں کسی بھی شہر کو جانا خطرے سے خالی نہیں ایک ٹیکسی روکی اور ایک شہر کا بتایا کہ وہاں جانا ہے۔ کرایہ طے ہونے پر دوسرے شہر پہنچ گیا۔ چند دن اسی شہر میں چھپ چھپا کر گزارے اور پھر ایک رات کی ریل گاڑی سے ایک دور دراز کے شہر کا رخ کر لیا۔ بہت بڑا شہر تھا لیکن میرے لئے اجنبی تھا۔ گنجان آباد علاقے سے دور نکل جاتا اور اپنے لئے کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا کہ جو شہر سے دور ہو۔ کوئی کاروبار بھی مل جائے اور رات بسر کرنے کے لئے ٹھکانہ بھی کیونکہ اب پکڑے جانے کا خوف ہمہ وقت ذہن پر سوار تھا اور انسان جتنا بھی طاقتور ہو قتل کرنے یا کوئی بھی واردات کرنے کے بعد وہ سکون سے نہیں رہ سکتا۔ اس کے اندر کا انسان اسے ہر لمحہ جھنجھوڑتا رہتا ہے۔

مختصراً یہ کہ ایک فیکٹری میں مجھے نوکری مل گئی، چھوٹی سی فیکٹری تھی جس میں صرف دس بارہ افراد کام

کرتے تھے اور وہ سب مقامی لوگ تھے۔ اس کام سے مجھے کچھ سکون مل گیا۔ پھر کئی سال تک میں نے اس فیکٹری میں کام کیا۔ میں شروع سے ہی کنجوس تھا، تنخواہ کی رقم سے کافی رقم بچا لیتا تھا۔ فیکٹری میں کام کرنے والوں میں سے ایک دو افراد سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ تینوں نے باہمی صلاح مشورہ سے ایک وین خرید لی۔ تینوں نے برابر برابر حصہ ڈالا تھا، ایک ڈرائیور بھی رکھ لیا گیا۔ آمدنی میں اضافہ ہو گیا، سال سوا سال بعد دوست نے وین اپنی طرف کر لی اور ہمیں ہماری رقم دے دی۔ اسی رقم میں اور رقم ملا کر میں نے اپنی وین خرید لی پھر ایک بزرگ کی وساطت سے شادی ہو گئی اور ہم کرائے کے مکان میں آ گئے۔ فیکٹری کا کام چھوڑ دیا۔ پانچ سالوں میں میرے پاس ایک مزدا (چھوٹی بس) اور دو وینیں ہو گئیں جبکہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا اور گلو سے گلو چوہدری بن گیا۔ ایک بیٹا اور پیدا ہوا اور ساتھی ہی ایک بنی بنائی سادہ طرز کی کوٹھی خرید کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ جمیلہ کے بارے میں اس وقت تک میں فیصلہ نہ کر سکا کہ میرا وہ اقدام ٹھیک تھا یا غلط۔ بہرحال بڑا بیٹا پڑھ کر ایک دفتر میں اچھے عہدے پر فائز ہو چکا ہے۔ بیٹی نے ایف اے تک تعلیم حاصل کر لی، بڑے بیٹے اور بیٹی کے رشتے کی باتیں چل رہی تھیں، گھر میں گھٹن کا ماحول نہیں ہے لیکن مادر پدر آزادی بھی اولاد کو نہیں دے رکھی۔ بیٹی اپنے کپڑے خود سلوانے کے لئے جاتی تھی اور اپنی پسند کے کپڑے ایک مخصوص ٹیلر کی دکان سے سلواتی تھی۔ بڑے بیٹے کے رشتے کی بات پکی ہو چکی تھی جبکہ بیٹی کے لئے آنے والا ایک رشتہ ہمیں پسند آ گیا تھا اچھے لوگ تھے، ابھی بات پکی کرنی باقی تھی میں نے بیوی کو کہا کہ بیٹی سے مشورہ کر لو، ہاں کر لوں گی آج ہی شام کو بات کر لوں گی۔ بیگم نے کہا۔

دوسرے دن جب گھر آیا تو بیوی نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ بیٹی نے اس رشتہ سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے میں اگر شادی کروں گی تو اس ٹیلر حمید سے کروں گی نہیں تو آئندہ میرے ساتھ اس موضوع پر بات نہ کرنا۔ یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا اور خاموش ہو گیا۔ بڑا بیٹا بھی باہر کھڑا یہ بات سن چکا تھا، اندر داخل ہوتے ہی اس نے تو اودھم مچا دیا۔ میں نے ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا۔

رات کھانے تک گھر میں مکمل خاموشی چھائی رہی بڑے نے چھوٹے بھائی کو بتا دیا۔ رات کھانے کی میز پر بیٹھے تو بیٹی نہ آئی، کئی دفعہ والدہ اسے بلانے گئی لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں اٹھا اور بیٹی کے کمرے میں چلا گیا۔ بیٹی چارپائی پر دوزانو بیٹھی سر تکیہ پر رکھ کر رو رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ بیٹی کے سر پر رکھا، وہ آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''بیٹا! مجھے بتاؤ وہ کون ہے جس سے تم شادی کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

کافی دیر بعد میرے بار بار تسلی دلاسہ دینے کے وہ بولی ابو حمید مجھے اچھا لگتا ہے وہ بہت اچھا انسان ہے۔

''ٹھیک ہے بیٹا! وہ اچھا انسان ہو گا لیکن کیا معلوم اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے کہاں رہتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ابو! اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو میں آپ کو بتاؤں میں اپنی دو سہیلیوں اور ایک مائی کے ذریعے تحقیق کرا چکی ہوں۔ آپ ہاں کر دیں، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی''۔ بیٹی نے کہا۔

''ٹھیس تو تم پہنچا چکی ہو بیٹی!'' میں نے کہا۔ ''تم

فکر نہ کرو، ویسے ہی ہوگا جو تم چاہو گی اگر تمہیں یقین ہے تو''۔ میں یہ کہہ کر اٹھ آیا۔

میں واپس کھانے کی میز پر آیا تو کھانے کے ساتھ پستول بھی پڑا ہوا تھا۔

''یہ پستول کس نے یہاں رکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میں نکال کر لایا ہوں، پہلے اس کا کام تمام ہوگا اور پھر اس درزی کے بچے کا''۔ بڑے بیٹے نے گرجتے ہوئے کہا۔ چھوٹے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہم اتنے بے غیرت نہیں ہیں''۔ چھوٹے نے کہا۔

''تم نے ٹھیک سوچا ہے''۔ میں نے پستول کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''کل شام تک میں دونوں کا بندوبست کرلوں گا، میں ابھی زندہ ہوں کل شام سہ پہر کو تم دونوں نے گھر آ جانا ہے''۔

کچھ بڑبڑانے کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔

میں یہاں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنا جوانی کا وقت یاد آ گیا تھا۔ میرے دماغ پر جمی کے عشق کا ایسا بھوت سوار ہوا تھا کہ میں بالکل بے خوف ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ پیر مجھے مروا دے گا یا ٹانگیں اور بازو توڑ کر عمر بھر کے لئے معذور کر دے گا۔ مجھے بس ایک ہی خیال آتا تھا کہ جمی کو ہر صورت اپنانا ہے چاہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔ یہ اصل میں ایک جنون تھا جو مجھے یہ طاری ہو گیا تھا اور اسی جنون کے عالم میں مَیں نے مشتعل ہو کر جمی کا گلا دبا دیا تھا۔

وہی جنون میں نے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ میری یا اپنی ماں کی کوئی بات نہیں مانے گی۔ وہ بغاوت پر آمادہ نظر آ رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے یہ کہہ کر ماں باپ کی عزت رکھ لی تھی کہ اگر حمید کے ساتھ شادی نہیں ہو سکتی تو پھر اس کے سامنے شادی کا ذکر ہی نہ کریں۔

سختی سے معاملہ بگڑ سکتا تھا اور ہو سکتا تھا کہ بیٹی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی عزت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے حکمت سے کام لیا۔

دوسرے دن شام کو میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو حمید کے پاس بھیجا کہ اس کو ساتھ لے آئے اور کہے کہ شادی کے کپڑے بنوانے ہیں۔ دکان کچھ دور تھی۔ اس کے آنے سے پہلے دونوں بیٹے بھی گھر آ چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد حمید بھی آ گیا اور اس کے آنے سے پہلے بھی میں نے دونوں بیٹوں کو منع کر دیا تھا کہ کوئی بات نہیں کرنی اور نہ ہی کوئی ایسی ویسی حرکت کرنی ہے۔ حمید کو لانے والے بندے سے بیٹھک میں بٹھا کر مجھے بتایا۔ میں نے اس آدمی کو فارغ کر دیا، دونوں بیٹوں کو لے کر بیٹھک میں آ گیا جہاں حمید بیٹھا تھا۔ وہ سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ پہلے اس کا خوف دور کیا۔ اس سے کئی سوال پوچھے اور اسے کہا کہ کل اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دینا۔ دوسرے دن اس کے والدین دو اور معززین کے ساتھ آ گئے۔ کیا کیا باتیں ہوئیں انہیں الگ رکھیں، مختصراً یہ کہ پانچ دن بعد شادی کی تاریخ طے پا گئی اور میری بیٹی حمید کے گھر دلہن بن کے چلی گئی۔

کئی سال ہو گئے ہیں کوئی گلہ شکوہ نہیں سکون سے زندگی گزار رہی ہے اپنے گھر میں، اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ خوش ہے۔ میرے اس عمل پر بیوی اور بیٹوں نے تھوڑی دیر کے لئے ہلکا سا ہنگامہ کیا تھا لیکن اب وہ خوش ہیں۔ پتہ نہیں میں نے ٹھیک کیا ہے یا غلط فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

(ختم شد)

آمنہ نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے، وہ جان گئی تھی کہ سجاول پر شراب اور شباب کا نشہ سوار ہے۔ اگر جائداد اور پیسہ اس کے نام کر دیا تو وہ سب برباد کر دے گا۔

بات ہے رسوائی کی

دودھ حرام

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

زور زور سے دروازہ پیٹے جانے کے ساتھ بار بار ڈور بیل بھی بجائی جا رہی تھی۔ ان آوازوں سے ڈاکٹر ریحان چیمہ کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کا اجالا ابھی پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔

''اتنی صبح صبح کون ہو سکتا ہے؟'' ڈاکٹر ریحان نے سوچا۔ ''یقینی طور پر کوئی ایمرجنسی ہو گی۔ کالونی میں رہنے والے کسی کنبے کا کوئی فرد بیمار ہو گیا ہو گا''۔

ایک تو محلے کی بات دوسرا پیشے کے فرض کا تقاضا، ڈاکٹر چیمہ لحاف سے نکل آئے۔ انہوں نے اپنے بدن پر شال لپیٹی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے نوجوان سجاول کھڑا تھا۔ سجاول ڈاکٹر چیمہ کے عین سامنے رہتا تھا۔ اس کی حالت یوں عجیب سی ہو رہی تھی جیسے پوری رات جاگتا رہا ہو۔ سر کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں نیند سے بوجھل۔ ڈاکٹر چیمہ نے پوچھا۔ خیریت تو ہے سجاول!

''مجھے کچھ پیسے چاہئیں''۔

''پیسے!'' ڈاکٹر چیمہ کو زور کا جھٹکا لگا۔ ''کتنے پیسے چاہئیں؟''

''میری کوئی ڈیمانڈ نہیں، جتنے پیسے دینے کا آپ کا دل کرے دے دیجئے''۔ اس کی حالت کی طرح اس کا لہجہ بھی عام سا نہیں تھا۔ ڈاکٹر چیمہ سجاول کی ماں آمنہ کو آنٹی کہتے تھے، انہوں نے پوچھا کہ آنٹی کہاں ہے؟ کیا پیسے مانگنے آنٹی نے بھیجا ہے؟

''نہیں میں خود اپنی مرضی سے آیا ہوں''۔ سجاول

کا ہر جواب ڈاکٹر چیمہ کی کھوپڑی گھما رہا تھا۔ سب سے الجھی بات تو سجاول کا ڈاکٹر چیمہ کا سوتے سے جگا کر پیسے مانگنا تھا۔ حالانکہ سجاول خود ایک امیر گھرانے کا لڑکا تھا۔ باپ کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد کا اکلوتا وارث، اس کی ماں کے ہاتھ میں ہمیشہ پیسہ رہتا تھا۔ ایسی صورت میں سجاول کو کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ سجاول کی مالی ضرورت اس کی ماں ہی پوری کرسکتی تھی۔

''پیسے میں دوں گا''۔ ڈاکٹر چیمہ نے کہا۔ ''تم جتنے چاہو، اتنے دوں گا لیکن اس سے پہلے میں آمنہ آنٹی سے ملنا چاہتا ہوں''۔

ڈاکٹر چیمہ اور آمنہ کی کوٹھیاں آمنے سامنے تھیں، سڑک پار کر کے دونوں وہاں پہنچ گئے۔ کوٹھی کے اندر کا منظر خون جما دینے والا تھا۔ فرش پر چاروں طرف خون ہی خون پڑا ہوا تھا اور اس کے درمیان آمنہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

''ارے..... یہ سب کیا ہے؟'' ڈاکٹر چیمہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

''پتہ نہیں''۔ سجاول نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''میں تو ایک پیگ پی کر سو رہا تھا، رات کو پتہ نہیں کس نے گھر میں گھس کر یہ سب کر ڈالا''۔

ڈاکٹر چیمہ کو پتہ تھا کہ سجاول شرابی ہے لیکن کوئی شرابی اپنے گھر کنبے کے تئیں اس قدر لاپروا ہو سکتا ہے، انہیں تصور تک نہیں تھا۔ وہ سجاول کو ساتھ لے کر کوٹھی سے باہر آ گئے۔ تب تک کچھ پڑوسی بیدار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر چیمہ نے انہیں واردات کے بارے میں بتایا تو کوٹھی کے سامنے بھیڑ جمع ہونے لگی، ہر کوئی سجاول سے اپنے سوالوں کا جواب چاہتا تھا لیکن سجاول کے پاس جیسے کوئی جواب نہیں تھا۔

☆.....☆

ٹوبہ ٹیک سنگھ رجانہ کے رہنے والے لالہ لطیف آرائیں تحصیلدار تھے، حالانکہ وہ چھوٹی نوکری سے ریاستی خدمت میں آئے تھے لیکن محکماتی ترقی کرتے ہوئے تحصیلدار کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔ ان کی شادی آمنہ سے ہوئی تھی۔ بعد میں آمنہ سے پانچ بیٹیاں ہوئیں لائبہ، رحمہ، ثمن، رباب اور بسمہ۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ہو۔

آمنہ اور لالہ لطیف آرائیں ان لوگوں میں سے تھے جو بیٹے کو بڑھاپے کی لاٹھی مانتے ہیں۔ انہوں نے اس کے لئے کوششیں شروع کیں۔ درباروں میں منتیں مانیں، ٹونے ٹوٹکے کئے۔ جنتر منتر کا سہارا لیا۔ مرادیں پوری کرنے والی اللہ کی ذات ہے، اللہ کو ان پر رحم آ گیا اور ان کی مراد پوری ہوئی اور سجاول پیدا ہوا۔ سجاول کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد لالہ لطیف آرائیں کا تبادلہ فیصل آباد ہو گیا اور انہوں نے وہیں گرین ٹاؤن میں پلاٹ خرید کر ایک شاندار کوٹھی بنوا لی اور باری باری سے اپنی چار بیٹیوں کی شادیاں بھی کر دیں۔ آرائیں میاں بیوی کی اب صرف ایک بیٹی بسمہ شادی کے لئے رہ گئی تھی۔ آمنہ اور لالہ لطیف کا خیال تھا کہ بسمہ کی شادی کرنے کے بعد وہ سجاول کی بھی شادی کر دیں گے لیکن یہ سارے خواب پورے کرنا لالہ لطیف کی قسمت میں نہیں تھا۔ ایک دن ٹوبہ ٹیک سنگھ سے فیصل آباد لوٹتے وقت وہ سڑک حادثہ کا شکار ہو گئے۔

یہ 2015ء کی بات ہے، لالہ لطیف آرائیں کو آناً فاناً فیصل آباد کے الائیڈ ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ جانچ سے پتہ چلا کہ لالہ لطیف مرے تو نہیں تھے مگر مُردے کی مانند تھے۔ سر پر مہلک چوٹ لگنے کے باعث وہ کومہ میں چلے گئے تھے پھر ایک سال کومہ میں رہنے کے بعد لالہ لطیف کی موت ہو گئی۔ ان دنوں سجاول انٹر میں پڑھ رہا تھا۔ آمنہ کا اب وہی سہارا تھا۔

شوہر کی ناگہانی موت کے بعد آمنہ کو کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں تھی۔ گاؤں میں کافی کاشت کاری کی زمین تھی، دوسری بھی جائیداد تھی، بینکوں میں مختلف منصوبوں میں پیسہ جمع تھا۔ لالہ لطیف کی موت کے بعد بھی آمنہ کو بیمہ، فیملی پنشن، پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کے طور پر لاکھوں کی رقم ملی تھی۔ اس کے علاوہ محکمہ کی طرف سے آمنہ کو پنشن بھی ملنا شروع ہوگئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ آمنہ نے اپنی پانچویں بیٹی بسمہ کی بھی شادی کر دی اس کا شوہر ریلوے میں تھا۔ اب تک سجاول انٹر پاس کر کے بی ایس سی میں پہنچ چکا تھا۔ وہ فیصل آباد جی سی یونیورسٹی کا طلب علم تھا، اس کی عمر تیئس سال کی ہو چکی تھی۔ آمنہ خاصی بوڑھی ہو چکی تھی، گھر کے کام کاج بھی اب ان سے نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے اکثر کہتی تھیں کہ گریجوایشن کے بعد سجاول سرکاری نوکری پالے تو اس کی شادی کر کے گھر گرہستی کی ساری ذمہ داری وہ بہو کے سپرد کر دیں گی اور خود اللہ اللہ کریں گی۔

24 فروری 2015ء کی شام تک سب ٹھیک تھا۔ دیر شام آمنہ نے پڑوسیوں سے گپ شپ کی تھی لیکن جب 25 فروری کی صبح ہوئی تو کالونی کے باشندوں کے لئے خوفناک پیغام بھی لائی۔ کسی بدمعاش نے تیز دھار ہتھیار سے آمنہ کو گود گود کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جب سجاول ڈاکٹر چیمہ کو اپنی کوٹھی میں لے کر آیا تب پڑوسیوں کو حادثہ کی خبر ہوئی۔ اس کے بعد تھانہ صدر کو فون کر کے واردات کی خبر دی گئی۔ کسی پڑوسن نے گرین ٹاؤن میں مقتولہ کی دو بڑی بیٹیوں کو واردات کی خبر دی تو رحمہ اور لائبہ اپنے کنبے کے ساتھ موقع پر پہنچ گئیں۔

انسپکٹر ارسلان بھی اطلاع پا کر پولیس فورس کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچ گئے۔ ارسلان نے سب سے پہلے لاش کا معائنہ کیا۔ قاتل یا قاتلوں نے تیز دھار ہتھیار کے علاوہ گلا گھونٹ کر مارنے کی بھی کوشش کی تھی جس کے نشان گلے پر صاف نظر آ رہے تھے۔ قاتل مقتولہ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اڑوس پڑوس میں پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ مقتولہ بہت بھلی خاتون تھیں۔ سب سے میٹھا بولتی تھیں اور کسی سے اس کی رنجش نہیں تھی۔ سجاول ہر طرح سے پولیس کی مدد کر رہا تھا۔ ارسلان نے اس سے اور اس کی بہنوں سے کہا کہ دیکھ کر بتائیں کہ نقدی، گہنے یا دوسرا قیمتی سامان غائب تو نہیں ہے؟

سجاول اور اس کی بہنوں نے گھر کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد بتایا کہ سب کچھ جوں کا توں موجود ہے۔ گھر سے ایک کیل تک غائب نہیں ہوئی تھی۔ واش بیسن میں خون کے داغ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آمنہ کو خون کا غسل دینے کے بعد قاتلوں نے خون آلود ہاتھ دھوئے تھے اور اطمینان سے چلے گئے تھے۔

گزشتہ رات کوٹھی میں صرف آمنہ اور سجاول تھے۔ سجاول کا کہنا تھا کہ وہ نشے میں دھت ہو کر غافل سو گیا تھا۔ صبح اٹھا تو ماں کی خون آلود لاش دیکھی۔ ارسلان نے موقعۂ معائنہ میں نوٹ کیا تھا کہ کوٹھی ہر طرف سے محفوظ تھی۔ اس میں کسی کے گھس آنے اور چپکے سے فرار ہو جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پوچھ گچھ میں سجاول اس بات کا اطمینان بخش جواب نہیں دے سکا کہ ماں کی لاش دیکھنے کے بعد وہ ڈاکٹر چیمہ کے پاس روپے مانگنے کیوں گیا تھا۔ اگر وہ پوچھ گچھ کئے بغیر روپے دے دیتے تو سجاول ان روپوں کا کیا کرنے والا تھا؟ کہیں اس کا ارادہ فیصل آباد سے فرار ہونے کا تو نہیں تھا۔ بہرحال موقع پر ضروری کارروائی کرنے کے بعد ارسلان نے آمنہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی۔ اسی دوران تھانہ صدر میں دفعہ 302 کے تحت

کیس درج کر لیا گیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ آمنہ کا گلا دبایا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی موت مہلک زخموں اور زیادہ خون بہہ جانے سے ہوئی تھی۔ بعد میں سجاول کی تینوں بہنیں بھی آ گئی تھیں۔ ارسلان نے سجاول پر شک کا اظہار اس کی بہنوں سے کیا تو پانچوں بہنیں بولیں۔

''ہم مانتی ہیں کہ جب سے سجاول کالج میں پہنچا ہے تب سے اسے بیئر، شراب وغیرہ پینے کی لت پڑ گئی ہے۔ اس کے باوجود وہ دل کا بُرا نہیں ہے۔ سجاول ماں کو کیوں مارے گا؟ پاپا کے بعد وہ دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے کا سہارا تھے''۔

اس کے باوجود ارسلان سجاول کو تھانہ لے جانا چاہتے تھے مگر گھر والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ غم زدہ کنبے کی حالت دیکھتے ہوئے ارسلان نے سجاول کو حراست میں نہیں لیا اور اپنے ذرائع سے ثبوت جمع کرنا شروع کیے تو چونکا دینے والی باتیں علم میں آنے لگیں۔ انہی معلومات اور اطلاعات کی بنیاد پر ارسلان نے سجاول کو اس کی کوٹھی سے اٹھا لیا۔ تھانے میں جب اسے تفتیش کی چکی میں پیسا گیا تو سجاول طوطے کی طرح بولنے لگا۔ باپ کے کومہ میں جانے کے بعد یار دوستوں کے کہنے پر وہ خود کو گھر کا ذمہ دار سمجھنے لگا اور ماں سے بھی ایسا سلوک کرتا جیسے کہ حکم چلا رہا ہو۔ دھیرے دھیرے سجاول اپنی مرضی کا مالک بن گیا۔ غلط قسم کے کچھ لوگوں سے اس کی صحبت ہوئی تو وہ بیئر اور وہسکی پینے لگا۔ پھر باپ کی موت کے بعد تو وہ بالکل ہی بے لگام ہو گیا۔ باپ کی ساری جائداد اور دولت ماں کے نام تھی، ظاہر سی بات تھی کہ یہ سب اس کی ہی تھی مگر سجاول سے انتظار اور صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گوجرہ کی رہنے والی ثانیہ سے سجاول کو پیار ہو گیا تھا اور دونوں شادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔

ایک دن سجاول ثانیہ کو گھر لے آیا۔ آمنہ نے جب سجاول سے ثانیہ کے بارے میں پوچھا تو سجاول نے بتا دیا کہ وہ ثانیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آمنہ نے ثانیہ سے بات چیت کی اور اسے گھر بھیج دیا۔ آمنہ کے حساب سے ثانیہ میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ غیر ذات کی تھی اور آمنہ اپنے سماج سے باہر کی بہو لانا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے باتوں اور لہجے سے ثانیہ آمنہ کو ٹھیک نہیں لگی تھی، اسی لئے آمنہ نے ثانیہ کے ساتھ سجاول کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

آمنہ کے انکار سے سجاول نے خود کو دل جلا بنا لیا۔ پورا دن وہ شراب کے نشے میں دھت پڑا رہنے لگا۔ شراب کے لئے پیسے بھی وہ آمنہ سے مانگتا تھا۔ آمنہ پیسے نہیں دیتی تھی تو وہ گھریلو سامان توڑنا، پھینکنا شروع کر دیتا تھا۔ مجبوری میں آمنہ کو اسے شراب کے لئے پیسے دینا پڑتے۔ سجاول کو ماں کے فیصلے کی پروا نہیں تھی، وہ ثانیہ سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ نہ اس کے نام ایک انچ زمین تھی نہ کسی بینک میں ایک روپیہ۔ قانونی لڑائی لڑ کر پشتینی جائداد میں اپنا حصہ لے پانے کی حیثیت میں بھی وہ نہیں تھا اس لئے اس نے ماں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ زمین، کوٹھی، بینک کھاتے وغیرہ سب کچھ اس کے نام ٹرانسفر کر دے۔ آمنہ نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے، وہ جان گئی تھی کہ سجاول پر شراب اور شباب کا نشہ سوار ہے۔ اگر جائداد اور پیسہ اس کے نام کر دیا تو وہ سب برباد کر دے گا۔ اسی لئے اس نے پیسہ سجاول کے ہاتھ میں دیا نہ زمین و جائداد پر اس کا نام چڑھوایا۔

بس، یہیں سے سجاول کے دماغ میں خبط سوار ہونے لگا کہ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے باپ کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد کا اکلوتا وارث وہی ہے لیکن ماں اس

میں اپنی پانچوں بیٹیوں کو بھی برابر سے حصہ دینے کا منصوبہ بنا رہی ہیں۔ ایسا ہونے پر جائداد چھ حصوں میں تقسیم ہو جاتی اور صرف ایک حصہ سجاول کے حصے میں آتا جو سجاول کو قطعی منظور نہیں تھا۔

اسی سوچ کی وجہ سے سجاول نے دھن دولت پر قبضہ جمانے کے لئے آمنہ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ آمنہ نے اسے ثانیہ سے میل جول بڑھائے رکھنے سے سختی سے منع کر دیا تو سجاول کو ماں کی یہ بات منظور نہیں تھی۔ دونوں نے طے کر رکھا تھا کہ چاہے جو ہو جائے زمانے سے لڑ کر انہیں ایک دوسرے کا ہونا ہے۔

چاہت کے اس جنون میں آمنہ کہیں باہر گئی ہوتی تب سجاول فون کر کے ثانیہ کو بلا لیتا مالکن کی طرح ثانیہ پوری کوٹھی میں دندناتی پھرتی۔ سجاول کے بیڈ روم کو اپنے بیڈ روم کی طرح استعمال کرتی۔ اس وقت بیڈ پر دونوں میاں بیوی کے کردار میں ہوتے تھے۔

24 فروری 2015ء کی دوپہر کو آمنہ نے ثانیہ اور سجاول کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا۔ کوٹھی میں یہ گناہ دیکھ کر آمنہ کی بوڑھی ہڈیاں کڑکڑنے لگیں اور اس نے بے شرم ثانیہ کو فوراً کوٹھی سے باہر نکال دیا، پھر سجاول کی خبر لی اور اس سے کہا کہ اگر اس نے ثانیہ کو نہ چھوڑا تو وہ اسے اپنا دودھ نہیں بخشے گی۔ مگر اس وقت سجاول کو پیدا کرنے والی ماں اپنی سب سے بڑی دشمن دکھائی دے رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ جب تک ماں زندہ ہے اس کی حیثیت زیرو رہے گی۔ پشتینی دھن دولت کا مالک بننا ہے تو آمنہ نام کی اس عورت کو راستے سے ہٹانا ہوگا اور اس نے ماں کے خون سے ہاتھ رنگنے کا فیصلہ کر لیا۔

واردات والی رات نشے میں دھت ہو کر سجاول گھر لوٹا تب تک اس کا انتظار کرنے کے بعد آمنہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ اس کا کھانا اس نے اس کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ آمنہ نے مین گیٹ کھلا چھوڑ دیا تا کہ سجاول کو کوٹھی میں آنے میں دشوار نہ ہو۔ سجاول نے کوٹھی میں داخل ہو کر گیٹ اندر سے بند کر دیا اور کمرے میں آ کر کھانا کھایا اور برتن کچن کے سنک میں ڈال آیا۔ اس کے بعد کچن میں رکھا تیز دھار چھرا لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سجاول نے بیڈ پر لیٹ کر کچھ دیر انتظار کیا، جب اسے یقین ہو گیا کہ آمنہ گہری نیند سو گئی ہو گی تب وہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ آمنہ بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ سجاول جھٹ سے اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے ماں کا گلا دبانے لگا۔ آمنہ نے بچنے کی کوشش کی۔ وہ گلا دبنے سے چلا بھی نہیں سکی اور سانس رکنے سے وہ بے ہوش ہو گئی۔ آمنہ بچ جائے، سجاول ایسا کوئی خطرہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا اس لئے اس نے اٹھ کر چھرے سے آمنہ کو گود ڈالا اور اس کی موت کا اطمینان کر کے واش بیسن میں ہاتھ دھوئے، اپنے کپڑوں پر لگا خون صاف کیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ اگر آدمی کی دماغی حالت خراب ہو تو اس کے ہاتھوں ہوئے جرم کی سنگینی کم ہو جاتی ہے۔ سجاول بھی اپنی دماغی حالت خراب اور غیر متوازن دکھانا چاہتا تھا، اسی لئے وہ ڈاکٹر چیمہ کے پاس پیسے مانگنے گیا تھا۔

بہر حال سجاول کی نشاندہی پر پولیس نے قتل میں استعمال شدہ چھرا بھی برآمد کر لیا۔ تادم تحریر سجاول جیل میں تھا اور اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا لیکن ماں کو قتل کرنے کے بعد وہ سب کی نفرت کا مرکز بن گیا ہے۔

منتوں مرادوں سے لئے ہوئے بیٹے نے ماں کا دودھ حرام کر دیا تھا۔

میں بھول نہیں سکتی

زود پشیمان

میرے رب نے میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی میری فریاد سن لی تھی۔ وہاں سے کسی این جی اوز کی گاڑی گزر رہی تھی، یہ این جی اوز نشے کے شکار لوگوں کا علاج کرواتی تھی

☆ سیدہ شاہدہ شاہ

کہانی شروع کرنے سے پہلے میں محترم بھائی اعجاز حسین ستھار کے خط کے حوالے سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے جولائی کے شمارے میں میری کہانی ''سات سمندر پار'' کے حوالے سے کچھ باتوں کی وضاحت چاہی تھی۔ مصروفیات کی بناء پر جواب نہ دے سکی اور اب اگست کے شمارے میں انہوں نے میری کہانی ''کمانڈو'' کے حوالے سے اپنے موقوف کے حوالہ سے وضاحت چاہی ہے۔

اعجاز بھائی! بیرون ملک غیر قانونی طور پر جانے والے کس طرح وہاں قانونی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں، اس بارے میں بہتر ہوتا کہ آپ ''حکایت'' کے اوراق میں ہی وضاحت فرما دیتے تاکہ بہت سے تارکین وطن کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ جو لوگ بیرون ملک جا کر پلٹ کر اپنے ماں باپ کی خبر نہیں لیتے اور ہر استفسار کے بعد یہی جواب ملے کہ ابھی میں ''چھپ چھپا'' کر رہا ہوں اور جو ماں باپ بہن بھائیوں کی خوشی غمی میں شامل نہ ہو سکیں۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ یا تو غیر قانونی طریقے سے رہ رہے ہیں یا پھر وہ وہاں کی رنگینیوں میں کھو گئے ہیں۔ یہ کہانی میری انتہائی قریبی ہستی کی ہے اور اس کے سفر آخرت کے تمام تر واقعات اور ان کے مخفی حالات کی عینی شاہد ہوں۔ اس لئے انہی کی بیٹی کے بقول ان کے بھائی ابھی تک غیر قانونی طور پر مقیم ہیں۔

آپ نے کمانڈو کے حوالے سے اپنا مؤقف پیش کیا ہے تو میرے بھائی! میں نے کئی شہداء کی کہانیاں لکھی ہیں، بے شک وہ قرآنی حوالے سے کہ ''شہید زندہ ہوتے ہیں'' لیکن ان شہداء کے ورثاء کو میں نے تنہائیوں میں بلک بلک کر روتے دیکھا ہے۔ ''ہلال'' کے ایک شمارے میں جہلم شہر کے میجر (ریٹائرڈ) ڈاکٹر یوسف کے بیٹے کیپٹن معظم شہید کی کہانی میں نے لکھی اور اسی طرح اپریل 2017ء کے ''ہلال'' میں میں نے سپاہی وقاص حسین شہید کی کہانی لکھی۔ ان دونوں کے گھر جب میں ''ہلال'' کے شمارے لے کر گئی تو وہاں میں نے ان گھروں میں قبرستان کا سا سناٹا اور مرگھٹ کی سی ویرانی دیکھی۔ کیپٹن معظم شہید کے والد میجر یوسف کی کمر جھک گئی ہے۔ اتنی وسیع و عریض کوٹھی میں اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہے ہیں اور کیپٹن معظم شہید کی بچپن سے لے کر شہادت تک ہر چیز کو انہوں نے گھر کے ایک کمرے میں ''میوزیم'' کی طرح سجا رکھا ہے۔ جسے وہ ہر ملنے والے کو دکھاتے ہیں۔ ایسے سے ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو ابل ابل آتے ہیں۔

سپاہی وقاص حسین شہید کی والدہ آج بھی اس کی یاد میں بلک بلک کر روتی ہیں، اس کی خریدی ہوئی موٹر سائیکل کو خود اپنے ہاتھوں روزانہ صاف کرتی ہیں، اس کی ایک ایک بات کو یاد کر کے روتی ہیں۔

اعجاز بھائی! انسان جذبات کے خمیر سے گندھا ہوا ہے اور جذبوں پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ اس لئے یہ کہنا کہ شہید کے لئے رونا یا اداس ہونا جائز نہیں تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آنسو اور جذبات اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔

امید ہے، آپ کی تشفی ہو گئی ہو گی۔ آپ کو شاید اپنے احساسات و جذبات پر اتنی قدرت حاصل ہو گی مگر ہر کوئی اس کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا۔

آیئے، اب کہانی پڑھیں۔

زندگی کے تپتے ہوئے ریگزاروں پر تن تنہا چلتے چلتے میں اب تھک چکی ہوں۔ میرے پاؤں چھلنی چھلنی اور ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔ میری ویران اور تنہا زندگی میں دور دور تک کسی رشتے، کسی ناطے، کسی اپنے گھنیرے سائے کی کوئی بھی چھاؤں نہیں جہاں بیٹھ کر اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دوں۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ اسی ''دارالامان'' میں مجھ کرموں جلی کی زندگی کی شام ہو جائے گی اور مجھ لاوارث کو کسی گمنام قبر میں دفن کر دیا جائے گا اور پھر وقت کا چلتا ہوا کارواں میری گمنام قبر کو یوں مٹا ڈالے گا کہ اس کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔

ویسے بھی قبروں کو ورثاء ہی کبھی بے نام و نشاں نہیں ہونے دیتے۔ وہ تو ان قبروں کو زمین سے کئی فٹ

اونچے چبوترے پر بنا کر انہیں قیمتی پتھروں سے پختہ بنا دیتے ہیں کہ قیامت تک نہ سہی مگر ایک طویل عرصے تک ان قبروں کے نشاں باقی رہیں تاکہ ورثاء کے ساتھ ساتھ ہر گزرنے والا بھی عید تہوار کے علاوہ جب بھی ادھر سے گزرے، اس پر فاتحہ خوانی کر سکے۔

میں بدنصیب تو برسوں پہلے اپنے ہی ہاتھوں اپنی خوبصورت جنت کو آگ لگا کر خوشیوں کے اس سراب کے پیچھے پیچھے چل پڑی جہاں سے واپسی کی تمام راہیں بھول گئی اور پھر اس سراب کو حقیقت جان کر بھٹکتے بھٹکتے میں اپنی خوبصورت جنت، جی جان سے پیار کرنے والا شوہر اور اپنی پیاری پیاری سی دو بیٹیوں کو بھی کھو بیٹھی۔

میری کہانی میں شاید آپ کو کوئی چاشنی، کوئی لذت نہ ملے مگر میں اس امید پر اپنے سینے کے وہ انگارے اگل رہی ہوں جن کی حدت میں میں برسوں سے جھلس رہی ہوں کہ شاید میری یہ کہانی پڑھ کر بہت سے لوگ راہِ راست پر آ جائیں۔ بہت سے والدین کو یہ احساس ہو جائے کہ بسا اوقات ذرا ذرا سی تلخ کلامیاں ان کی اولاد کو محرومیوں کے ان صحراؤں میں لے جاتی ہیں جہاں ہر سُو پیار کے سراب ان کو راہ راست سے یوں بھٹکا دیتے ہیں کہ وہ ساری زندگی محبتوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے بالآخر میری طرح ''دارالامان''، ''سائبان''، ''اپنا گھر'' اور نہ جانے کن کن اداروں میں جا پناہ لیتی ہیں اور پھر میری ہی طرح ایک روز گمنامی کی موت مر جایا کرتی ہیں۔

میرا نام تو والدین نے کچھ اور رکھا تھا مگر آپ مجھے ثریا کہہ سکتے ہیں۔ میں اپنا نام، پتہ، شہر اور موجودہ پتہ بالکل نہیں بتاؤں گی کیونکہ میں اپنے والدین، اپنے خاندان اور اپنے خاوند (سابقہ) اور اپنی بیٹیوں کی بدنامی نہیں چاہتی۔ میری بیٹیاں اب ماشاء اللہ جوان ہو چکی ہوں گی، میرے سابقہ خاوند نے انہیں یقیناً یہ بتا دیا ہوگا کہ ان کی ماں مر چکی ہے۔ میں واقعی ان سب کے لئے مر چکی ہوں۔ اب دوبارہ زندہ ہو کر ان کی زندگیوں میں رسوائیوں کی غلاظت نہیں بکھیرنا چاہتی۔

میں نے ایک ایسے غریب گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں ہم چار بہنیں، بیمار اور ہمہ وقت کھانستی ہوئی ماں اور ہمہ وقت مشقت کی چکی میں پستا ہوا باپ تھا۔ میرے ماں باپ اگرچہ اتنے عمر رسیدہ نہ تھے مگر مناسب علاج نہ ہو سکنے اور دن رات کی محنت مشقت نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا اور سن رسیدہ کر دیا تھا۔ میرا باپ ایک ٹیکسٹائل مل میں ملازم تھا جہاں سے فارغ ہو کر وہ ایک دو جگہوں پر پارٹ ٹائم کام کرتا جبکہ میری ماں لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے زندگی کی گاڑی گھسیٹنے میں اپنی بساط کے مطابق میرے باپ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ جب کہ ہم چاروں بہنیں کسی خودرو جنگلی بیل کی طرح تیزی سے جوانی کی طرف گامزن تھیں۔

میں اپنی بہنوں میں عمر سے سب سے بڑی تھی۔ غربت بذات خود وہ بڑا عیب ہے جو انسان کو معاشرے کی نظروں سے گرا تو دیتا ہے مگر گھر کی چاردیواری سے اطمینان اور سکون بھی چھین لیا کرتا ہے۔ میری ماں اور میرا باپ تو اَن پڑھ تھے ہی ہم چاروں بہنیں بھی غربت کے باعث سکول نہ جا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گھر میں ہر وقت معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا ہونے لگا۔ کبھی باپ میری ماں پر چیخ چلا اور مار کٹائی کر رہا ہوتا اور کبھی ماں ہاتھ نچا نچا کر اور کھانس کھانس کر میرے باپ کو بد دعائیں اور طعنے دے رہی ہوتی۔ کبھی ہم بہنیں آپس میں دست و گریباں ہو رہی ہوتیں تو کبھی ماں باپ دونوں ہی ہمیں گالیاں اور کوسنے دے رہے ہوتے۔

ایسے تلخ اور سلگتے ہوئے ماحول میں ہم پرورش پا

رہی تھیں۔

میں جب سولہ سال کی ہوئی تو ماں نے کہہ سن کر مجھے ایک امیر گھرانے میں کام کاج پر لگوا دیا۔ یوں گھر میں اضافی آمدن کے ساتھ ساتھ مجھے گھر کے لڑائی جھگڑوں سے بھی قدرے نجات مل گئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اب میں شعور کی ان منزلوں کو پہنچ چکی تھی۔ جہاں انسان کی پلکوں پر مستقبل کے خوبصورت مگر مبہم سے خواب تھرتھرانے لگتے ہیں۔ خصوصاً مجھ جیسی لڑکیاں جنہوں نے غربت اور لڑائی جھگڑوں والے تلخ اور سلگتے ہوئے ماحول میں آنکھ کھولی ہو۔ وہ تو اوائل شباب میں ہی سنہرے خوابوں کی تعبیر میں وقت سے پہلے ہی اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، گھر بار حتیٰ کہ اپنے معاشرے سے باغی ہو جایا کرتی ہیں۔ میں اپنے افلاس زدہ گھر میں اپنے آپ کو قیدی سمجھتی تھی۔ ہر وقت گالی گلوچ، تُو تکار اور مار پیٹ سے دل گھبرا سا جاتا تھا مگر ماں نے جب مجھے کام کاج پر لگوایا تو گویا مجھے گھر کے پنجرے سے کسی پنچھی کی طرح آزادی مل گئی۔ میری یہی کوشش تھی کہ گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے زیادہ سے زیادہ دور رہ سکوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس گھر میں زیادہ محنت سے اور دل لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ میری ماں صبح سے لے کر شام تک چار گھرانوں میں کام کاج کرتی تھی مگر میں اسی ایک گھر میں صبح سے لے کر شام تک کام میں جتی رہتی۔ یہ گھرانا میرے اس کام سے اتنا خوش ہوا کہ انہوں میرے ماں باپ سے کہہ سن کر مجھے کل وقتی ملازمہ رکھ لیا۔ میرے ماں باپ خوش تھے کہ چلو گھر سے کھانے پینے والا ایک فرد کم ہوا اور میں خوش تھی کہ میری گھر کے زہریلے ماحول سے جان چھوٹی۔

یہ گھرانا جہاں میں کام کرتی تھی، ایک صاحبِ حیثیت گھرانا تھا۔ دو بیٹے بیرون ملک مقیم تھے۔ بیٹیاں بیاہ کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ گھر میں ملک بشیر جو ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے، ان کی بیوی جو کالج میں پرنسپل تھی اور ایک بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ کھانا پکانے کے لئے ایک باورچی تھا جو ڈرائیور اور چوکیدار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ البتہ میں بیگم صاحبہ کی خوابگاہ سے ملحق کمرے میں سوتی تھی۔ ملک بشیر اور ان کی بیگم نے مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ میں جب چاہوں اور جتنے دن کے لئے چاہوں گھر چلی جایا کروں مگر یہاں کا پُرسکون ماحول مجھے کچھ یوں بھا گیا تھا کہ میرا اپنے گھر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہاں کام کرتے تقریباً دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چلا تھا مگر میں صرف عید تہوار پر ہی اپنے گھر گئی تھی، وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے۔

زندگی بڑے سکون، بڑے اطمینان کے ساتھ گزر رہی تھی کہ اچانک میری پُرسکون زندگی کی جھیل میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور یہ تلاطم برپا کرنے والا کوئی اور نہیں ملک بشیر صاحب کا خاص ملازم سلیمان تھا۔ وہ سلیمان جو ان کا باورچی، ڈرائیور، چوکیدار اور غرضیکہ سب کچھ تھا۔ میں اکثر ملک بشیر صاحب، ان کی بیگم اور بسا اوقات اکیلی بھی اس کے ساتھ اکثر کار میں آتی جاتی رہتی تھی۔ خصوصاً جب میں نے اپنے والدین سے ملنے جانا ہوتا۔ سلیمان اس دوران اکثر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہتا مگر ایک روز جب ہم بیگم صاحبہ کو کالج اتار کر واپس لوٹ رہے تھے تو تنہائی میں پہلی بار سلیمان نے کھل کر اپنی چاہت کا اظہار کر دیا۔ یہ میری گھریلو تلخ زندگی کی فطرتی محبت کی تشنگی تھی یا پھر میری عمر کا تقاضا کہ میں نے سلیمان کی محبت قبول کر لی اور ہم سب کچھ بھلا کر محبت کی شاہراہ پر چل پڑے۔

اسلام وہ آفاقی اور سچا مذہب ہے جس کے تمام

کے تمام ضابطۂ حیات فطرت کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ اگر اس نے کسی غیر مرد اور غیر عورت کے آزادانہ میل جول پر پابندی لگائی ہے تو اس کی اپنی ایک حکمت ہے۔ اگر اس نے عورت اور مرد کے جوان ہوتے ہی جلد از جلد شادی کر دینے کا حکم دیا ہے تو اس میں بھی ایک دانائی پوشیدہ ہے۔ کیونکہ فطرت کے تقاضوں کے سیلِ رواں کے سامنے بند نہیں باندھے جا سکتے۔

ہمارے بھی اس آزادانہ میل ملاپ کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم گناہوں کا یہ کھیل بڑی آزادی سے کھیلنے لگے۔ بیگم صاحبہ کالج چلی جاتیں، ملک بشیر اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہوتے یا سٹڈی روم میں کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے اور میں سارے گھریلو کام نمٹا کر سلیمان کے سرونٹ کوارٹر میں چلی جاتی جہاں ہم گناہ کا کھیل جی بھر کر کھیلتے اور بیگم صاحبہ کے کالج سے واپس لوٹنے تک میں واپس اپنے کمرے میں آ جاتی۔

ہمارا گناہوں کا یہ کھیل زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور ایک روز جبکہ ہم گناہوں کے اس شرمناک کھیل میں اس قدر مگن تھے کہ کوارٹر کا دروازہ بند کرنا بھول گئے، ملک بشیر صاحب غالباً کسی ضرورت کے تحت اٹھے ہوں گے مگر مجھے اپنے کمرے میں نہ پا کر اور سلیمان کو گیٹ پر موجود نہ پا کر وہ سرونٹ کوارٹر کی طرف چل پڑے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، ہمیں پتہ بھی نہ چلا اور ملک بشیر صاحب ہمارے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہمیں اس شرمناک حالت میں دیکھ کر پہلے تو ان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے، دوسرے ہی لمحے فرطِ غیظ و غضب سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر آدمی جہاندیدہ تھے، جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور خاموشی سے واپس چلے گئے۔ ہم ششدر رہ گئے، جلدی جلدی اپنی حالت درست کی اور سلیمان گیٹ پر جبکہ میں واپس

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں

مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

ریمینل

شربت

تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارض مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا نہ آنا، کثرت ریاح، سانس کا پھولنا، تیزابیت معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا ہونے والے امراض کے لئے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں

یاسر اعوان (ایڈووکیٹ)
انچارج لیگل سیکشن

ممتاز دواخانہ (پرائیویٹ) لمیٹڈ — میانوالی
فون: 0311-7359072
0334-6447660

کمرے میں آ گئی۔

اسی شام ہماری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ملک بشیر صاحب نے اسی روز سلیمان کو نوکری سے نکال کر نیا ادھیڑ عمر ملازم رکھ لیا جو چوکیداری، کھانا پکانا اور ڈرائیوری بڑے اچھے طریقے سے کر لیتا تھا جبکہ مجھے اگلے روز کافی کچھ دے دلا کر نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ چونکہ ملک بشیر صاحب نے بیگم صاحبہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اس لئے بیگم صاحبہ نے بھی مجھ پر خصوصی نوازشات کیں۔

میں واپس اپنے گھر آ گئی تھی مگر اب میں وہ پہلے والی ثریا نہ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کے گھر میں متمول ماحول، اچھی خوراک، اچھے لباس نے نہ صرف میری خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے بلکہ اوڑھنے پہننے کا سلیقہ بھی آ گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری بے راہ روی کی داستانیں گھر کی چاردیواری سے نکل کر پورے محلے بلکہ گلی گلی، قریب قریہ گونجنے لگیں۔ میرے ماں باپ نے میری بے راہ روی پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی مگر میں تو وہ تیز و تند ندی بن چکی تھی جو ہزار سنگلاخ اور مضبوط چٹانوں میں سے بھی اپنا راستہ بنا لینے کی اہلیت رکھتی ہے۔

انہی دنوں میرے لئے ایک رشتہ آیا، لڑکا سعودی عرب میں اچھی جاب کرتا تھا اور ان دنوں چھٹی آیا ہوا تھا۔ میرے والدین نے کچھ میری بے راہ روی کو لگام ڈالنے اور کچھ اس ڈر سے کہ میری وجہ سے میری دوسری بہنیں بھی غلط راستوں پر نہ چل پڑیں، انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا اور فوراً میری شادی کر دی گئی۔ ملک بشیر صاحب اور ان کی بیگم نے میری شادی کے تمام تر اخراجات خود اٹھائے حتیٰ کہ کپڑے، زیورات اور جہیز وغیرہ کا انتظام بھی انہوں نے خود کیا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شادی کے بعد میں ہر گناہ، ہر بے راہ روی سے تائب ہو جاتی مگر گناہوں کی یہ دنیا مجھ جیسی گناہوں میں ڈوبی ہوئی اولادِ آدم کو اتنی حسین، اتنی دلکش لگتی ہے کہ وہ اس غلیظ دلدل سے نکلنا ہی نہیں چاہتی۔ میرا خاوند ثاقب چھٹی گزار کر واپس چلا گیا اور میں نے پھر وہی بے راہ روی اپنا لی۔ گھر میں میری ساس، سسر، دو نندیں اور ایک دیور تھا۔ میں ان کو اپنے میکے کا بتا کر گھر سے نکلتی اور جگہ جگہ جھک مارنا شروع کر دیتی۔ میری ساس سسر نے مجھ پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی مگر میں نے انہیں لتاڑ کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی میں نے اپنے خاوند ثاقب کو فون کر دیا کہ تمہارے ماں باپ مجھے میرے والدین سے ملنے سے روکتے ہیں، اس لئے فوری طور پر چھٹی لے کر آؤ اور مجھے علیحدہ مکان لے کر دو۔ میں نے اپنے خاوند کو اس حد تک مجبور کیا کہ وہ بے چارہ ایمرجنسی ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا اور دوسرے ہی روز ہم اپنے محلے سے دور کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ شوہر کی موجودگی میں میں نے احتیاطاً اپنی تمام سرگرمیاں وقتی طور پر ختم کر دی تھیں۔

میرے خاوند کی چھٹی ختم ہونے میں ایک ہفتہ باقی تھا جب مجھ میں ماں بننے کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میرے خاوند کو پتہ چلا تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔ اسی شام مجھے ایک معروف لیڈی ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں چیک کروایا گیا تو لیڈی ڈاکٹر نے مختلف قسم کے ایمرجنسی ٹیسٹ لے کر میرے ماں بننے کی تصدیق کر دی۔ میرے خاوند کے تو مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

دوسرے روز اس نے مزید پندرہ دن کی چھٹی اپلائی کر دی، جو منظور تو ہو گئی مگر ساتھ ہی یہ وارننگ دے دی گئی کہ اس کے بعد مزید چھٹی کی گنجائش نہیں ہے۔

میرا خاوند چھٹی گزار کر چلا گیا اور میں اپنی پرانی روش پر چل نکلی، البتہ اب میں نے یہ احتیاط برتنی شروع کر دی تھی کہ کسی کو بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں ہر ماہ لیڈی ڈاکٹر کو باقاعدگی سے اپنا چیک اپ کروا رہی تھی۔ میرے خاوند نے اب پہلے سے زیادہ پیسے بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ ساتھ ہی انتہائی قیمتی تحفے، آنے والے مہمان کے لئے کپڑے، کھلونے، اور طرح طرح کی چیزیں ہر کسی آنے جانے والے کے ہاتھ بھیج دیا کرتا تھا۔ ایک روز میں معمول کے مطابق لیڈی ڈاکٹر کو چیک کروانے گئی تو وہاں لیڈی ڈاکٹر کی گاڑی کے پاس سلیمان کو کھڑے گاڑی صاف کرتے دیکھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میری زندگی میں آنے والا یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے گناہ سے رُوشناس کرایا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکی، وہ بھی مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا، ہم کم و بیش چار سال کے بعد ملے تھے۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اب وہ اسی لیڈی ڈاکٹر کے ہاں نوکری کرتا ہے اور انہی کے گھر ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے۔ میں نے بھی اسے اپنے بارے میں مختصراً سب کچھ بتا دیا اور اسی دوران اسے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ اسی دوران میری باری آ چکی تھی چنانچہ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا اور واپس گھر آ گئی۔

وقت مقررہ پر میں نے دو جڑواں بچیوں کو جنم دیا جن کے نام بالترتیب فریدہ اور حمیدہ رکھے گئے۔ بچیاں انتہائی خوبصورت اور تیکھے نین نقوش والی تھیں جو بھی دیکھتا۔ بے اختیار پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ بچیوں کی پیدائش پر میرے میکے اور سسرال سے سارے مبارکباد دینے آئے۔ مگر میرے سر درد رویئے کی وجہ سے وہ تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ البتہ ماں میرے ساتھ ہی گھر آ گئی اور جس روز میں نے غسلِ صحت کیا۔ میری ماں بھی اسی روز واپس چلی گئی۔

فریدہ اور حمیدہ کی پیدائش پر میرے خاوند نے چھٹی کی انتہائی کوشش کی مگر انہیں چھٹی تین ماہ بعد مل سکی وہ بھی صرف بیس دن کی۔ ثاقب ننھی منی پھول سی بچیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بے اختیار دونوں کو بیک وقت اٹھا کر دیوانہ وار چومنے لگا۔ وہ اپنے ساتھ میرے لئے اور بچیوں کے لئے بہت سے قیمتی کپڑے اور دیگر چیزیں لایا تھا۔ ایسے موقع پر اس نے یہ تجویز پیش کی۔ اب چونکہ چھوٹی بچیوں کی بدولت ہماری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں واپس گھر چلے جانا چاہئے۔ میں اپنی ماں کی تربیت یافتہ تھی۔ سب سے بڑھ کر اَن پڑھ تھی جس کی وجہ سے تنگ ذہن اور اجڈ گنوار تھی اس لئے میں نے اس کے وہ لتے لئے کہ اسے اپنی یہ تجویز واپس لینی پڑی۔ ویسے بھی اب میں دو بیٹیوں کی ماں تھی اور سیانے کہتے ہیں کہ اولاد والی عورت ہمیشہ مرد پر بھاری ہوتی ہے۔ البتہ میرے مشورے بلکہ میرے کہنے پر گھریلو کام کاج اور بچیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک لاوارث بوڑھی عورت کل وقتی اور ملازمہ رکھ لی گئی جس کو رہنا بھی ہمارے گھر ہی تھا۔

میرے خاوند کی چھٹی ختم ہو گئی تھی، وہ واپس چلا گیا تھا۔ بوڑھی ملازمہ جس کا نام صغریٰ تھا اور سارے اسے ''ماسی صغراں'' کہتے تھے، نے پورے گھر کے ساتھ ساتھ دونوں بچیوں فریدہ اور حمیدہ کو بھی بخوبی سنبھال لیا تھا۔ وقت پر ان کو فیڈر دینا، وقت پر سلانا، وقت پر نہلانا، کپڑے بدلنا، یہ تمام معمولات اس نے بہ احسن و خوبی سنبھالے ہوئے تھے۔

بچیاں اب دو دو سال کی ہو گئی تھیں، مجھ سے زیادہ وہ ''ماسی صغراں'' سے مانوس تھیں۔ اتنی ننھی سی عمر

میں ہی وہ اس کو یوں پہچاننے لگی تھیں کہ اس کو دیکھ کر کھل اٹھتیں۔ اسے ''اماں''، ''اماں'' پکارتیں۔ اس کی گود میں ہی چڑھی رہتیں حتیٰ کہ اسی کے پاس سوتی تھیں۔ میں اگر انہیں اپنے پاس بلاتی، یا اٹھاتے ہوئے چومنے کی کوشش کرتی تو وہ رونے لگتیں اور مچلتی ہوئی گود سے نیچے اتر جاتیں۔

میں یہ تلخ حقیقت بھول گئی تھی کہ بچے ہوں یا بڑے، جوان ہوں یا بوڑھے سب کے سب عمر کے ہر حصے میں محبتوں اور پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ انہیں جہاں سے اور جس سے بھی پیار ملتا ہے وہ سدا کے لئے اسی کے ہو جاتے ہیں۔

میری مثال میرے سامنے تھی کہ جس ماں کی کوکھ سے میں نے جنم لیا، جس باپ کی میں نسل ٹھہری اور ہم بہنیں جن کی رگوں میں ایک ہی باپ کا لہو دوڑ رہا تھا اور جن کی شریانوں میں ایک ہی ماں کا دودھ زندگی بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس گھر میں، ان رشتوں میں محبتوں کے پھول کبھی نہ کھلے۔ بلکہ ہمہ وقت غصے اور نفرت کے الاؤ دہکتے رہے۔ اس کے برعکس سلیمان جس کو میں جانتی تک نہ تھی، جسے میں نے ملک بشیر کے گھر سے پہلے کبھی دیکھا تک نہ تھا مگر اس نے محبت کے صرف دو بول بول کر ہی مجھ سے میرا سب کچھ حتیٰ کہ میری عزت بھی لوٹ لی۔ عزت و عصمت جو کسی لڑکی، کسی عورت کا وہ گرانقدر سرمایہ ہوتی ہے جس کو بچانے کی خاطر عورتیں بسا اوقات اپنی زندگی بھی ہار جایا کرتی ہیں اور میں نے محض پیار کی خاطر ہی ہنسی خوشی اپنا سرمایہ، اپنی عزت ایک اجنبی، ایک غیر کے حوالے کر دی تھی۔

بچیوں کی ذمہ داریوں سے نظریں چرا کر میں پھر اپنی پرانی روش پر چل پڑی۔ البتہ اب میری تمام تر توجہ کا مرکز میرا پہلا پیار سلیمان ہی تھا جس کی بدولت ہم دونوں کو ملک بشیر صاحب کا گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ سلیمان اب ہمارے گھر آنے لگا تھا، میں نے ماسی صغراں کو اپنا کزن بتایا تھا جو میرے خاوند کی عدم موجودگی میں میری دیکھ بھال کرنے میری ضروریات جاننے آیا کرتا تھا۔ ویسے بھی ''کزن'' ایسا ہمہ گیر رشتہ ہے جس کی آڑ میں ہر جائز و ناجائز رشتہ چھپ جایا کرتا ہے۔ میں سلیمان کی سفلی محبت میں اتنی اندھی ہو چکی تھی اور اتنا آگے نکل آئی تھی کہ نہ صرف اپنے خاوند کی خون پسینے کی دیار غیر سے بھیجی ہوئی کمائی سلیمان پر بے دریغ لٹانے لگی تھی بلکہ اپنے خاوند کے لائے ہوئے قیمتی تحائف مثلاً بڑھیا کمبل، گھڑیاں، قیمتی پرفیوم اور کپڑے وغیرہ بھی اسے دینے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ سلیمان نے مجھے نشے کی بھی لت لگا دی۔ پہلے وہ مجھے ہلکا پھلکا نشے کا سگریٹ پلانے لگا اور جب میں اس کی عادی ہو گئی تو اس نے مجھے چرس، ہیروئن کی بھی لت لگا دی اور ستم یہ کہ یہ سب کچھ میرے گھر میں ہی ہو رہا تھا۔ ماسی صغراں کو یا تو اس بات کی خبر نہ تھی یا پھر نہ جانے کس مصلحت کے تحت وہ خاموش تھی۔

میں یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا مگر نہیں جانتی تھی، ہم سب کا خالق و مالک ہم کو ایک حد تک ڈھیل دیتا ہے اور جب وہ رسی کھینچتا ہے تو پھر آدمی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی نہیں بچ سکتا۔ ''مکافاتِ عمل'' کا یہ قانون مجھے ملک بشیر صاحب کی کوٹھی میں ہی سمجھ جانا چاہئے تھا کہ کس طرح میرا گھناؤنا فعل اللہ رب العزت نے آشکار کر دیا تھا حالانکہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے تاوقتیکہ انسان خود اپنی حماقت، اپنی بداعتدالیوں، اپنی بداحتیاطیوں سے خود اپنے گناہ آشکارا نہ کر دے، اس بارے بھی ایسے ہی ہوا۔ ماسی صغراں جسے میں انتہائی بے ضرر اور لاعلم سمجھ رہی تھی اس نے میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھی ہوئی تھی اور ایک روز جب میں

نشے میں دھت سلیمان کے ساتھ اپنے کمرے میں گناہ کے کھیل میں مگن تھی، اس نے میرے سسرال میں خبر کر دی۔ میرے سسرال والے عقل مند تھے، وہاں سے صرف میرا سسر اور میرا دیور آئے۔ میرا دیور مارے غیرت کے میرے قتل کے درپے ہو گیا مگر میرا سسر اسے سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹا کر لے گیا اور ماسی صغراں کو یہ سمجھا گیا کہ ابھی وہ مزید وہاں رہ کر نگرانی کرتی رہے۔ ساتھ یہ میرے سسر نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے خاوند کو فوری طور پر واپس پاکستان آنے کے لئے کہا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ وہ اس کی اطلاع اپنی بیوی کو یعنی مجھے نہ دے اور سیدھا اپنے ماں باپ کے گھر آئے۔ یہ ساری باتیں جو میں اب لکھ رہی ہوں مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئیں۔

میرے شوہر کو بمشکل دس دن کی چھٹی ملی اور جس روز میرا خاوند اپنے ماں باپ کے گھر پہنچا اس سے اگلے روز ہی جب میں اور سلیمان نشے میں دھت ابھی اپنے قبیح فعل کا آغاز کرنے ہی والے تھے کہ ماسی صغراں کی اطلاع پر میرا خاوند اور میرا سسر اچانک ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔

ایسا منظر کسی بھی غیرت مند شخص کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ بزدل سے بزدل اور بے غیرت سے بے غیرت شخص بھی اپنی عزت کو کسی غیر کی بانہوں میں دیکھ کر خون کی ہولی کھیل جایا کرتا ہے مگر غصے سے کانپتے ہوئے اور آنکھوں میں شراروں کی حدت لئے یکلخت میرا خاوند پُرسکون ہو گیا اور جب بولا تو اس کے لہجے میں برفانی چوٹیوں کی سی ٹھنڈک اور سنگلاخ چٹانوں کی سی سختی اور مضبوطی تھی۔

''ذلیل عورت!'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہوں تو تم دونوں کو ابھی یہاں زندہ گاڑھ دوں مگر میں تم دونوں کے ناپاک خون سے ہاتھ رنگ کر اپنی ان معصوم بیٹیوں کو زندہ درگور نہیں کرنا چاہتا۔ تم جیسی عورتیں جو سسرال کی چوکھٹ سے قدم باہر نکال کر یوں غیر مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں تباہیاں اور رسوائیاں ان کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔ میں، میری بیٹیاں اور میرا سارا گھرانہ اسی وقت تم سے ناطہ توڑ رہا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے''۔ اتنا کہہ کر اس نے انتہائی نفرت سے میرے منہ پر تھوکا۔ ماسی صغراں اور فریدہ اور حمیدہ کو ساتھ لیا اور وہیں کھڑے کھڑے مجھے طلاق دے کر میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

اس کے بعد کے حالات وہی ہیں جو ایک کٹی ہوئی پتنگ اور لاوارث عورت کے ہوتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد جب سلیمان کو تمام صورتِ حال کا علم ہوا تو چند دنوں کے بعد وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں اس کے لئے جب تک سونے کا انڈہ دینے والی مرغی تھی، وہ میرے ساتھ اپنی جھوٹی محبت کا دم بھرتا رہا، میرے شوہر کے پیسوں پر عیش کرتا رہا، میں قیمتی سے قیمتی چیزیں اس پر نچھاور کرتی رہی مگر اب میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، نہ دولت، نہ قیمتی تحائف۔ اب اسے میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ وہ کسی اور کی مجبوری خریدنے چلا گیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی سے نکل گیا۔

مشکل وقت میں یا اللہ تعالیٰ یاد آتا ہے یا ماں باپ۔ چنانچہ میں اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی۔ اگر بات صرف دو وقت کی روٹی کی ہوتی تو شاید وہ گھر کے دروازے میرے لئے کھول دیتے مگر مجھے تو نشے کی ایسی لت لگ چکی تھی کہ روٹی کا نوالہ ملے نہ ملے نشے کی طلب مجھے مارے ڈالتی تھی۔ چنانچہ میرے ماں باپ نے بھی اپنے گھر کے دروازے مجھ پر بند کر دیئے۔ ویسے بھی ابھی انہوں نے اپنی باقی بیٹیاں بھی دیر سے

ہی سہی مگر بیاہی تھیں۔ مجھ جیسی بدنام زمانہ کو اپنے گھر رکھ کر وہ رسوائیوں کو دعوت نہیں دے سکتے تھے۔

میں نے کسی سے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے مگر شرط یہ کہ اپنے گناہوں سے اپنی کوتاہیوں سے انسان سچے دل سے تائب ہو کر اپنے مالک کو پکارے۔ چنانچہ میں نے بھی ہر طرف سے مایوس ہو کر، اپنے تمام تر گناہوں سے، اپنی تمام تر خطاؤں سے سچے دل سے تائب ہو کر دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا، ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے اپنے مالک کو بھل بھل روتی آنکھوں سے صدا دی۔ اس کے ساتھ ہی میں وہیں سڑک پر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔

میرے رب نے میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی میری فریاد سن لی تھی۔ وہاں سے کسی این جی اوز کی گاڑی گزر رہی تھی، یہ این جی اوز نشے کے شکار لوگوں کا علاج کرواتی تھی، انہوں نے مجھے بے ہوش پڑے دیکھا تو گاڑی روک کر میرے قریب آئے۔ میرے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی اور نحوست دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئے کہ میں نشے کی لت میں مبتلا ہوں، یہ ان کا روزمرہ کا کام تھا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور ترک منشیات سینٹر لے گئے اور وہاں مجھے داخل کروا دیا گیا۔ یہ ساری باتیں مجھے این جی اوز کی ایک ممبر نے اس وقت بتائیں جب میں ہوش میں آئی۔ انہوں نے مجھ سے کرید کرید کر میرے متعلق جاننا چاہا مگر میں نے انہیں ایک فرضی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں لاوارث ہوں اور نشے کی اس عادت سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔ میں نے گڑگڑا کر اور رو رو کر اپنے رب سے معافی مانگی تھی اور اب گناہوں کی اس دلدل سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

میرے رب نے میری توبہ یقیناً قبول کر لی تھی۔ تبھی تو یہ این جی اوز ایک فرشتہ بن کر مجھے بے ہوشی کی حالت میں یہاں لے آئی تھی اور میری رضامندی پا کر میرا نشے سے چھٹکارے کا علاج شروع کر دیا گیا۔ اس دوران وہی این جی اوز میری خبر گیری کرتی رہی اور میرے علاج معالجے کے اخراجات برداشت کرتی رہی۔ ایک عرصے کے بعد جب میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تو مجھے اس دارالامان میں اپنی ضمانت پر داخل کروا دیا اور اب میں ایک عرصے سے اسی دارالامان میں ہوں۔ اس دوران کئی موسم بدلے، کتنی ہی بہاریں آئیں مگر میری زندگی کا موسم خزاں کبھی بھی میری زندگی سے رخصت نہ ہوا۔ میری سردیوں کی طویل ٹھنڈی ٹھار راتیں اور موسم گرما کے تپتے ہوئے لانبے دن ہمیشہ ماضی کی راہ گزر پر سوچ کی پرچھائیوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزرتی ہیں۔ مجھے اپنا وفادار شوہر جو میری خوشیوں کے لئے پردیس میں محنت کی چکی میں پستا رہا، بہت یاد آتا ہے۔ مجھے ننھی منی بیٹیاں بھی بڑی شدت سے یاد آتی ہیں، وہ اب جوان ہو چکی ہوں گی۔ شاید ان کی شادی بھی ہو چکی ہو گی۔ میرے خاوند نے یقیناً ان کو یہی بتایا ہو گا کہ ان کی ماں مر چکی ہے۔ ہاں مجھے ان سب کے لئے مردہ اور گمنام ہی رہنا چاہئے تاکہ میری رسوائیوں کی غلاظت کے چھینٹے ان کے مستقبل پر نہ پڑیں۔ کاش! مجھے اپنے ان سارے گناہوں پر پشیمانی اس وقت ہوتی جب میں ماں بننے والی تھی۔ تو یوں تنہائیاں میرا مقدر نہ بنتیں مگر بقول شاعر۔

کی اس نے جفا سے توبہ میرے قتل کے بعد
ہائے اس زود پشیماں کا پشیمان ہونا

تاریخ کے جھروکوں سے

مہاراجا

سردار بہادر سرگورنام سنگھ (پٹیالہ)

منصوبہ یہ تھا کہ مہارانی کو حمل سے ظاہر کیا جائے اور کسی معزز خاندان کے نومولود بچے کو پیدائش کے بعد مہارانی کی گود میں ڈال کر مہاراجا کھڑک سنگھ کا ولی عہد تاج وتخت کی پیدائش کا اعلان کر دیا جائے۔

☆ دیوان جرمنی داس

قسط: 9

ترجمہ، ترمیم واضافہ: میاں محمد ابراہیم طاہر

اعلیٰ حضرت، فرزند دلبند، راسخ الاعتقادِ انگلشیہ، راجہ راجگان مہاراجا سر جگجیت سنگھ (گرانڈ کراس آف سٹار آف انڈیا، گرانڈ کراس آف انڈین ایمپائر، گورنر آف برٹش ایمپائر) ریاست کپورتھلہ کا حکمران تھا۔ اس کے والد مہاراجا کھڑک سنگھ کے کوئی اولاد نہ تھی اور کپورتھلہ کا تاج وتخت اس کے دوسرے رشتہ داروں کی سلطنت میں شامل ہو جانا تھا۔ اگر ریاست کے سینئر اور جہاندیدہ وزراء اپنی عقل و دانش سے اسے دوسروں کے ہاتھوں میں جانے سے بچانے کا نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے بندوبست نہ کر لیتے، ریاست کے وزراء، اعلیٰ اہلکار اور خصوصاً رعایا ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ ریاست پر کھڑک سنگھ کے دوسرے رشتہ دار خصوصاً وہ رشتہ دار قابض ہو جائیں جنہوں نے عیسوی مذہب اختیار کرلیا تھا۔

وزیراعظم دیوان رام جی اپنے وقت کا نہایت زیرک اور دوراندیش انسان، سیاستدان اور مصلح تھا۔

اس نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اپنے رفقائے کار وزراء، حکام اور ریاستی جنتا کی خواہشات کو پورا کر کے رہے گا۔ ریاست کپورتھلہ کے تاج وتخت کے خاندانی دعویداروں میں سے صرف چند ایک ہی اچھے اوصاف و کردار کے مالک اور اپنے حسن عمل میں مخلص اور دیانت دار تھے، ورنہ اکثریت کو کپورتھلہ کی رعایا اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ ان کا حسب ونسب اور مہاراجا سے خونی رشتہ داری بھی مشکوک تھی اور ریاستی عمال ان میں سے کسی ایک کے تاج وتخت پر قابض ہو جانے سے برآمد ہونے والے خوفناک نتائج سے خوفزدہ تھے۔ علاوہ ازیں مہاراجا کھڑک سنگھ کے پتا مہاراجا اندھیر سنگھ اور دوسرے دعویداران تاج وتخت کے درمیان کئی سال تک خانہ جنگی اور کشمکش جاری رہی تھی جو مہاراجا نہال سنگھ کے سرگباش ہونے پر شروع ہوئی تھی۔ اس کے اثرات اور دلوں میں کدورت اور دشمنی ابھی تک موجود تھی لہٰذا اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اگر مخالفین میں سے کوئی رشتہ دار ریاست پر قابض ہو گیا تو وہ شاہی خاندان اس کے وزراء اعلیٰ حکام اور ہمدرد و خیرخواہوں کی زندگیوں کے لئے خطرہ بن جائے گا۔ لہٰذا اس بات کی حتی المقدور کوشش کی جارہی تھی کہ مخالف رشتہ داروں میں سے کوئی بھی تاج وتخت ریاست پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

شادی کے بعد کئی سال گزر جانے کے باوجود مہاراجا کھڑک سنگھ کے ہاں کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی اور اسی وجہ سے وزراء، حکام اور جنتا میں عام مایوسی اور بے دلی کی کیفیت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ لہٰذا کئی منصوبے سوچے جارہے تھے کہ کس طرح وارث تاج و تخت پیدا کیا جائے۔ وزیراعظم کی خدمت میں بہت سے منصوبے اور پلان پیش کئے گئے لیکن انہوں نے سب کو ناممکن العمل قرار دے کر مسترد کر دیا۔ سردار بھگت سنگھ اور دیوان راجس نے مل کر ایک منصوبہ سوچا جو آخرکار کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مہارانی کو حمل سے ظاہر کیا جائے اور کسی معزز خاندان کے نومولود بچے کو پیدائش کے بعد مہارانی کی گود میں ڈال کر مہاراجا کھڑک سنگھ کا ولی عہد تاج وتخت کی پیدائش کا اعلان کر دیا جائے۔

ریاست کے شاہی ڈاکٹر، ڈاکٹر رام رکھا کی طرف سے مہاراجا کو مخبوط الحواس قرار دے دیا گیا تھا۔ مہاراجا اگرچہ پاگل نہیں تھا لیکن بہت گرم مزاج اور تندخو تھا۔ مہاراجا کو ماحول اور آب وہوا کی تبدیلی کے لئے بھکسو نزد دھرمشالہ، ضلع کانگڑہ جو کہ ہمالیہ کے قریب کپورتھلہ سے ڈیڑھ سو میل کی دوری پر صحت افزا پہاڑی مقام تھا، بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں اسے ایک مکان میں محبوس کر کے، اس کے معالج کی اجازت کے بغیر کسی سے میل ملاقات پر سخت پابندی لگا دی گئی تھی۔

مہارانی کو وزیراعظم کے منصوبے پر عمل درآمد میں کوئی اعتراض نہ تھا اور وہ اس بات پر راضی ہو گئی کہ اپنے آپ کو حاملہ ظاہر کرنا شروع کر دے۔

ایک ادھیڑ عمر، نک چڑھی اور منہ زور دائی نرس کیسر دیوی، جسے دن رات کے چوبیس گھنٹے مہارانی کے پاس بلا روک ٹوک آنے جانے کی کھلی اجازت تھی، اعتماد میں لے کر اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ ''ڈلیوری'' کے وقت مہارانی کے پاس موجود رہے گی۔ مہارانی کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ جب نومولود بچہ اس کی گود میں لا کر ڈالا جائے تو وہ اسے اپنا ہی بچہ ظاہر کرے۔ شہر کے معزز اور شریف خاندانوں کی ایسی خواتین کی ایک فہرست وزیراعظم کو پیش کر دی گئی جن کے ہاں اولاد متوقع تھی۔ لالہ ہری چند کی اہلیہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ لالہ ہری چند، وزیراعظم راجس کا ذاتی دوست اور ہمسایہ بھی تھا کیونکہ مین بازار میں ہری چند

کا مکان راجس کے مکان کے بالمقابل واقع تھا۔ لڑکے کو 26 نومبر 1872ء کو رات کے دو بجے محل میں لایا گیا اور مہارانی کی گود میں ڈال دیا گیا۔ محل کے ڈاکٹروں اور نرسوں نے مہارانی کو نو مہینے پہلے سے حمل سے قرار دیا ہوا تھا۔

لالہ ہری چند کو اس کی خدمات کے صلے میں بعدازاں ریاست کا وزیر خزانہ بنا کر ''دیوان'' کا خطاب بھی دیا گیا۔

ولی عہد کی پیدائش پر توپیں داغی گئیں اور چالیس دن تک پوری ریاست میں خوشیاں منائی گئیں۔ چراغاں کیا گیا، مختلف تہنیتی تقریبات منعقد کی گئیں جن میں پنجاب کے انگریز گورنر اور دوسرے اعلیٰ حکام، راجوں مہاراجوں مثلاً مہاراجا کشمیر، پٹیالہ، گوالیار اور بہت سی دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کو مدعو کیا گیا۔ ان تقریبات پر تقریباً دس لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ غریبوں اور محتاجوں کی نقد امداد کی گئی۔ قیدی رہا کئے گئے۔ مہاراجا کھڑک سنگھ نے اگرچہ بہت شور مچایا کہ اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا کیونکہ عرصہ دراز سے اس کے اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات نہیں ہیں لیکن چونکہ ڈاکٹروں نے پہلے ہی اسے پاگل قرار دے دیا ہوا تھا، اس لئے اس کی کسی بات پر کسی نے کوئی کان نہ دھرا۔ مہارانی نے ہر ملنے والے کو یہی بتایا کہ بچہ اسی کے ہاں پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے سٹاف کو پہلے ہی بھاری رشوتیں اور دوسرے لالچ دے کر اپنا منہ بند رکھنے پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔

دوسرے دعویداروں اور مخالفوں کو اگرچہ شک پڑ گیا اور انہوں نے برطانوی حکمرانوں سے مداخلت کی درخواستیں کرنا شروع کر دیں۔ ایک انگریز ڈاکٹر کرنل وار برٹن کو برطانوی حکومت نے تمام معاملے کی تحقیقات کر کے حکومت ہند کو رپورٹ بھیجنے پر مامور کر دیا۔ یہ صاحب ریاست کے چیف میڈیکل آفیسر تھے۔ کرنل وار برٹن نے ایک خاتون ترجمان کے ذریعے مہارانی سے پوچھ گچھ کی۔ شاہی آداب و رسم و رواج کے باعث وہ مہارانی سے براہ راست نہیں مل سکتا تھا نہ بات چیت کر سکتا تھا۔ کرنل وار برٹن نے وزیراعظم کے منصوبے اور ریاستی پالیسی کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے رعایا میں سے بھی بعض معززین سے پوچھ گچھ اور تفتیش کی اور اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بچہ باہر سے محل میں لایا گیا تھا تاکہ اسے وارث تاج و تخت قرار دیا جا سکے لیکن دیوان راجس اور اس کے ساتھیوں نے بھاری رشوت دے کر کرنل کو تمام تحقیقات ختم کرنے پر آمادہ کر لیا۔ کرنل وار برٹن نے حکومت ہند کو رپورٹ بھیجی کہ مہارانی ہی بچے کی حقیقی ماں ہے۔ لہٰذا حکومت ہند نے شہزادے کو ریاست کا قانونی وارث تاج و تخت تسلیم کر لیا لیکن دوسرے دعویداروں اور مخالفوں نے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں اور انہوں نے وائسرائے ہند کو ذاتی طور پر ملاقات کر کے دوبارہ معاملے کی تحقیقات کا حکم جاری کرا لیا۔

اسی دوران دیوان راجس وزیراعظم ریاست کپورتھلہ نے ایک عرض داشت تیار کر کے اس پر ریاست کے معزز شہریوں، نمبرداروں اور رعایا کے چیدہ چیدہ افراد، جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ دستخط کروا کر حکومت ہند کو روانہ کی جس میں تاج و تخت کے جھوٹے دعویداروں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو بے نقاب کیا گیا تھا اور ریاستی امور میں ان کی مداخلت پر احتجاج کیا گیا تھا۔ تاہم حکومت ہند نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک دوسرے اعلیٰ افسر کو نئے سرے سے تحقیقات کے لئے بھجوا دیا لیکن ریاست کے

جہاندیدہ اور ہوشیار وزیراعظم دیوان راجس نے اسے بھی لالچ دے کر اپنا ہمنوا بنالیا۔ اس دفعہ اس افسر کی بیوی کو نہایت قیمتی ہیروں کا ہار پیش کیا گیا جس کی چکاچوند سے میم صاحب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ نایاب ہار افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی نے مہاراجا کپورتھلہ کو اپنی دوستی کی یادگار کے طور پر اٹھارہویں صدی میں جبکہ احمد شاہ نے ہندوستان پر یلغار کی تھی، پیش کیا تھا۔

چنانچہ اس تحقیقاتی افسر نے بھی حکومت ہند کو رپورٹ دی کہ مہاراجا کھڑک سنگھ کی مہارانی کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ ہی وارث تاج وتخت اور ریاست کپورتھلہ کا مستقبل کا حقیقی اور قانونی حکمران ہے۔ اس پر مخالفین اور دوسرے دعویداروں نے بڑا شور شرابہ کیا اور ان کے اور دیوان کے خاندان کے درمیان دنگا فساد اور جھگڑا شروع ہوگیا اور دشمنی اور عداوت کی بنیاد پڑ گئی۔ مخالفین کی سازشیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ ریاست کے حکمرانوں کو مجبوراً انہیں ریاستی حدود سے بے دخل کر کے جلاوطن کرنا پڑا اور تاج وتخت کے جھوٹے دعویدار کپورتھلہ سے 12 میل کے فاصلے پر واقع جالندھر شہر جا کر رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حکومت ہند نے انہیں معقول گزارا الاؤنس، وسیع جائداد اور ہندوستان و برطانیہ کے اعلیٰ خطابات اور راجا کا لقب دے کر مطمئن کر دیا۔ خاندان کی جس شاخ نے ریاست کے لئے سب سے زیادہ پریشانیاں پیدا کیں اس کا تعلق کنور ہرنام سنگھ سے تھا جسے حکومت ہند نے ''موروثی راجا'' اور ''سور بیر'' کا خطاب دیا۔

مہاراجا کھڑک سنگھ کی پُراسرار موت کے بعد پانچ سالہ شہزادے جگجیت سنگھ کو ریاست کپورتھلہ کا جائز اور قانونی حکمران قرار دے کر تخت پر بٹھا دیا گیا اور دیوان راجس کی سربراہی میں شہزادے کے اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے اور بالغ ہونے تک امور ریاست چلانے کے لئے ایک کونسل قائم کر دی گئی۔ بالغ ہونے پر شہزادے کو حکومت پنجاب کی طرف سے ایک پُروقار تقریب میں حکمرانی کے پورے اختیارات تفویض کر دیئے گئے۔

مہاراجا کا تعلق بھٹی راجپوت خاندان سے تھا جن کی نسل کو ہندو لوگ براہ راست رام چندر جی سے ملاتے ہیں جنہیں خدا کا اوتار قرار دیا جاتا ہے۔ ریاست کا بانی جسا سنگھ تھا جس نے مغلوں کے زوال کے وقت اور احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان پر یلغار کے دوران اس علاقہ کو فتح کر کے ریاست کپورتھلہ کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس خاندان کے ایک مورثِ اعلیٰ اور جگجیت سنگھ کے دادا اور کھڑک سنگھ کے باپ مہاراجا اندھیر سنگھ کو ان مخالفین کے ہاتھوں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں جنہوں نے بعدازاں کھڑک سنگھ کے بیٹے کو ریاست کے تاج وتخت کا وارث قرار دیئے جانے کے خلاف وائسرائے ہند کے پاس اپیل دائر کی تھی۔

مہاراجا نہال سنگھ نے وصیت تحریر کر دی تھی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد ریاست کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پہلا حصہ اس کے پہلے لڑکے مہاراجا اندھیر سنگھ کو اور دوسرے دو حصے اس کے دوسرے دو بیٹوں کو جو ایک دوسری مہارانی کے بطن سے تھے، جس سے مہاراجا نے محبت کی شادی کی تھی، دے دیئے جائیں۔ مہاراجا اندھیر سنگھ نے یہ کہہ کر اس وصیت کو ماننے سے انکار کر دیا کہ سرگباشی مہاراجا نے یہ وصیت اپنی دوسری مہارانی کے زیر اثر کی تھی لہٰذا اس کی کوئی قانونی اور اخلاقی اہمیت نہیں ہے۔ دوسری مہارانی کے بیٹوں سردار کنور بکرم جیت سنگھ اور کنور سچیت سنگھ نے اپنے باپ کی وصیت پر عمل

درآمد کے لئے پنجاب کے گورنر سر ہنری لارنس کے پاس اپیل دائر کی لیکن گورنر نے مہاراجا اندھیر سنگھ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اس فیصلے کے خلاف دونوں بھائیوں نے وائسرائے ہند سر جان لارنس جو گورنر پنجاب کا بھائی تھا، اپیل بھیجی جس نے مہاراجا نہال سنگھ کی وصیت درست تسلیم کئے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ مہاراجا نے وائسرائے کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے حکم کے خلاف سیکرٹری سینٹ برائے ہند لندن اور ملکہ وکٹوریہ کے پاس اپیل دائر کر دی اور دیوان متھرا داس کو مختار نامہ دے کر اپنے کیس کی پیروی اور ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کے لئے لندن روانہ کر دیا اور دیوان کو بھاری رقم، اپنے نوکر اور باورچی وغیرہ بھی لندن اپنے ہمراہ لے جانے کی اجازت دے دی۔ دیوان اپنے ہمراہ ذخیرۂ خوراک اور گنگا جل بھی ہندوستان سے لے گیا کیونکہ ہندو مذہب کی رو سے وہ بدیسی کھانے اور پانی وغیرہ سے پرہیز کرتا تھا جو ضروری اشیاء لندن کی دکانوں سے بھی خریدی جاتی تھیں، انہیں استعمال سے پہلے گنگا جل سے دھو کر "پاک" کیا جاتا تھا۔ دیوان بڑا زیرک اور معاملہ فہم انسان تھا۔ اس نے لندن میں بہترین وکلاء کی خدمات حاصل کر کے مہاراجا کا کیس نہایت عمدہ طریقے سے ملکہ وکٹوریہ کے رُوبرو پیش کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے دور حکومت میں ہندوستان سے متعلقہ امور "پریوی کونسل" ملکہ کی خواہشات اور ہدایات کے مطابق ہی انجام دیتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ملکہ وکٹوریہ ہی اس وقت ہندوستان کی حکمران تھی۔ ملکہ بڑی پاکباز اور مذہبی خیالات کی خاتون تھی۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی کہ تاج وتخت کے حقیقی وارث اندھیر سنگھ کو ریاست کا صرف ایک تہائی حصہ ملے اور باقی دو

معروف قلمکار محمد رضوان قیوم کی
منفرد سچی کہانیوں کا نیا مجموعہ
دُکھ بولتے ہیں
قیمت:-/250 روپے
اشاعت کے مراحل میں ہے۔
آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرا لیں۔
ملنے کے پتے
کامل سٹیشنرز اینڈ گفٹ سینٹر
D بلاک، سیٹلائٹ ٹاؤن۔ کراچی
0301-5123961
ورائٹی بک سٹال
صدر بازار، بینک روڈ۔ راولپنڈی

تہائی حصے پر دوسرے لوگ قابض ہو جائیں۔ چنانچہ ملکہ وکٹوریہ نے وائسرائے کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے دوسرے حصے داروں کو چھتیس ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ دے کر ریاست کی حدود سے باہر رہائش اختیار کرنے کا حکم دیا۔

اگرچہ مخالفین ریاستی حدود سے باہر جالندھر میں رہائش پذیر ہو گئے لیکن ان کے درمیان مخاصمت اور دشمنی چلتی رہی۔ بعدازاں وہ مہارانی سے گورنر پنجاب سر ہنری لارنس کے پاس ایسا بیان دلوانے میں بھی کامیاب ہو گئے کہ اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہی نہیں ہوا لیکن اس وقت بہت تاخیر ہو چکی تھی اور سول سرجن کپورتھلہ اسے بھی مخبوط الحواس اور پاگل قرار دے چکا تھا۔ لندن سے کامیاب لوٹنے پر مہاراجا نے دیوان متھرا داس کی بڑی عزت افزائی کی۔ اسے قیمتی جاگیر اور زر و جواہر سے نوازا گیا۔ پوری ریاست میں جشن طرب منایا گیا۔ کسانوں کے مالیوں اور ٹیکسوں میں اس خوشی کے موقع پر کافی تخفیف کر دی گئی تاکہ وہ بھی مہاراجا کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں۔ نیز وزراء، سرکاری اہلکاروں اور ملازمین کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کر دیا گیا۔ قیدی آزاد کئے گئے اور مہاراجا کی صحت و تندرستی، درازیٔ عمر اور ریاستی عوام کو خوشحالی اور ترقی کے لئے مندروں، مسجدوں، گرجا گھروں اور گوردواروں میں خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔

مہاراجا اندھیر سنگھ کو ایران کے بادشاہ نادر شاہ کی تاریخی تلوار اور مشہور قیمتی زمرد کو پہننے کا فخر حاصل تھا جبکہ مہاراجا جگجیت سنگھ نے یہ نایاب اور قیمتی ہیرا اپنی اس پگڑی میں نصب کروا لیا تھا جو وہ خاص خاص اہم تقریبات کے موقع پر سرکاری لباس کے اوپر باندھتا تھا۔ یہ وہ تاریخی اور نایاب تحائف تھے جو بادشاہ نادر شاہ نے مہاراجا فتح سنگھ کو اپنی دوستی کی یادگار کے طور پر دیئے تھے۔ مہاراجا جگجیت سنگھ کو سونے اور چاندی سے بنی ہوئی وہ بگھی بھی وراثت میں ملی جسے بعض اوقات آٹھ اور بعض اوقات چھ چھ گھوڑے کھینچتے تھے اور گھوڑوں کے سموں پر لاکھوں روپے کے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ بگھی بھی نادر شاہ نے مہاراجا فتح سنگھ کو تحفتاً دی تھی۔

مہاراجا جگجیت سنگھ نے ریاست پر 68، 69 سال تک حکمرانی کی اور اسے حکومت ہند کی طرف سے مہاراجا کھڑک سنگھ کا حقیقی بیٹا تسلیم کیا گیا تھا۔ اسے حکومت ہند، حکومت برطانیہ اور کئی غیر ملکی حکومتوں اور سربراہوں کی طرف سے اس کے شاندار دور حکمرانی کے اعتراف کے طور پر بے شمار اعزازات، میڈل، خطابات اور نشانات ملے لیکن مہاراجا کی سب سے بڑی خواہش شہنشاہ انگلستان سے جی سی او کا اعزاز حاصل کرنے کی تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں مہاراجا نے شہنشاہ انگلستان کو اپنے اعزاز میں بکنگھم پیلس میں دی گئی ایک دعوت میں ایک عرضداشت بھی پیش کی تھی۔ دوسرے راجوں مہاراجوں کی طرح مہاراجا جگجیت سنگھ کو بھی شہنشاہ انگلستان سے مختلف اعزازات پانے کا خبط تھا۔

مہاراجا جگجیت سنگھ کے 74 سال کی عمر میں سرگباش ہونے پر نہ صرف ریاست کپورتھلہ بلکہ پورے ہندوستان میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا۔ جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی یورپی ممالک خصوصاً فرانس میں سرکاری سوگ منایا گیا۔ فرانس، مہاراجا کو اپنا بہترین دوست سمجھتا تھا اور مہاراجا کو اس کی زندگی میں فرانس کا سب سے بڑا اعزاز ''گرانڈ کراس آف لیجن دی اونز'' دیا تھا۔

(جاری ہے)

جرم و سزا

☆ ریاض بٹ

قسم، قتل اور کالا جادو

میں نے پیر کے قتل کا سراغ لگا لیا تھا اور قاتل کے متعلق بھی معلوم کر لیا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ قاتل میری پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔ اس کو دنیا کا کوئی قانون نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا تھا۔

ریٹائرڈ انسپکٹر سجاول کی ڈائری سے ایک عبرت اثر تفتیشی کہانی

مجھے پولیس کی سروس میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ میری جس تھانے میں ڈیوٹی ہوتی تھی میں اپنے عملے کو کہہ دیتا تھا کہ جو بھی مجھ سے ملنا چاہے اس سے نام پتہ پوچھ کر اور مجھے بتا کر میرے پاس بھیجنا ہے، باہر سے ٹرخانا نہیں ہے۔

وہ موسم گرما کے آخری دن تھے، میں ایک دن تھانے میں بیٹھا اپنے فرائض انجام دے رہا تھا کہ سپاہی خوشحال خان کی شکل دروازے میں نظر آئی۔

''سر! ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہے، نام نذیر بیگم بتاتی ہے''۔

''کیا کام ہے؟''

''وہ یہ کہتی ہے کہ کام تھانیدار صاحب کو ہی بتاؤں گی''۔ سپاہی خوشحال خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے، بھیج دو''۔ میں نے میز پر بکھرے کاغذات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحوں بعد جو خاتون میرے سامنے آئی وہ چھوٹے قد کی ایک فربہ اندام عورت تھی۔ پچاس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔ رنگ سانولا اور نین نقش تیکھے تھے۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ یوں میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جیسے میرے بارے میں اندازہ لگانا چاہتی ہو کہ میں کیسی طبیعت کا بندہ ہوں۔

''بی بی! جو کچھ کہنا ہے بلاجھجک کہہ دو''۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''تھانیدار صاحب! دراصل مسئلہ ایسا ہے کہ آپ مجھے پاگل سمجھیں گے''۔ خاتون نے کہا۔

''آپ بیان کریں گی تو میں کوئی رائے دے سکوں گا''۔ میں نے چڑ کر کہا۔ ''اگر میرے اختیار میں ہوا تو آپ کی مدد کروں گا''۔

''تھانیدار صاحب! میری نند نے میری بہو پر کالا علم کروا دیا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''اور اس کے ماں بننے کے راستے بند کروا دیئے ہیں''۔

''پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟'' وہ مجھے واقعی پاگل لگی جو ایسے معاملے میں پولیس کی مدد حاصل کرنے آ گئی تھی۔

''دیکھیں، میں بڑی آس امید لے کر آئی ہوں۔ مجھے آپ کے متعلق یہ پتہ چلا ہے کہ آپ پریشان حالوں کی مدد کرتے ہیں''۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

یہ شاید اس کی عادت تھی۔

''دیکھو بی بی! یہ معاملہ فی الحال قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے۔ تم اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو''۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا، تھانیدار صاحب! آپ میری پوری بات سن لیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن آپ میرے معاملے میں ضرور دلچسپی لیں گے''۔ اس نے اتنے وثوق سے کہا کہ مجھے اس کی بات سننے میں کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ جو کہانی اس نے سنائی مختصراً میں وہ اپنے لفظوں میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔

اس کا نام نذیر بیگم تھا۔ اس نے اپنے بیٹے وزیر کی شادی اپنی بہن رخشندہ کی بیٹی فریدہ سے کی تھی۔ فریدہ کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اِدھر اُس کی نند اپنی بیٹی نزہت کو اس گھر میں آباد کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا بھائی رشید ایک خوشحال زمیندار تھا لیکن نذیر بیگم اپنے شوہر کی خوشامد کر کے اپنی غریب اور یتیم بھانجی بیاہ لائی۔ ایک دن اس کی نند شمشاد بیگم اس کے گھر آئی اور گلے شکوے کرنے لگی کہ تم نے میری بیٹی کو نظر انداز کر کے اچھا نہیں کیا۔

''اس کا نتیجہ تم بھگت لو گی''۔ آخر میں اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہو

گئی''۔

میں نے نذیر بی بی سے کچھ سوال بھی پوچھے جو میں یہاں بیان کر رہا ہوں۔

''تمہارے بیٹے کی شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دو سال ہونے کو آئے ہیں''۔

''تم ابھی سے مایوسی کا شکار ہو گئی ہو''۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! میرے کانوں میں ہر وقت میری نند کے الفاظ گونجتے رہتے ہیں''۔

''اب تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہاری نند نے تمہاری بہو پر کالا علم کروا کے اس کے ماں بننے کے امکانات ختم کر دیئے ہیں''۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل، تھانیدار صاحب! اس نے پیر کرامت علی سے کالا علم کروایا ہے''۔

''تمہیں یہ بات کیسے پتہ چلی کہ تمہاری نند نے یہ کام کروایا ہے؟''

''رشتے کروانے والی بتول آپا نے بتایا تھا''۔

بتول آپا جیسے کردار ہمارے معاشرے میں عام ہیں جو رشتے کراتے بھی ہیں اور رشتوں میں دراڑیں بھی ڈالتے ہیں۔ میں نے نذیر بیگم کو جھوٹی سچی تسلی دے کر رخصت کر دیا۔ اس کو عقلی دلیل سے قائل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی سوئی ایک نقطے پر اٹکی ہوئی تھی۔

ہے کو میں اسے یہ کہہ سکتا تھا کہ اپنی بہو اور بیٹے کا میڈیکل چیک اپ کرواؤ لیکن فائدہ کوئی نہیں تھا۔ اس نے یہی کہنا تھا کہ میرا بیٹا گبھرو جوان ہے، اس میں کوئی نقص نہیں۔ تھانے کے دوسرے بکھیڑوں میں میرے ذہن سے نذیر بیگم اور اس کی کہانی نکل گئی تھی لیکن پھر اچانک ہی بڑے ہنگامہ خیز طریقے سے یہ کہانی پھر میرے سامنے آ گئی۔ نذیر بیگم کی بات ٹھیک نکلی۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے اس معاملے میں دلچسپی لینی پڑے گی۔

ایک ہفتے بعد ہمارے پاس اطلاع آئی کہ پیر کرامت علی خون میں لت پت اپنے حجرے میں پڑا ہے۔ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ میں نے ضروری تیاری کے بعد دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور کرامت علی کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ کرامت علی کا ڈیرہ گاؤں اختر آباد میں واقع ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر تھا۔ یہ پہاڑی کوئی زیادہ بلند نہیں تھی، یہی پچاس ساٹھ میٹر بلند ہو گی۔

پہاڑی کے اوپر جانے کے لئے پتھروں کو تراش کر زینے بناء گئے تھے جن پر باآسانی چڑھا جا سکتا تھا۔ ڈیرہ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ کمرے تقریباً بارہ ضرب بارہ فٹ کے تھے۔ کمروں کے آگے بیس ضرب دس فٹ پر آمدہ تھا۔

ایک کمرے میں پیر کرامت رہتا تھا جسے حجرہ کہا جاتا تھا۔ پیر کرامت کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ زخم کسی تیز دھار آلے کے تھے۔ دو زخم دل کے مقام پر تھے، ایک گردن پر تھا، ہاتھوں پر بھی زخم تھے جو یقیناً مزاحمت پر آئے ہوں گے۔ پیر گوری چٹی شکل کا صحت مند آدمی تھا۔ اس لئے اس کی لاش کے اردگرد خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ میں نے پیر کے حجرے کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ پیر کے بستر پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے تھے جو سینکڑوں بار کی پیش آنے والی کہانی کو دہرا رہے تھے اور وہاں کسی جوان عورت کی موجودگی ثابت کر رہے تھے۔ مجھے ایک طرف دیسی شراب کی بوتل بھی ملی جو آدھی خالی تھی۔ باقی کچھ تعویذ دھاگوں میں استعمال ہونے والی اشیاء تھیں۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش

ایک کانسٹیبل کے ساتھ ہسپتال بھجوا دی تا کہ اس کا پوسٹ مارٹم ہو سکے۔

میں نے درگاہ کے برآمدے میں ڈیرہ لگا لیا، پیر ایک مسند پر بیٹھتا تھا اور اس کے قدموں میں اس کے سائل بیٹھتے تھے۔ اس کے چیلے چانٹے میرے لئے وہی مسند برآمدے میں رکھوانا چاہتے تھے لیکن میں نے چارپائیاں بچھانے کے لئے کہا۔

ایک بات میں پہلے بتانا بھول گیا تھا، اب بتا دیتا ہوں۔ جب ہم ڈیرے پر پہنچے تھے تو بہت سے عقیدت مند وہاں جمع تھے جنہیں میرے سپاہیوں نے ڈیرے سے ذرا دور ہٹنے کے لئے کہا تھا۔ اب بھی وہ اِدھر اُدھر ٹولیوں کی شکل میں بکھرے ہوئے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ سپاہی خوشحال خان کو میں نے ان کے پاس کھڑا کر دیا تھا۔ ڈیرے پر پانچ چیلے تھے جو سب ہٹے کٹے تھے۔

"دیکھو، جو کچھ میں پوچھوں اس کا بالکل صحیح صحیح جواب دینا"۔ میں نے باری باری ان کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تم سب کو تھانے لے جاؤں گا اور وہاں الٹا لٹکا کر کھال اتار دوں گا"۔

"جناب مائی باپ! ہم آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں"۔ ایک چیلے نے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پیر صاحب کو کوئی قتل کر گیا ہے"۔ میں نے کہا۔ "اور تم لوگوں کو کچھ پتا ہی نہیں چلا"۔

"جناب! پیر صاحب رات کو حجرے میں اکیلے ہوتے تھے"۔ ایک مرید نے کہا۔ "جب تک وہ نہ بلائیں ہم رات کو ان کے حجرے میں نہیں جاتے"۔

"کیا تمہارے پیر کے پاس عورتیں بھی آتی تھیں؟" یہ سوال میں نے ایک خاص مقصد کے لئے کیا تھا ورنہ مجھے پتہ تھا کہ ایسے پیروں کے پاس زیادہ عورتیں ہی آتی ہیں۔

"جناب! عورتیں بھی آتی تھیں"۔ اس نے بھی پر زور دے کر نپا تلا جواب دیا۔ یہ چیلا شکل سے ہوشیار لگتا تھا۔ نام اس کا نجیب معلوم ہوا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے پیر صاحب کالا علم بھی کرتے تھے؟"

"کالا علم؟" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "توبہ توبہ، یہ تو ہندوؤں کا کام ہے۔ ہمارے پیر صاحب صرف نوری علم کرتے تھے اور تعویذ دھاگے دیتے تھے"۔

میں نے اتنا اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے ان چیلے چانٹوں سے کچھ حاصل نہیں ہونا۔ ان سے میں نے کافی سوال و جواب کئے تھے۔ ان کے جواب سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے پیر کے پاس کوئی کرامت وغیرہ نہیں تھی۔ ایسے ڈبا پیروں کا میں دشمن ہوا کرتا تھا جو سادہ لوح انسانوں کو بے وقوف بنا کر ان سے روپیہ پیسہ بھی کھینچتے تھے اور ان کی عزت سے بھی کھیلتے تھے۔ میں نے وہاں سے تھانے کی طرف آنے سے پہلے پانچوں کو کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب تک تمہارے پیر کے قتل کا معمہ حل نہیں ہوتا، تم نے کہیں نہیں جانا"۔

انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

جب تک کوئی واضح راستہ نہیں ملتا میں نے ہر ایک پر شک کرنا تھا۔ میرا شک یہ بھی تھا کہ کہیں نذیر بیگم نے کام نہ دکھا دیا ہو۔ ملاقات پر میں نے اس کی فطرت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ بے وقوفی کی حد تک دلیر تھی اور اس کے دل میں اپنی نند کے متعلق بھی بہت غصہ تھا۔

میں ان مریدوں کے وعدوں پر اعتبار نہیں کر سکتا

تھا۔ میں نے ان کی خفیہ نگرانی کا بندوبست کرنا تھا۔

تھانے آ کر میں نے فائلوں کا پیٹ بھرا اور کچھ دیر آرام کے لئے سرکاری وردی اتار کر سادہ لباس پہن لیا۔ جب مغرب کی نماز پڑھ لی تو میں ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے کر نذیر بیگم کے بتائے ہوئے پتے پر چلا گیا۔

دستک کے جواب میں ایک پچپن چھپن سالہ بندے نے دروازہ کھولا۔ دو اجنبیوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوا اور پوچھنے لگا کہ ہم نے کس سے ملنا ہے۔ ہم دونوں سادہ لباس میں تھے۔ اس کا سوال فطری تھا، اس لئے ہمیں تعارف کروانا پڑا۔

''اوہ..... جناب! آئیں''۔ وہ بچھ سا گیا اور ہمیں احترام سے لے جا کر گھر کی بیٹھک میں بٹھا دیا۔ وہ نذیر بیگم کا خاوند رشید تھا۔ وہ آسودہ حال زمیندار تھا۔ اس کا گھر حویلی نما تھا اور بیٹھک کی سجاوٹ اس کی امارت کی گواہی دے رہی تھی۔ وہاں رکھی چیزیں مثلاً فرنیچر وغیرہ قیمتی اور فینسی تھا۔

''تھانیدار صاحب! آپ ایک منٹ انتظار کریں''۔ رشید نے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں''۔

وہ اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اس کو منع کرتے ہوئے کہا۔

''رشید بھائی! کسی قسم کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے''۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں جلدی ہے، آپ میرے چند سوالوں کے جواب دے دیں''۔

''پوچھیں جناب!'' اس نے فدویانہ انداز میں کہا۔

''کیا آپ کو پیر کرامت علی کے قتل کا پتہ چل گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل جناب! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی چلا ہے''۔

''کس نے بتایا ہے؟''

''وہ رشتے کروانے والی آپا بتول آئی تھی''۔ اس نے بتایا۔

''کیا آپ بھی کرامت علی کو پہنچا ہوا پیر مانتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہ جی، مجھے ان خرافات پر یقین نہیں ہے''۔ اس نے فوراً کہا۔ ''ایسے سارے ڈبا پیروں کو الٹا لٹکا کر چھترول کرنی چاہئے''۔

''کیا آپ کی بیوی نے یہ بتایا تھا کہ وہ میرے پاس تھانے میں آئی تھی؟''

''ان عورتوں کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''یہ کسی کی بات مانتی تو ہیں نہیں۔ اس نے مجھے تھانے سے واپس آ کر بتایا تھا کہ وہ تھانے میں گئی تھی۔ میں نے اسے بُرا بھلا کہا تھا کہ تم نے اچھا نہیں کیا''۔

''رشید بھائی! تم اس بات پر مٹی ڈالو''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کہ اس نے اچھا کیا تھا یا بُرا، تم یہ بتاؤ کیا تمہاری بہن شمشاد بیگم اپنی بیٹی نزہت کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتی تھی؟''

''اس کی بڑی خواہش تھی''۔ رشید نے بتایا۔ ''وہ تو میرے رشتہ مانگنے کی منتظر تھی''۔

''کیا تم اس رشتہ پر راضی نہیں تھے؟''

''دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا''۔ رشید نے کہا۔ ''لیکن ان ماں بیٹے نے میری مت ماردی تھی''۔

''وہ کیسے؟''

''دراصل میرا بیٹا وزیر نزہت سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا''۔ رشید نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے خودکشی کرنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ اولاد جب ذرا بڑی ہوتی ہے تو اپنے آپ کو باپ سے بھی بڑا سمجھنے لگتی ہے''۔

''تمہاری بیوی کو شک تھا کہ تمہاری بہن ان پر

تعویذ دھاگے کراتی ہے"۔ میں نے اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ "کیا تم کو بھی شک ہے کہ تمہاری بہن نے کرامت علی سے تمہاری بہو کے لئے کوئی تعویذ دھاگہ لیا ہے یا اس پر کالا علم کروایا کہ ان کی اولاد نہ ہو"۔

"اس بات پر گھر میں خاصا ہنگامہ ہوا تھا"۔ رشید نے بتایا۔ "میں نے اپنی بہن کے گھر جا کر اس سے پوچھا تھا تو اس نے کہا کہ میں اس بات کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں"۔

"یعنی اقرار کیا نہ انکار"۔ میں نے کہا۔ "معاملہ گول کر دیا"۔

"تھانیدار صاحب! آپ خود سمجھدار ہیں"۔ رشید نے کہا۔ "میں صلح جو بندہ ہوں، اس لئے بہن کے تیور دیکھ کر واپس آ گیا تھا"۔

میں سادہ کپڑوں میں اس لئے رشید کے گھر گیا تھا کہ میرا ارادہ گھر کی عورتوں سے سوال و جواب کرنے کا تھا۔ رشید کو تو میں تھانے میں بھی بلوا سکتا تھا لیکن اس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کی بیوی بہو کو چھوڑنے اپنی بہن کے گھر گئی تھی۔ بیٹے سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

"میں وہاں سے تھانے واپس آ گیا۔

کرامت علی کے حجرے میں مجھے کسی عورت کی موجودگی کا ثبوت مل گیا تھا یعنی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے۔ جب میں نے یہی بات اے ایس آئی کو بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"سر! چوڑیوں کے ٹکڑے بے شک کسی عورت کی وہاں موجودگی ظاہر کر رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔ "لیکن جو حالت لاش کی آپ نے بتائی ہے وہ کسی عورت کا کارنامہ نہیں لگتا"۔

"جب عورت انتقام لینے پہ آتی ہے تو زہریلی ناگن بن جاتی ہے اور اگر مضبوط کردار کی ہو تو اس میں بے پناہ طاقت آ جاتی ہے۔ وہ بعض اوقات ایسے کارنامے سرانجام دے ڈالتی ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے"۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!" اے ایس آئی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایسی عورت کون ہو سکتی ہے؟ کیا نذیر بیگم؟"

"ابھی کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی"۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ہمارا مفروضہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہی نکلے اور ہمارے مفروضوں کی عمارت دھڑام سے نیچے آ گرے۔ تم ایسا کرو کہ رشید کی بہن شمشاد بیگم کو تھانے میں بلوا لو۔ رشید کو اس نے ٹکا سا جواب دیا تھا کہ وہ اس بات کا جواب دینے کی پابند نہیں ہے۔ ایسی عورت کے ساتھ سوال و جواب کرنے کے لئے تھانے کی فضا زیادہ سازگار ہو گی"۔

اے ایس آئی نے ہیڈ کانسٹیبل ملک رفاقت کو شمشاد بیگم کو تھانے لانے کے لئے بھیج دیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے لائی گئی تھی۔ وہ تھانے میں آنے کے لئے کسی طرح بھی راضی نہیں ہو رہی تھی۔ کہتی تھی کہ اپنے تھانیدار سے کہو جو کچھ پوچھنا ہے میرے گھر آ کر پوچھے لیکن اس کا پالا ہیڈ کانسٹیبل ملک رفاقت سے تھا، وہ ہتھکڑیوں کا جوڑا ساتھ لے کر گیا تھا اور سادہ کپڑوں میں تھا۔ جب اس نے شمشاد بیگم سے یہ کہا تھا کہ میں نے تمہاری عزت کا خیال کیا ہے سادہ کپڑوں میں آیا ہوں اگر تم سیدھی طرح نہ مانی تو میں تمہیں ہتھکڑی لگا کر لے جاؤں گا تو وہ چپ چاپ آ گئی تھی۔ یہ محض خوفزدہ کرنے کے لئے کہا تھا ورنہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔

''یہ تھانہ ہے شمشاد بی بی!'' میں نے اس کی اکڑ ختم کرنے کے لئے کہا۔ ''یہاں آ کر بڑے بڑے شیر بکری کی طرح ممیانے لگتے ہیں۔ تم کس بھول میں ہو۔ سیدھی طرح میرے سوالوں کے جواب دو''۔

''میں نے کون سا جرم کیا ہے جو آپ نے مجھے تھانے میں بلوایا ہے؟'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''تم نے اپنے بھائی کی بہو پر کالا علم کروایا ہے''۔ میں نے اس کی ہوا نکالنے کے لئے کہا۔ ''یہ کیا کم جرم ہے؟''

''کون کہتا ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تم کرامت علی کے پاس کیا لینے جاتی تھیں؟'' میں نے سیدھا حملہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''وہ تو میں اپنے لئے تعویذ لینے جاتی تھی''۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں آ گئی تھی۔

''تمہیں کون سی تکلیف ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''دراصل مجھے آدھے سر کا درد رہتا ہے''۔ اس نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''اس لئے''۔

''یہ تو کسی ڈاکٹر کو دکھانے والا مسئلہ تھا''۔ میں نے کہا۔

وہ چپ ہو گئی یوں جیسے اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو۔

''دیکھو بی بی! اصل بات سچ سچ بتا دو ورنہ میں تمہیں حوالات میں بند کر دوں گا''۔ میں نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا؟'' اس نے پھر وہی بات دہرائی۔ ''آپ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں؟'' وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ پیر کرامت علی کا قتل انتقامی کارروائی ہے۔

''دیکھو بی بی! سچ بول کر اپنی جان چھڑاؤ۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کسی پر تعویذ دھاگا کروانا کوئی جرم نہیں ہے''۔ میں نے اسے ایک اور زاویے سے گھیرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں سچی بات بتا دوں تو آپ مجھے سزا تو نہیں دلوائیں گے؟'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''مجھے تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بلکہ ہو سکا تو میں تمہاری مدد بھی کروں گا''۔ میں نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیا۔

''دراصل کرامت علی فراڈیا تھا''۔ اس نے بتایا۔ ''اس کے پاس کوئی علم نہیں تھا۔ وہ تو پکا شیطان تھا۔ مجھ سے اس نے پانچ سو روپے لے کر کہا تھا کہ وہ کالا علم کرے گا۔ اس کے لئے اسے دس دن کا چلہ کاٹنا پڑے گا۔ تم گیارہویں دن آنا''۔

''پھر تم گیارہویں دن گئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل گئی تھی''۔ شمشاد نے کہا۔ ''اس نے مجھے کہا تھا کہ کل شام کے بعد آنا۔ میں اسے پانچ سو روپے دے چکی تھی اس لئے شام کے بعد چلی گئی۔ اس کے ایک چیلے نے مجھے کہا کہ پیر صاحب حجرے میں ہیں۔ میں جب حجرے میں گئی تو وہ خبیث آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس نے میرے قدموں کی چاپ سن لی تھی اور اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ اس وقت میں ہی آ سکتی تھی لیکن اس نے اپنی کرامت دکھانے کے لئے کہا۔

''ہم بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ ہمارے حجرے میں شمشاد بیگم آئی ہے۔ آؤ ہمارے قریب بیٹھو''۔

میں اس کے پاس چلی گئی۔ میں نے بعض

عورتوں سے اس کی بدمعاشیوں کی باتیں سنی تھیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس نے میرے ساتھ کوئی غلط حرکت کی تو میں اس کی ساری پیری ناک کے رستے نکال دوں گی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے میری کلائی پکڑ لی، میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ لال سرخ شاید اس نے کوئی نشہ کیا ہوا تھا۔

''مورکھ..... میں نے تمہاری کلائی کسی غلط مقصد کے لئے نہیں پکڑی''۔ وہ غصے سے بولا۔ ''میں صرف تمہارے ہاتھ کی لکیریں دیکھنا چاہتا تھا''۔

تھانیدار صاحب! میں اس کی نیت بھانپ چکی تھی۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا۔ میرے پانچ سو روپے سیدھی طرح واپس کر دو ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔

اس نے فوراً اپنی گدی کے نیچے سے کچھ نوٹ نکالے اور ان میں سے پانچ سو کا ایک نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تم ہمیشہ پریشان رہو گی''۔

بہرحال میں واپس آ گئی تھی ورنہ میرا دل تو چاہتا تھا کہ چھری سے اس کا پیٹ پھاڑ کر سب کچھ باہر نکال دوں۔

میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ عورت دلیر بھی ہے اور باکردار ہونے کے ساتھ ساتھ سچ بھی بول رہی ہے۔ چالیس بیالیس سال کی عمر ہونے کے باوجود اس میں کشش تھی۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے''۔

''اب ایک بات کا جواب ذرا سوچ کر دینا''۔

میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔

''اب میرے دل سے سارا ڈر خوف نکل گیا ہے''۔ اس نے بے خوفی سے کہا۔ ''آپ پوچھیں بالکل ٹھیک اور صحیح جواب دوں گی۔

''اس واقعے کے بعد تم خاموش ہو کر کیوں بیٹھ گئی؟'' میں نے اس سے کہا۔ ''کم از کم لوگوں کو اس ڈبا پیر کی اصل شکل تو دکھانی تھی''۔

''تھانیدار صاحب! آپ سیانے بندے ہیں''۔ اس نے کہا۔ ''یہاں میری طرح اس پیر کے عقیدت مند بہت زیادہ ہیں جو اسے کوئی کھینچی ہوئی ہستی سمجھتے ہیں۔ میری بات پر کس کو یقین آنا تھا۔ الٹا لوگوں نے مجھے لعن طعن کرنا تھا کہ پیر صاحب کی گستاخ ہوں''۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر گویا ہوئی۔ ''دوسرے مجھے یہ بات بھی بتانا پڑتی کہ میں اس کے پاس کیوں گئی تھی۔ پھر میری بھابی کو یقین ہو جاتا کہ میں ان کے خلاف تعویذ کرا رہی ہوں''۔

''چلو میں نے تمہیں سچا مان لیا ہے''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم میری ایک مدد کر دو''۔

''آپ کھل کر بات کریں، مجھ سے جو کچھ ہو سکا کروں گی''۔ اس نے یقین دلانے والے لہجے میں کہا۔

''کرامت علی جیسا بھی تھا اب قتل ہو چکا ہے''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے اس کے قاتل یا قاتلوں کی تلاش ہے۔ تم میری مدد کر سکتی ہو کیونکہ مجھے اس کی لاش کے پاس ٹوٹ ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے ملے ہیں''۔ پھر میں نے چوڑیوں کے ٹکڑے اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔

''میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں''۔ اس نے جوش سے کہا۔ ''اگر آپ یہ چوڑیوں کے ٹکڑے مجھے دے دیں تو میں کوئی کھوج لگانے کی کوشش کر سکتی ہوں

لیکن.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن کیا؟'' میں نے کہا۔ ''تمہارے دل میں جو بھی ہے کھل کر کہو''۔

''میں نے جو باتیں آپ سے کی ہیں ان کا کسی کو پتہ نہ چلے''۔ اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ''خاص کر میرے بھائی اور بھابی کو..... میں تو بہ تائب ہو گئی ہوں۔ آئندہ میں کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کروں گی اور خود ساتھ مل کر بات جاننے کی کوشش کروں گی کہ وزیر کے گھر اولاد کیوں نہیں ہو رہی''۔

''میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ یہ باتیں راز ہی رہیں۔ مجبوری کی بات دوسری ہے''۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا مناسب سمجھا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں، میں چوڑی والی عورت کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کروں گی۔ آخر آپا بتول کس کام آئے گی''۔

''آپا بتول!''۔ میں نے زیر لب دہرایا۔

''بالکل تھانیدار صاحب!'' اس نے کہا۔ ''وہ ان کاموں کی ماہر ہے۔ ہر کسی کی خبر رکھتی ہے۔ اگر آپ اسے اپنی پکی مخبر بنا لیں تو وہ آپ کی بہت مدد کر سکتی ہے''۔

''شمشاد بیگم نے مجھے ایک راستہ دکھا دیا۔ ایسی عورتیں ہر تھانیدار کی ضرورت ہوتی ہیں۔ یہ لوگوں کے گھروں کے اندر سے وہ باتیں بھی کھوج کے لے آتی ہیں جو لوگ ایک دوسرے سے بھی چھپاتے ہیں۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے''۔ میں نے کہا۔ ''تم ایسا کرو کہ اس سے میری ملاقات کروا دو اور یہ چوڑیوں کے ٹکڑے یہیں رہنے دو۔ یہ اسے میں خود دوں گا''۔

اس کے بعد میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا تھا۔ اگلے دن مجھے شمشاد بیگم کی طرف سے پیغام ملا کہ بتول آپا یہ چاہتی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ تھانیدار سے ملی ہے۔ اس لئے آپ شام ڈھلے سادہ کپڑوں میں میرے گھر آ جائیں۔

اس کی تجویز مجھے مناسب لگی، اس لئے میں اکیلا ہی سادہ کپڑوں میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ جو بندہ پیغام لے کر آیا تھا اس نے اچھی طرح مجھے اس کے گھر کا محل وقوع سمجھا دیا تھا۔ میری منزل دو کمروں والا مکان ثابت ہوئی۔ میں ایک کمرے میں بیٹھ گیا، شمشاد بیگم آپا بتول کو میرے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔

میں نے اس کا جائزہ لیا، وہ لگ بھگ پینتیس چھتیس سال کی ایک چلتا پرزہ قسم کی عورت تھی۔ گندمی رنگت پہ تیکھے نین نقش میں بڑی جاذبیت تھی۔ منٹوں میں کسی بھی کمزور کردار کے مرد کو اُلو بنا سکتی تھی۔ اس سے دو چار باتیں کیں تو اندازہ ہو گیا کہ یہ میرے کام کی عورت ہے۔ اس میں ایک کارآمد اور اچھی مخبر بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ صرف اسے پالش کرنے کی ضرورت تھی۔

''تمہیں یہ تو پتہ چل گیا ہو گا کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے''۔

''جی تھانیدار صاحب! میں بڑا بول نہیں بولوں گی''۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آزمائش شرط ہے''۔ وہ بولی تو مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ عورت عقلمند بھی ہے۔

''دیکھو، میں تم سے صاف بات کروں گا''۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''جو کام میں تمہارے سپرد کرنے لگا ہوں اس میں رازداری شرط ہے''۔ میں نے ذرا رک کر اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے لئے ایک امتحان ہے''۔

''آپ فکر ہی نہ کریں''۔ اس نے گھبرائے بغیر کہا۔ ''میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دوں گی اور چوڑیوں والی کو آپ کے سامنے لا کھڑا کروں گی''۔

''یہ لو''۔ میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری طرف سے ہے''۔

''تھانیدار صاحب! رہنے دیں''۔ بتول نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''جب میں کوئی کارنامہ انجام دوں گی تو آپ سے خود انعام مانگ لوں گی''۔

''دیکھو بتول!'' میں نے اس کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ نوٹ اب جیب سے نکل آیا ہے اس لئے اب یہ دوبارہ جیب میں نہیں جا سکتا، یہ تمہیں رکھنا پڑے گا''۔

اس نے نوٹ لے لیا اور میرا شکریہ ادا کر کے جانے لگی تو میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ چوڑیوں کے ٹکڑے لے کر نہیں جاؤ گی؟''

''او..... تھانیدار صاحب! دیکھیں نا اس نوٹ نے میری تو مت ہی مار دی۔ میں معافی چاہتی ہوں''۔

''اس دوران شمشاد بیگم ہمارے لئے چائے اور دوسرے لوازمات رکھ گئی تھی۔

چائے پی کر وہ چلی گئی اور میں بھی شمشاد کا شکریہ ادا کر کے آ گیا۔

اگلے دن رشید میرے پاس آیا، میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا، وہ شکل سے پریشان لگتا تھا۔ وہ میرے کہنے پر میرے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔

''کچھ پریشان لگ رہے ہو رشید بھائی!'' میں نے نرم لہجے میں اسے کریدا اور کہا۔ ''جو بھی پریشانی ہے بلا جھجک کہہ دو''۔

''میں بہت پریشان ہوں تھانیدار صاحب!'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''میرا بیٹا وزیر تین دن سے گھر واپس نہیں آیا''۔

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''تمہارا بیٹا کہاں گیا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''کسی کام سے گیا تھا؟''

''جناب! میں نے اسے خود بھیجا تھا آڑھت منڈی''۔ اس نے کہا۔

یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ ہمارے تھانے کی حدود میں شہر کا کچھ حصہ بھی آتا تھا جس میں آڑھت منڈی اور اس کے ساتھ ہی بازار حسن بھی تھا۔

''آڑھت منڈی کس لئے بھیجا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''چوہدری سرور سے گندم اور مکئی کے کچھ پیسے لینے تھے''۔ اس نے بتایا۔

''پھر؟''

''جب وہ شام تک گھر نہیں آیا تو مجھے پریشانی ہوئی''۔ اس نے بتایا۔

''پہلے میں نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے دوست بشارت کے پاس ٹھہر گیا ہو۔ وہ اکثر کے پاس ٹھہر جاتا ہے لیکن دو راتیں اور ایک دن گزر گیا تو مجھے طرح طرح کے وہم وسوسے آنے لگے''۔

''وہ کس دن اور کس وقت پیسے لینے گیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''منگل کی شام وہ اپنے سکوٹر پر گیا تھا۔ اسے اسی رات ہی واپس آنا تھا''۔ رشید نے بتایا۔ ''اس دن جمعرات تھی''۔

''تم سیدھے میرے پاس آئے ہو یا؟ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''گزری رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی تھانیدار صاحب!'' رشید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وزیر کی ماں نے رو رو کے بُرا حال کیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی

RTM: 71114
N.B.S
FANS
سب اچھا لگا مگر
بات ان سے بنی
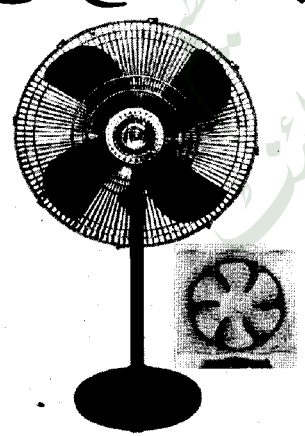
U.I INDUSTRY
184-C, Small Industries State
Gujrat PAKISTAN.
PH:+92 53 3535901-2, 3523494-5
Fax: 053-3513307
E-mail: nbsfans@gmail.com

الگ پریشان ہے۔ آج صبح میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لئے کہا اور سب سے پہلے ہم آڑھت منڈی چوہدری سرور کے پاس چلے گئے۔ میں نے اس سے وزیر کے متعلق پوچھا تو چوہدری سرور نے کہا کہ وزیر تو منگل والی رات کو ہی پیسے لے کر چلا گیا تھا۔ پھر میں اس کے دوست کے گھر گیا۔ اس نے بتایا کہ وزیر منگل کی رات میرے پاس آیا تھا۔ رات اور اگلا دن (بدھ کا) یہیں گزارا تھا۔ پھر چلا گیا تھا۔ یہ ہے ساری صورتِ حال"۔

صورتِ حال زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اتنا ٹائم ضائع کر کے میرے پاس آیا تھا۔ میں نے وزیر کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ درج کی اور پھر میں نے اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔

ویسے میں نے اس سے رقم کے متعلق پوچھا تو اس نے پانچ ہزار بتائی تھی۔ یہ رقم اس دور کے حساب سے کافی تگڑی رقم تھی اور اس رقم کے لئے کوئی کسی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ زن، زر اور زمین ہمیشہ سے انسان کی دشمن چلی آ رہی ہیں۔ ہم پہلے ہی کرامت علی کے قتل میں الجھے ہوئے تھے۔ سوائے چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے ابھی تک کوئی کھرا کھوج ہاتھ نہیں آیا تھا۔

چیلے چانٹوں کی نگرانی بھی جاری تھی لیکن اس طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزا بات سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک بات میرے علم میں آئی تھی کہ وہ افیون کے عادی تھے یہی وجہ تھی کہ اُس رات کو ان کے پیر کو کوئی قتل کر گیا تھا اور ان کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

یہ اس شام کی بات ہے میں نے ہیڈ کانسٹیبل ملک رفاقت اور دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور سرکاری گاڑی

میں آڑھت منڈی پہنچ گیا۔ ہم باقاعدہ وردی میں تھے۔ ہم سیدھے چوہدری سرور کی دُکان پر پہنچ گئے۔ دُکان بازار کے وسط میں واقع تھی۔ بالکل سامنے دفتر تھا جس کے اردگرد شیشہ لگا کر اسے بند کیا گیا تھا۔ دروازہ چیڑ کی لکڑی کا تھا۔ دُکان کے مالک چوہدری سرور نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور ہماری خاطر تواضع کے لئے اپنے نوکر کو کہنے لگا۔

''چوہدری صاحب! ہم بہت جلدی میں ہیں''۔ میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تکلف پھر بھی سہی اس وقت آپ سے چند معلومات لینی ہیں''۔ میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

''حکم، جناب!'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''زمیندار رشید کا بیٹا منگل کی شام آپ سے رقم لینے آیا تھا؟''

''بالکل آیا تھا''۔ اس نے کہا۔ ''اور اس کی تلی (تھیلی) پر میں نے پانچ ہزار روپیہ رکھ دیا تھا۔ کیوں جناب کیا بات ہے، آج صبح ذیلدار صاحب بھی اس کا پوچھتے ہوئے آئے تھے؟''

''وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا''۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو ذیلدار صاحب بھی کر گئے تھے''۔ چوہدری سرور نے کہا۔ ''یہاں میں ایک بات یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ وہ پہلے بھی کئی دفعہ پیسے لے کر گیا تھا۔ بہرحال اس بار ایک بات میں نے نوٹ کی تھی کہ وہ کچھ کھویا کھویا تھا۔ میں اس کی حالت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا''۔

''ٹھیک ہے، چوہدری صاحب! میرے لئے اتنا اشارہ ہی کافی ہے''۔ میں نے کہا اور صرف ہیڈ کانسٹیبل رفاقت کو ساتھ لے کر پیدل ہی وزیر کے دوست بشارت کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے گاڑی اور دو کانسٹیبلوں کو وہیں رہنے دیا تھا۔

بشارت گھر ہی میں مل گیا، ہمیں دیکھ کر وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ میں نے بشارت سے کچھ سوال پوچھے جو پیش ہیں۔

''بشارت! وزیر منگل کی رات کتنے بجے تمہارے پاس آیا تھا؟''

''ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی''۔ بشارت نے بتایا۔ ''یہی نو بجے کا وقت ہوگا۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ آج کل گرمیوں کے دن ہیں''۔

''وہ تمہارے پاس کب تک رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ منگل کی رات رہا تھا، پھر بدھ کو شام ڈھلے یہاں سے گیا تھا''۔

''تم نے اس کو روکا نہیں تھا کہ صبح چلے جانا؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کیا یہ بات تمہارے علم میں تھی کہ اس کے پاس پانچ ہزار روپے تھے؟''

''مجھے تو اس نے آٹھ ہزار بتائے تھے''۔ بشارت نے کہا۔ ''کہہ رہا تھا تین ہزار میرے پاس پہلے کے تھے اور پانچ ہزار روپیہ مجھے چوہدری صاحب نے دیا ہے''۔

''اوہ..... یہ تو خاصی بڑی رقم ہے''۔ میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

''اس لئے میں نے اس کو کہا تھا کہ صبح چلے جانا''۔ بشارت نے کہا۔ ''لیکن تھانے دار صاحب وہ میری کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا، پتہ نہیں اس کا ذہن کہاں تھا''۔

''تم نے اسے کریدا تو ہوگا؟''

''میں نے بہت کوشش کی تھی''۔ بشارت نے بتایا۔ ''لیکن میرے سوالوں سے تنگ آ کر اس نے

صرف اتنا کہا تھا کہ بہت جلد تمہیں پتہ چل جائے گا"۔

میں نے بشارت کے ساتھ کافی مغز کھپائی کی تھی لیکن کوئی اور بات یا اشارہ اس کی زبان سے نہیں نکلوا سکا تھا لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وزیر کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا یہاں ہوا تھا، وہ یہاں سے جا نہیں سکا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا جیسے بجلی چمک کے بجھ جاتی ہے۔ اس طرف اچانک میرے ذہن نے چھلانگ لگائی تھی۔ مجھے کافی باتیں پتہ چل چکی تھیں جو میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔ میں نے بشارت اور اس کے والد کو اعتماد میں لیا اور وردی وہاں اتر کر رکھی ہیڈ کانسٹیبل کو بھی ایسا کرنے کے لئے کہا۔ میں نے اور ہیڈ کانسٹیبل نے بشارت کے کپڑے پہن لئے، اس کا ڈیل ڈول ہم جیسا ہی تھا۔

اس وقت اندھیرا پھیلنے لگا تھا، اس سے پہلے میں نے ہیڈ کانسٹیبل ملک رفاقت کو بھیج کر دونوں سپاہیوں اور ڈرائیور کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ ان کو گاڑی لے کر کہاں آنا ہے۔ اب یہ حالات پر منحصر تھا کہ میری جمع تفریق کہاں تک صحیح ہوتی تھی اور جو خیال میرے ذہن میں آیا تھا وہ صحیح بھی تھا یا نہیں۔ میں نے بشارت سے وزیر کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر لے لی تھی۔ ہمارے قدم بازار حسن کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم نے اپنے حلئے ایسے بنا لئے تھے جیسے ہم کوئی عیاش سیٹھ ہوں۔

ہم نے گھوم پھر کر بازار کا ایک چکر لگایا اور ایک پان سگریٹ کی دکان پر رک گئے۔ میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا، ہیڈ کانسٹیبل سگریٹ پیتا تھا۔ اس نے دو پان اور آدھی ڈبی سگریٹ کی لی۔ میں نے اس دوران دیکھ لیا تھا کہ بالاخانوں کی کھڑکیاں کھلنے لگ گئی ہیں۔ اچانک میری نظر ایک پھول فروش پر پڑی، ہیڈ کانسٹیبل نے پان والے کو پیسے دیئے اور ہم پھول فروش کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا تو آواز لگائی۔

"آؤ باؤ جی! تازہ موتیے کے ہار، چنبیلی اور گلاب کی خوشبو والے ہار"۔

میں نے اس کے ہاتھ پہ پانچ کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال ہمیں ہار نہیں چاہئے، میرا بھائی گم ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کی تلاش ہے"۔ پھر میں نے وزیر کی تصویر اس کے سامنے کر دی اور اسے سائیڈ پر لے گئے۔ وہ چند لمحے غور سے تصویر کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

"باؤ جی! ویسے تو رات کے اندھیرے میں یہاں بہت سے لوگ آتے ہیں، مجھ سے ہار خریدتے ہیں اور کسی نہ کسی کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ جاتے ہیں لیکن....."

"لیکن کیا؟ جلدی بتاؤ، ہم بہت پریشان ہیں"۔ ہیڈ کانسٹیبل رفاقت نے کہا۔

"اس بندے کو میں نے دلاور کے ساتھ بازار سے باہر جاتے دیکھا تھا"۔ پھول والے نے کہا۔ "اور اس بندے کے پاس سکوٹر بھی تھا"۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور یہ دلاور کون ہے اور اس وقت کہاں ملے گا؟"

"کل رات کی بات ہے"۔ اس نے کچھ خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "دلاور یہاں غنڈہ گردی کرتا ہے اور طوائفوں کا دلال بھی ہے"۔

"تم نے دوسرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جی، ویسے تو اس وقت وہ اِدھر ہی ہوتا ہے مگر آج نظر نہیں آ رہا۔ لگتا ہے کسی موٹی مرغی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے"۔

''دیکھو، میں تمہیں اتنا دوں گا کہ تمہیں ایک ہفتہ ہار بیچنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آخر اس کا کوئی ٹھکانہ بھی ہوگا، ہمیں بتا دو''۔

''آپ بازار سے باہر کونے پر جو مٹھائی کی دکان ہے، وہاں کھڑے ہو جائیں، میں ہار رکھ کر آتا ہوں''۔ اس نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ ہیڈ کانسٹیبل ملک رفاقت نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ یہ پیسوں کے لالچ میں ہماری مدد کرے گا۔ پانچ منٹ بعد وہ ہمارے پاس آ گیا۔

''دیکھیں جناب! میں پورے دو سو روپے لوں گا''۔ ہار والے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ ایک دفعہ مجھے ذرا سی بات پر تھپڑ مارے تھے۔ میں دور سے اس کا ڈیرہ دکھاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے، اتنا ہی کافی ہوگا''۔ میں نے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کرو یار!'' میں نے بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''مجھے دلاور پر بڑا غصہ ہے''۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اسے پولیس کے حوالے کر دیں تو مہربانی ہو گی۔ اس نے بازار میں بڑی غنڈہ گردی مچائی ہوئی ہے۔ ہم جیسے غریبوں کو تو وہ کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ کچھ سمجھتا ہی نہیں اور ایک بات اور..... یہ بات اس کو پتہ نہیں چلنی چاہئے کہ میں نے اس کا پتہ آپ کو بتایا ہے''۔

''تم بالکل فکر ہی نہ کرو''۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسے بندوں کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ آج کے بعد وہ کسی کو تنگ نہیں کرے گا''۔

ہمیں اس کے ساتھ کچھ دور جانا پڑا، وہ گھر ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر دو سو روپے رکھ دیئے۔ صرف اس لئے کہ ایک تو وہ غریب آدمی تھا، دوسرے ہم اپنی شخصیت چھپانا چاہتے تھے۔ پھر جس طرح ہم دلاور کو پکڑ کر تھانے میں لے گئے اس کے لئے صفحے سیاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ اس گلی میں سنسنی پھیل گئی تھی، وہ نشے میں دھت تھا۔ رات کافی بیت چکی تھی، ہم نے اسے حوالات میں بند کر دیا اور کانسٹیبلوں سے کہا اسے کھڑا رکھو اور سونے نہیں دینا۔

میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا جو قریب ہی تھا۔ ایک گھنٹہ آرام کے بعد میں نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا اور دو سپاہیوں کو بھی کمرے میں ہی رہنے دیا۔ وہ نشے اور نیند کی زیادتی سے جھوم رہا تھا۔ اِدھر اُدھر لڑکھڑا رہا تھا۔

''ہاں تو دلاور صاحب! تمہارا نشہ ہرن ہو چکا ہو گا؟'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

''آپ مجھے ناحق پکڑ کر لے آئے ہیں''۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''میں تو ایک شریف آدمی ہوں ہوں''۔

''اگر غنڈہ گردی کرنے اور طوائفوں کی دلالی کرنے والے کو شریف کہتے ہیں تو میں تمہیں تمغۂ شرافت دیتا ہوں''۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے.....'' اس کے آگے کچھ بولنے سے پہلے ہی سپاہی خوشحال خان نے اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور اندر سے گال پھٹ گیا۔ وہ خون تھوکنے لگا۔

''یہاں تمہاری ماں کا ڈرامہ نہیں ہو رہا جو مکالمے بول رہا ہے''۔ خوشحال خان نے کڑک کر کہا۔ ''سیدھا

سادہ جواب دو، تم وزیر کو کہاں لے کر گئے تھے؟''

''وزیر کو؟'' اس نے اپنے ہونٹوں سے بہتے ہوئے خون کو اپنی آستین سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ''وزیر کون؟''

''سکوٹر والے وزیر کو''۔ خوشحال خان نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چپ ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سپاہی خوشحال خان نے اسے ایک گندی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تم لاتوں کے بھوت ہو، باتوں سے ماننے والے نہیں''۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سر! اسے آپ صرف پندرہ منٹ کے لئے ہمارے حوالے کریں، یہ کسی بلوطے کی طرح بولے گا''۔

''لے جاؤ بھئی، میرے پاس اتنا وقت نہیں''۔ میں نے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جلدی رزلٹ چاہئے۔ اس دوران اگر یہ مر جاتا ہے تو کوئی پروا نہیں''۔

خوشحال خان اور ریحان اسے دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ پھر تھانہ دلاور کی چیخ و پکار سے گونجنے لگا۔

ابھی دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دلاور میرے سامنے موجود تھا۔ صرف دس منٹ میں اس کا حال اس طرح ہو گیا تھا جیسے فاتح فوج مفتوح شہر کا کرتی ہے۔ اب وہ واقعی فرفر بولنے لگا تھا۔

اس کے اعتراف جرم سے جو کہانی سامنے آئی، وہ کچھ یوں ہے۔

اس رات بھی حسب معمول وہ کسی گاہک کی تلاش میں بازار میں گھوم پھر رہا تھا کہ اسے وزیر نظر آیا۔ وہ گھاک اور تجربہ کار بندہ تھا۔ اسے یہ آسامی تگڑی لگی۔ اس نے یہ بھی تاڑ لیا تھا کہ یہ بندہ پہلی بار اس بازار میں آیا ہے اور کافی امیر بھی ہے۔ وہ اس کے قریب گیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جناب! اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہیں، میں حاضر ہوں۔ ایسا مال ہے کہ آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ آؤ ذرا سائیڈ پر چل کر بات کرتے ہیں''۔ پھر وہ اسے سائیڈ پر لے کر چلا گیا۔

وزیر نے اسے کہا۔ میں ابھی گھر نہیں جانا چاہتا۔ دو چار دن گزارنا چاہتا ہوں اور مجھے کسی عورت کی بھی خاص ضرورت نہیں ہے۔ دلاور کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ تو ''نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے'' والا معاملہ تھا۔

دراصل وزیر کی ذہنی حالت ہی ایسی تھی، اس وقت وہ مضطرب تھا، کیوں تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

''جناب! میرا گھر حاضر ہے، جتنے دن مرضی چاہیں رہیں۔ اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا دیں''۔ دلاور نے اسے گھیر لیا۔

پھر دلاور اس کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھا تھا اور اسے اپنے گھر لے گیا تھا، وہ وہاں اکیلا رہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وزیر نے اسے کہا کہ یہ لو ایک سو روپیہ اسے اپنے پاس رکھو، کچھ کھانے پینے کے لئے بھی لے آؤ۔

رات کو ہی استادی سے دلاور نے اس سے دل کی بات اگلوا لی جب وزیر نے اسے ایک سو روپیہ نکال کر دیا تھا تو اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس سات ڈھیر سارے نوٹ اور بھی ہیں۔ اس کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی بھی تھی، کلائی پر قیمتی گھڑی بھی تھی اور سکوٹر پر بیٹھ کر تو وہ خود آیا تھا۔ ان سب چیزوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا اور اس کے شیطانی ذہن میں یہ بات آ گئی کہ اگر وہ وزیر کو ختم کر دے تو یہ سب چیزیں اس کی ہو سکتی ہیں۔ لالچ بُری بلا ہے۔ اس نے کھانے میں زہر ملا کر وزیر کو دے دیا۔ زہر سریع الاثر تھا، تھوڑی دیر میں

ہی وزیر مر گیا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ زہر سنکھیا تھا جو ایسے ہی کسی وقت کے لئے کسی حکیم سے رات کو ہی دلاور نے خریدا تھا۔

اس کے بعد اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے اس نے لاش کو ایک ویرانے میں جا کر دبا دیا تھا۔ سکوٹر کو بھی بیچ دیا گیا تھا۔

دلاور جیسے جرائم پیشہ لوگوں سے میں نے ہمیشہ آہنی ہاتھوں سے تفتیش کی تھی۔ وہ کوئی سیدھا سادہ شہری نہیں تھا۔ وہ بازار حسن کا دلال تھا جو طوائفوں کی دلالی کے ساتھ ساتھ جوا بھی کھیلتا تھا اور نشہ بھی کرتا تھا اور جہاں موقع ملے چھوٹا موٹا جرم کر ڈالتا تھا۔ بازار حسن کے دکاندار اور پھیری والے اس سے عاجز آ چکے تھے۔ اب وہ میرے سامنے بیٹھا ایک نوجوان کے قتل کا اقبال کر رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ ابھی وہ بہت کچھ مجھ سے چھپا رہا ہے، وہ ایک مکار اور لالچی آدمی تھا۔

میں نے زیادہ سر کھپانے کی بجائے ایک بار پھر اسے خوشحال خان کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھے۔ خوشحال خان نے اپنے بیلچے جیسے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ چند ہی لمحے بعد تھانہ پھر سے دلاور کی چیخ و پکار اور منت و زاری سے گونجنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد خوشحال خان اور ریحان اسے دائیں بائیں تھامے ہوئے میرے پاس لے آئے اور میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دلاور خان کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اس میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

"پوچھو سر! جو پوچھنا ہے"۔ خوشحال خان نے فخریہ انداز میں کہا۔ "یہ ریڈیو کی طرح بجے گا"۔

بہر حال مختصر یہ کہ میری پوچھ گچھ پر اس نے انکشاف کیا کہ یہ اس کا پہلا قتل نہیں ہے، وہ اس سے پہلے بھی اسی طرح ایک کھاتے پیتے گھرانے کے آدمی کو قتل کر کے زمین میں دبا چکا ہے جس کا پولیس کو اب تک سراغ نہیں ملا۔ اس نے یہ قتل پانچ سال پہلے کیا تھا۔ پولیس نے بہت سر مارا تھا لیکن اس وقت کا تھانیدار اس قتل کا سراغ نہیں لگا سکا تھا اور یوں کیس تھانے کی فائلوں میں دفن ہو گیا۔ بعد میں میں نے یہ ریکارڈ بھی نکلوا لیا تھا۔

خود کو شریف کہنے والا یہ آدمی دو قتل کر چکا تھا۔ میں نے گواہوں کی موجودگی میں اس کی نشان دہی پر وزیر کی لاش برآمد کی اور باقی بچا ہوا زہر بھی اس نے گھر سے گواہوں کے سامنے ایک ٹرنک سے نکال کر میرے حوالے کیا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ اس حکیم کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ جہاں اس نے سکوٹر بیچا تھا وہاں بھی میں نے ایک کانسٹیبل بھیج دیا تھا۔

وزیر کی لاش زہر خورانی کی وجہ سے نیلی پڑ کر خراب ہونے لگی تھی۔ اس کو پوسٹمارٹم کے لئے بھجوایا۔ ڈاکٹر نے رپورٹ میں زہر خورانی کی تصدیق کر دی تھی۔ وزیر کے باپ رشید احمد نے جب جوان بیٹے کی لاش دیکھی تو اس کو سکتہ ہو گیا۔ دوسری طرف زیر کی ماں نذیر بیگم اور وزیر کی بیوی فریدہ غشی میں چلی گئی تھیں۔ شمشاد بیگم سینے پر دوہتڑ مار مار کر بین کر رہی تھی۔ یہ بڑا ہی دردناک منظر تھا۔ پولیس والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور ان کے سینے میں بھی گوشت پوست کا دل ہوتا ہے۔ وہ بھی ان مناظر سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے برداشت کر لیتے ہیں۔

میں نے دلاور کے خلاف دوہرے قتل کا بڑا مضبوط کیس تیار کیا۔ زہر فراہم کرنے والے حکیم کو بھی پیش کیا اور ساتھ ہی بازار حسن سے دلاور سے تنگ آئے ہوئے ہار والے اور ایک دو دوسرے بندوں کی

گواہی پیش کی جنہوں نے قتل سے پہلے آخری بار وزیر کو دلاور کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ میں نے کوئی ایسا خانہ خالی نہیں چھوڑا تھا جس سے ملزم کا وکیل فائدہ اٹھا سکے۔

کیس چلا اور چند پیشیوں کے بعد جج نے دلاور کو پھانسی کی سزا دی۔ اس نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی لیکن متعلقہ جج نے پہلے والا فیصلہ برقرار رکھتے ہوئے اپیل مسترد کر دی۔

میں تو پیر کرامت علی کے قتل کی تفتیش کرنے نکلا تھا اور ایک اور ہی قتل کا کیس نکل آیا۔ ابھی اس فراڈیے پیر کے قتل کا معاملہ باقی تھا۔

یہ وزیر کے قتل کیس کے فیصلے کے بعد دوسرے دن کی بات ہے جب مجھے پیغام ملا کہ بتول مجھ سے شمشاد بی بی کے گھر پر ملنا چاہتی ہے اور میں شام کو سادہ لباس میں وہاں آ جاؤں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ شام کو شمشاد بی بی کے گھر جا کر بتول سے مل لوں، ہو سکتا ہے اس نے کام کی کوئی بات معلوم کر لی ہو۔ عام طور پر تھانیدار اس طرح نہیں کرتے، ہر مخبر ان کو تھانے میں آ کر رپورٹ دیتا ہے لیکن میں نے بہتر سمجھا کہ بتول کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہی رکھا جائے۔ اس طرح وہ آئندہ بھی میرے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔

بہرحال میں شام کو سادہ لباس میں اکیلا ہی شمشاد کے گھر چلا گیا۔ بتول وہاں پہلے سے موجود تھی اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے پاس میرے لئے اہم اطلاع ہے۔ شمشاد بی بی چائے پانی کا انتظام کرنے لگی تو میں نے اس کو منع کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر بتول کو تنہا میرے پاس چھوڑ دے۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''ہاں بھئی، بتول کیا خبر ہے؟'' شمشاد کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔

''آپ سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے جناب!'' بتول نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''اور حسب وعدہ مجھے انعام بھی دیں گے''۔

''پہلے کام کی بات کرو بتول!'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''انعام کی بات بعد میں کریں گے''۔

''یہ چوڑیاں فریدہ کی ہیں''۔ اس نے مجھ سے لئے ہوئے چوڑیوں کے ٹکڑے میرے سامنے پڑی میز پر رکھ دیئے۔

''فریدہ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''وزیر کی گھر والی''۔ اس نے کہا۔ ''وہی جو قتل ہو گیا ہے''۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے واقعات کی کڑیاں ملانے لگا۔ میں نے اس واردات کا خاکہ اپنے ذہن میں بنا لیا لیکن اس کی تصدیق مقتول وزیر کی بیوی فریدہ ہی کر سکتی تھی۔ میں نے فریدہ سے ملنے کا ارادہ کر لیا اور اس سلسلے میں شمشاد بی بی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وزیر کے مرنے کے بعد بھی وہ اپنے سسر اور ساس کے ساتھ ہی رہتی ہے اور وہ دونوں بھی اسے اپنے مقتول بیٹے کی نشانی سمجھ کر اس سے بڑا پیار کرتے ہیں۔

بتول کو میں نے کامیابی پر دو سو روپے انعام دیئے جو اس وقت خاصی بڑی رقم تھی۔ ہم تھانے والے اس قسم کے خرچے اپنی جیب سے نہیں کرتے، یہ ہم تھانے سے ہی پورے کر لیتے ہیں۔ بہرحال میں وہاں سے نکل کر سیدھا مقتول وزیر کے گھر چلا گیا۔ اس کا باپ رشید بڑے تپاک سے ملا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جوان بیٹے کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔ میں اپنے فرض سے مجبور تھا اس

لئے مجھے اس کی بہو سے پوچھ گچھ کرنا ضروری تھی۔

رشید نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا۔ میں نے بات شروع کرنے کے لئے وزیر کی موت کا افسوس کیا اور اس کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ بھی اپنے بیٹے کی باتیں مجھے سنانے لگا۔ پھر میں نے باتوں کا رخ پیر کرامت کے قتل کی طرف موڑ دیا۔

''کچھ پتہ چلا تھانیدار صاحب!'' رشید نے پوچھا۔ ''اس پاپی کو کون مار گیا؟''

''میں اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں رشید بھائی!'' میں نے اس سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں تمہاری بہو سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں چاہتا تو اسے تھانے بھی بلا سکتا تھا لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور خود سادہ لباس میں آیا ہوں''۔

''لیکن میری بہو کا اس پیر کے قتل سے کیا تعلق ہے؟'' اس نے حیران ہو کے پوچھا۔

''میں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں رشید بھائی!'' میں نے ذرا سختی سے کہا۔ ''اس سلسلے میں میں جس سے ضروری سمجھوں گا پوچھ گچھ کروں گا۔ اگر تم تعاون نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے پھر تھانے ملاقات ہو گی''۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ ناراض نہ ہوں جناب!'' رشید نے گھبرا کر کہا۔ ''آپ بیٹھیں، میں فریدہ کو بلاتا ہوں''۔

میں پھر بیٹھ گیا، رشید اندرونی حصے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنی بہو کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نذیر بیگم بھی چلی آئی۔ فریدہ نے نہایت کمزور سی آواز میں سلام کیا۔ میں نے جواب دے کر اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ بیٹھ گئی۔ اس کے ایک طرف رشید اور دوسری طرف نذیر بیگم بیٹھ گئے۔

''میں فریدہ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں''۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کچھ دیر کے لئے اسے یہاں چھوڑ دیں''۔

وہ دونوں تذبذب کا شکار نظر آنے لگے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ ان کو بہو میرے لئے بہن کی طرح ہے، میں ان کی عزت کا پورا خیال رکھوں گا اور اسی لئے خود چل کر یہاں آیا ہوں۔

وہ دونوں مطمئن ہو کر چلے گئے۔ میں نے فریدہ کو بولنے پر آمادہ کرنے کے لئے اس سے وزیر کی باتیں شروع کر دیں۔ وزیر کی باتیں کرتی کرتی وہ رو پڑی، میں نے اسے رونے دیا۔

''ویسے وزیر تھا بڑا غیرت مند''۔ میں نے باتوں باتوں میں اچانک کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''تم اس فراڈیے پیر کے پاس کیا کرنے گئی تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

اب تو وہ اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی جیسے میں کوئی جادوگر ہوں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی بس سر کر کہتی رہی پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔

''دیکھو فریدہ! وزیر اب اس دنیا میں نہیں ہے''۔ میں نے کہا۔ ''وہ اس دنیا کے قانون سے بہت دور چلا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ نرمی اور رحم والا معاملہ کرے..... تم مجھے بتاؤ، سارا واقعہ کس طرح ہوا تھا؟''

''میری ساس مجھے وہاں لے گئی تھی''۔ بالآخر فریدہ نے زبان کھولی۔ ''اس کو شک تھا کہ وزیر کی پھوپھو نے میرے اوپر کالا علم کروا کے ساری اولاد باندھی ہوئی ہے''۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پیر کرامت نے کہا کہ یہ سچ ہے۔ فریدہ بتانے

لگی۔ ''اس نے کہا وزیر کی پھوپھو اس کے پاس کالا علم کروانے آئی تھی۔ میری ساس نے پوچھا کہ کیا اس کالے علم کا توڑ ہوسکتا ہے تو پیر نے کہا۔ اپنے کئے عمل کا توڑ بڑا مشکل ہوتا ہے، اس کے لئے تمہاری بہو کو تین جمعراتیں تنہا یہاں آنا پڑے گا''۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

''پھر تم گئیں؟''

''میں جانا نہیں چاہتی تھی''۔ فریدہ نے کہا۔ ''پھر ساس کی حوصلہ افزائی اور اولاد کے لالچ میں چلی گئی۔ پیر کرامت علی نے کچھ پڑھ کر میرے اوپر دم کیا اور پھر کہنے لگا، کالا جادو تو ختم ہو جائے گا پر ایک مسئلہ ہے''۔

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا شوہر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے''۔ پیر کرامت علی نے کہا۔ ''اولاد میں تمہیں دوں گا''۔

''یہ نہیں ہوسکتا''۔ میں نے کہا۔ ''میں بے اولاد ہی ٹھیک ہوں''۔

''سوچ لو اچھی طرح''۔ پیر کرامت نے خباثت زدہ لہجے میں کہا۔ ''تم اولاد پیدا نہیں کرو گی تو تمہاری ساس تمہارے شوہر کے لئے کوئی اور لڑکی بیاہ لائے گی اور میں بھی مشہور کردوں گا کہ تم کبھی اولاد پیدا نہیں کر سکتی کیونکہ تم پر بڑے ظالم جن کا سایہ ہے اور اس نے تمہاری کوکھ باندھ رکھی ہے''۔

میں کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے اٹھ کر آنے لگی تو پیر کرامت نے کلائی سے پکڑ کر مجھے اپنے اوپر گرا لیا، وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر ایک زوردار لات اس کے سینے پر ماری تو وہ ہائے کی آواز کے ساتھ پیچھے گرا۔ میں وہاں سے نکل آئی''۔

پیر کی اس زور آزمائی میں فریدہ کی کچھ چوڑیاں ٹوٹ کر اِدھر اُدھر گر گئی ہوں گیں جن کا کسی کو خیال نہ رہا۔ اس کے بعد فریدہ نے سنایا کہ وہ غصے میں کھولتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی ساس کو کھری کھری سنائے مگر پھر وہ صبر کر گئی۔

رات ہوئی تو وزیر گھر آیا اور بیوی کا خراب موڈ دیکھ کر اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ فریدہ کے دل میں چور نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ وزیر کو صاف صاف بتا دیا۔ وزیر یہ سن کر بھڑک اٹھا اور اس بدکار پیر کو سبق سکھانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک اس پاپی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کر لے گا، نہ کھائے گا نہ سوئے گا۔ جب رات ذرا گہری ہوگئی تو وزیر ایک لمبے پھل والا چاقو لے کر پیر کے ڈیرے پر چلا گیا۔ پیر کے چیلے بھنگ اور افیم کے نشے میں دھت سو رہے تھے۔ اس نے پیر کے حجرے کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا، وہ اندر چلا گیا۔

پیر بڑی بُری حالت میں سو رہا تھا۔ اس کے بلند خراٹے گونج رہے تھے۔ حجرے میں شراب کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ وزیر نے اطمینان سے چاقو نکالا اور ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا کر اس کے سینے پر وار کیا۔ پیر تڑپ کر اچھلا اور چاقو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جس سے اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ وزیر نے قہر بھرے انداز میں دوسرا وار پیر کی گردن پر کیا اور پھر فوراً ہی دل کے مقام پر تیسرا وار کیا۔ اس نے پیر کا منہ دبا رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی آواز نہ نکل سکی۔

وزیر کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں اس کے مریدوں میں سے کوئی اس طرف نہ آ جائے لیکن غالباً وہ بھی نشے میں دھت سو رہے تھے۔ کسی کو کان و کان خبر نہ ہوئی اور وزیر چھپتا چھپاتا اپنے گھر پہنچ گیا۔ بیوی اس کے خون آلود کپڑے دیکھ کر گھبرا گئی۔ وزیر نے اسے تسلی دی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اس پاپی کو جہنم رسید کر آیا

ہے۔ وزیر نے خون آلود چاقو اچھی طرح دھو کر صاف کیا اور ایک ٹرنک میں رکھ دیا۔ پھر اس نے نہا کر دوسرے کپڑے پہنے۔ فریدہ نے اسی وقت خون آلود کپڑے اچھی طرح دھو دیئے۔

وزیر نے یہ ساری تفصیل اپنی بیوی فریدہ کو سنائی تھی۔

بعد میں مَیں نے فریدہ کا سارا بیان لکھ لیا اور اس سے انگوٹھا بھی لگوا لیا۔ پھر فریدہ نے مجھے وہ لمبے پھل والا چاقو بھی دکھایا جس سے غیرت مند وزیر نے اس شیطان پیر کو قتل کیا تھا۔ پھر اس نے وہ کپڑے بھی لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔

میں نے پیر کے قتل کا سراغ لگا لیا تھا اور قاتل کے متعلق بھی معلوم کر لیا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ قاتل میری پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔ اس کو دنیا کا کوئی قانون نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا تھا۔

''میری ایک عرض ہے تھانیدار صاحب!'' فریدہ نے کہا۔

''دیکھو فریدہ! تم میری بہن کی طرح ہو''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''جو بھی دل میں ہے کہہ ڈالو، مجھ سے جو ہوسکا وہ کروں گا''۔

''میری اور میرے سسر کی عزت کا خیال رکھنا''۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''وزیر تو ان بکھیڑوں سے دور چلا گیا ہے مگر میری عزت داؤ پر لگ جائے گی...... آپ اپنا کیس مکمل کریں لیکن اس میں کہیں بھی میرا ذکر نہ کریں''۔

میں نے اس پہلو سے سوچا ہی نہیں تھا کہ جب وجہ قتل لکھی جائے گی تو فریدہ کا نام آئے گا اور پھر سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ اگر میں پوری ایمانداری سے اس کیس کو تیار کرتا تو بھی کچھ فائدہ نہیں تھا۔ قاتل تو خود قتل ہو چکا تھا۔ مجھے اس معصوم سی لڑکی پر ترس آ گیا۔ بے چاری بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی بات مان لینے کا فیصلہ کر لیا اور اسے تسلی دلاسہ دے کر اس کے سسر رشید احمد کو بلا کر ساری صورت حال بیان کی، وہ حیرت زدہ سا میری باتیں سن رہا تھا، میں نے اسے وزیر کے کپڑے اور آلۂ قتل بھی دکھایا۔

پھر میں نے اس کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں نے جو کارروائی کرنی ہے کروں گا لیکن اس میں اس کی بہو کا نام نہیں آئے گا اور میں کوئی اور وجۂ قتل بیان کر دوں گا۔ وہ اتنا جذباتی ہو گیا کہ اس کے آنسو بہنے لگے۔ پھر اس نے بھی میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''جو خدمت کہیں گے وہ میں کروں گا''۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ کا احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا''۔

میں نے اسے بتایا کہ میں یہ سب ''خدمت'' لینے کے لئے نہیں بلکہ اللہ کو خوش کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں نے بڑی استادی سے اس کیس کو مکمل کیا اور ثابت کیا کہ پیر کا قاتل وزیر تھا جو اب خود بھی قتل ہو چکا ہے۔

اگر وزیر قتل کر کے تھانے آ جاتا اور ساری بات مجھے بتاتا تو میں نے کیس اس طرح تیار کرنا تھا کہ اس کا وکیل بڑے آرام سے فوری اشتعال ثابت کر کے اسے بری کرا لیتا لیکن ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اور تقدیر سے بھاگ کر بندہ کہاں جا سکتا ہے۔

اس کیس کے کچھ عرصہ بعد وزیر کے قاتل دلاور کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ یوں وہ اپنے انجام تک پہنچا۔

❀❀❀

طنز و مزاح

سنا تم نے بھی؟

نئے کرایہ داروں کا کنبہ مختصر سا تھا۔ جب سے کنبہ محلے میں آیا تھا، محلے والوں نے انہیں اوپر تلے سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں آئے ابھی چار روز ہوئے تھے۔ گھر کا سامان پوری طرح کھلا نہ تھا اور نہ ہی وہ خود محلے کے کسی گھرانے سے کھل سکے تھے۔

☆ عنایت اللہ

''وہ نئے کرایہ دار آئے ہیں نا...... اری وہ مکان نہیں گلی کی نکڑ پر، پنواڑی کے پڑوس میں جو پچھلے بدھوار خالی ہوا تھا...... بینکوں کے انسپکٹر والا، اس میں اسی روز نئے کرایہ دار آ گئے تھے''۔ میناری والے کی بیوی نے پڑوسن کے گھر جا کر اور اس کے کان سے منہ لگا کر کہا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور لب و لہجے میں رازداری، سنسنی اور استعجاب تھا۔ کہنے لگی۔ ''ان کے گھر پولیس اتری ہوئی ہے۔ دو تھانیدار اور دو سپاہی صبح سے آئے بیٹھے ہیں، ابھی تک باہر نہیں نکلے''۔

''اری کیوں؟'' پڑوسن نے چمچہ ہانڈی میں ہی چھوڑ دیا اور گھوم کر میناری والے کی بیوی کے قریب تر ہو کر پوچھا۔ ''کچھ پتہ چلایا کہ پولیس کیوں اتری ہوئی ہے؟''

''چوری کا مال برآمد کرنے کے لئے''۔

''ہائیں؟''

''ہاں''۔

''اللہ توبہ بی پڑوسن!'' میناری والے کی بیوی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہم بھی حیران تھے کہ یہ عورت اتنی بنی ٹھنی کیوں رہتی ہے۔ کانوں میں وہ لمبے لمبے کانٹے کہ کندھوں سے ٹکرا کر چھن چھن کرتے ہیں۔ کڑے، ہتھکڑیوں سے بھی موٹے...... اور کیا بتاؤں بی پڑوسن! پہلے روز وہ لوگ مکان میں آئے تو ہم ملنے گئیں سوچا تھا نئے نئے آئے ہیں، کوئی ضرورت تکلیف ہو تو پوچھ لیں، یہ نہ کہیں کہ اس محلے کے لوگ کتنے روکھے ہیں۔ ہم آئے تو کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ پر کیا بتاؤں بی پڑوسن! کیا مجال کہ اس عورت

ذات نے ہم سے جھوٹے منہ بات بھی کی ہو۔ کیا نخرہ ہے..... اللہ توبہ..... اور سن پڑوسن! اس کے ایک بیٹی بھی ہے۔ اٹھارہ بیس برس کی کنواری لڑکی۔ پر دنیا بھر کے زیور سے لدی ہوئی زمین پہ پاؤں نہیں رکھتی۔ یوں مٹک مٹک کر چلتی ہے جیسے ہرنی نہیں ہوتی چڑیا گھر والی"۔

"ان کا آدمی کیا کرتا ہے؟" پڑوسن نے ہانڈی میں چمچہ ہلا کر پوچھا۔

"سنا ہے سکول میں پڑھاتا ہے"۔ خیاری والے کی بیوی نے کہا۔ "یہی سوسوا سو تنخواہ پاتا ہوگا۔ نہ کوئی بیٹا نہ بھائی جو کماتا ہو اور جس کی طرف سے اوپر سے بھی مدد ہو۔ اتنی سی تنخواہ میں تو دال روٹی نہیں چلتی، کہاں سیروں وزنی سونا اٹکائے پھرتی ہیں۔ ہم بھی حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے؟ اتنا ڈھیروں زیور آیا کہاں سے ہے؟"

"اللہ توبہ..... اللہ توبہ!" خیاری والے کی بیوی اور اس کی پڑوسن نے مل کر اپنے اپنے کانوں پر ہاتھ دھرے اور خیاری والے کی بیوی بولی۔ "بچائیو بُروں کے سائے سے۔ میری توبہ، تُو ہی رکھوالا ہے۔ آج ساری بات کھل گئی ہے۔ میں سارا قصہ سن آئی ہوں۔ پہلے یہ لوگ..... اری یہی نئے کرایہ وار تین ہٹی میں رہتے تھے۔ وہاں سے مکان چھوڑ کر لالو کھیت چلے گئے اب یہاں مکان خالی دیکھا تو یہاں چلے آئے"۔

"پولیس والے بھی مٹک لیتے ہیں"۔ پڑوسن نے لقمہ دیا۔ "پیچھے پیچھے چلے آئے اور آ گردن پہ ہاتھ رکھا۔ اب جاؤ کہاں جاتے ہو"۔

"ہاں"۔ خیاری والے کی بیوی کو تائید ملی تو اس نے اور زیادہ خود اعتمادی سے کہا۔ "وہ سنا نہیں تھا تم نے؟ دولہا میاں نے اخبار میں پڑھا ہوگا اور تمہیں سنایا ہوگا۔ مجھے تو میاں ساری باتیں سناتے ہیں۔ تمہیں بھی سناتے ہوں گے تمہارے میاں۔ پچھلے دنوں ایک چوری ہوئی تھی نا۔ رنچھوڑ لائن میں، نہ جانے کہاں بے چارے مہاجروں کے گھر۔ دس ہزار کا تو صرف زیور تھا۔ دن دہاڑے نکل گیا۔ ایک ریڈیو اور نئے ریشمی کپڑے بھی نکل گئے۔ ساری عمر کی کمائی چور لے گئے۔ وہ سارا مال ان نئے کرایہ داروں کے گھر سے برآمد ہوا ہے۔ کسی نے اس عورت کے کانوں میں کانٹے پہچان لئے اور مخبری کر دی۔ اب دیکھ لو جا کر خود ہی۔ پولیس آن دھمکی اور مال برآمد کر لیا۔ جا کے دیکھ دو تھانیدار اور دو سپاہی اندر بیٹھے بیان لے رہے ہیں۔ ابھی تک باہر نہیں نکلے"۔

"پولیس نے تلاشی لے لی ہے؟" پڑوسن کی آنکھیں اور باچھیں کھل گئیں۔

"تو اور کیا؟" خیاری والے کی بیوی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "ہمارے میاں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ دو تھانیدار، دو سپاہی وکٹوریہ سے اترے اور سیدھے اندر چلے گئے۔ نہ دروازہ کھٹکھٹایا نہ اجازت لی۔ آگے آگے گھر والا پیچھے پیچھے پولیس"۔

"ہاں تو....." پڑوسن نے کہا۔ "پولیس دروازے کھٹکھٹا کے تھوڑے ہی آتی ہے، موت کی طرح آ دھمکتی ہے"۔

"تو اور کیا..... اور سن....." خیاری والے کی بیوی نے پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالنے کے لئے لمبی سانس لی اور بولی۔ "بی پڑوسن! خود ہی سوچ، کیا ملا چوری کا مال گھر میں ڈال کر؟ چار دن عیش کر لی۔ لوگوں کو دکھا لیا۔ گردن اونچی کر لی، پر ملا کیا؟ حاصل کیا ہوا؟ ہتھکڑیاں اور جیل۔ گھر والا جیل جائے گا اور ماں بیٹی در در کی ٹھوکریں کھائیں گی"۔

"اری یہ نہ کہو"۔ پڑوسن بولی۔ "ایسی کتیاں در در ٹھوکریں نہیں کھایا کرتیں۔ اس بازار میں جا بیٹھیں

گی۔ عزت تو ہم تم شریفوں کی ہوتی ہے لیکن ایک بات بتا دوں''۔ پڑوسن نے گردن کو بے تکا سا خم دے کر کہا۔ ''دیکھ لینا، ہوگا کچھ بھی نہیں، صاف نکل آئیں گے۔ اری سوچ ذرا جس گھر میں اتنا زیور، اتنا پیسہ اور ایسی جوان لڑکی ہو، وہاں جھگڑیاں اور قانون کیا کرے گا؟ مجھے تو کل ہی کسی نے کان میں کہا تھا کہ عورت بڑی بدمعاش ہے، جوان بیٹی کے سر پر عیش کر رہی ہے۔ وہ لڑکی کمسن اور کنواری کہاں ہے۔ کمبخت خرانٹ عورت ہے۔ پکی عورت! پولیس کو گمراہ کر دے گی۔ سمجھتی کیا ہو تم؟''

''اللہ توبہ..... اللہ توبہ، بخش دے مالک!'' منیاری والے کی بیوی نے کانوں پر یوں ہاتھ دھر لئے جیسے کانوں میں کوئی پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے لگا ہو۔ کہنے لگی۔ ''ہم تم انہی کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ انہی جیسوں کے پاپوں نے آٹا بھی مہنگا کر دیا ہے، چینی بھی، نہ گھی کا بھاؤ ایک جگہ ٹھہرتا ہے، نہ مٹی کے تیل کا۔ پچھلے دس دنوں سے چھالیا کے بھی دام چڑھ گئے ہیں۔ یہ سب اللہ کا قہر ہے بی پڑوسن! جس دیس میں اتنے پاپ ہوں وہاں خدا کی رحمت کیوں نازل ہونے لگی؟''

''گھر والے کی صورت دیکھو''۔ پڑوسن نے کہا۔ ''میں نے کل ہی دور سے دیکھا تھا۔ یوں لگے جیسے ابھی مسجد سے امامت کرا کے آ رہا ہو۔ وہ نورانی چہرہ اور اتنی بھلی داڑھی، پر کرتوت دیکھ لو..... اللہ توبہ!''

''اچھا پڑوسن! چل دیئے''۔ منیاری والے کی بیوی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور سن بی پڑوسن!'' اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ ''کسی سے بات نہ کرنا جو کرے سو بھرے ہمیں کیا۔ اپنے اپنے عمل ہیں۔ ہم کسی کا پردہ اٹھا کر کیوں گناہگار ہوں''۔

''نہ بہن!'' پڑوسن نے گردن کو ایک اور خم دے کر کہا۔ ''بھلا میں کوئی ایسی ہوں جو ہر کسی کو بتاتی پھروں گی؟''

منیاری والے کی بیوی کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھی۔ چبایا ہوا چھالیا پڑوسن کے چولہے میں تھوکا اور یوں جھکی جھکی سی، اداس اداس سی، چل پڑی، جیسے نئے کرایہ داروں کے گناہوں کا بوجھ اسی کے ضمیر پر آن گرا ہو۔ وہ دروازے سے نکلی ہی تھی کہ پڑوسن نے ہانڈی میں چمچہ ہلایا، ڈھکنا ہانڈی پر رکھا اور لکڑیاں چولہے سے پیچھے کر کے اچک کر اٹھی۔ سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور بارہ سیڑھیاں پھلانگتی کوٹھے پر جا پہنچی۔ پچھواڑے کی فصیل سے جھک کر چلائی۔ ''اری ناجو..... او ناجو! اری کہاں ہو..... سنا تم نے بھی؟''

''آئی پڑوسن!'' ناجو سر دھو کر غسل خانے سے نکلتے ہوئے چیخی۔ ''اری کیا ہو گیا؟ اوپر آ کے سنتی ہوں''۔

''تم لوگوں کو تو جیسے ہوش ہی نہیں''۔ ناجو اوپر آئی تو پڑوسن نے کہا۔ ''محلے میں آگ لگے، کوئی جئے کوئی مرے، تمہیں تو ہر روز سر دھونے سے فرصت نہیں ملتی۔ خدا سے ذرا کرو''۔

''اری کچھ بتاؤ تو سہی''۔ ناجو نے پانی ٹپکاتے بالوں کو نچوڑتے ہوئے پوچھا۔

''اے خے محلے میں قیامت آئی بیٹھی ہے''۔ پڑوسن نے سنسنی خیز لب و لہجے میں کہا۔ ''اِدھر ہو جا منڈھیر سے لڑھک نہ جائیو۔ وہ نئے کرایہ دار آئے ہیں نا..... اری وہی نکڑ والے مکان میں، ان کے ہاں پولیس اتری ہوئی ہے۔ تین ریڈیو اور چوری کی دو سنگر مشینیں ان کے گھر سے برآمد ہوئی ہیں اور سیروں زیور اور جانے کیا کیا۔ پولیس بیٹھی بیان لے رہی ہے۔ گھر والا حوالات میں بند بیٹھا ہے۔ گھر والی بھی، اس کی جوان بیٹی بھی۔ جوان بھی ایسی کہ کلموئی کی جوانی پھٹ پھٹ جاتی ہے''۔

''تم نے خود دیکھا ہے پڑوسن؟''

''اری ہاں تو، کیا جھوٹ بول رہی ہوں میں؟'' پڑوسن نے بلا خوف تردید وثوق سے کہا۔ ''میرے سامنے پولیس وکٹوریہ سے اتری ہے۔ دو تھانیدار اور دو سپاہی اترے اور دھائیں کرتے کرتے اندر چلے گئے۔ ماں بیٹی کونے کھدرے میں دبک گئیں۔ تھانیدار نے ماں کو چٹیا سے پکڑ کر صحن میں جو گھسیٹا تو کھٹ سے بتا دیا کہ چوری کا مال کہاں ہے۔ گھر والا بھی موجود تھا۔ پولیس نے جھٹ سے ہتھکڑی لگا لی..... کیا زمانہ آیا ہے بہنا! اللہ کرے پولیس انہیں پکڑ لے جائے اور عمر بھر کے لئے کال کوٹھڑی میں بند کر دے۔ ہمارا محلہ تو شریفوں کا محلہ ہے..... جانے کس مائی کے لال نے مخبری کر دی ورنہ چور اچکوں کا کھرا کھوج لینا کوئی آسان تھوڑے ہی ہے؟''

''میں بتاؤں؟'' ناجو نے رازداری سے کہا۔ ''مخبری ہمارے میاں نے کی ہے۔ میاں تو صبح ہی صبح کام پر چلے گئے ہیں۔ وہ ہوتے تو ساری واردات سناتے۔ اللہ رکھے، ہمارے میاں کے بازو بڑے لمبے ہیں۔ پولیس والوں کے ساتھ تو ان کا یارانہ ہے۔ یہ بڑے چھوٹے تھانیدار، حوالدار اور جمعدار جہاں ملیں، ہمارے میاں کو جھک کر سلام کرتے ہیں۔ پڑوسن بہن! اپنی اپنی ساکھ ہوتی ہے۔ ہمارے میاں تو ڈپٹی تک پہنچنے والے ہیں۔ تم جانو، اپنا راشن ڈپو ہے۔ کیا مجال جو چینی کا ایک دانہ بھی بلیک میں دے دیں یا بغیر کارڈ دیکھے اِدھر اُدھر کر دیں۔ دانے دانے اور کوڑی کوڑی کا حساب رکھتے ہیں''۔ ناجو بولتے بولتے منڈیر سے جھکی اور سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ چینی کی وہ بوری جو کئی روز سے بلیک ہو ہو کر آدھی رہ گئی ہے، پڑوسن کو نظر تو نہیں آ رہی لیکن اسے یاد آ گیا کہ رات ایک گاہک کو دس سیر چینی دے کر بوری اندر والی کوٹھڑی میں اُپلوں کے نیچے رکھ دی تھی۔ اس نے قریب تر ہو کر کہا۔ ''ان نئے کرایہ داروں کو تو ہمارے میاں اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں..... کیا کہا تھا تم نے کہ ان کی ایک جوان لڑکی بھی ہے؟''

''ہاں تو ناجو!'' پڑوسن نے واردات کی تصدیق سن کر اور زیادہ خود اعتمادی سے کہا۔ ''جوان لڑکی ہے پر ماں کا نخرہ جوان لڑکی سے بھی بڑھ کر ہے''۔ اس نے بالشت پھیلا کر کہا۔ ''اِتے لمبے لمبے کانٹے پہن رکھے ہیں جو کندھوں سے ٹکرا کر گھنگھروؤں کی طرح بجتے ہیں۔ پہلے روز ہم ان کے ہاں گئے۔ روٹی پانی کی پوچھی۔ کیا مجال جو اس عورت ذات نے ہماری بات بھی سنی یا پوچھی ہو۔ سچی بات ہے ناجو! مجھے ماں بیٹی دونوں بدمعاش دکھائی دیتی ہیں۔ شکل وصورت بھی انہی جیسی ہے جن کا نام لیتے بھی شرم آتی ہے.....''

پڑوسن نے چونک کر کہا۔ ''ہائے، میری ہانڈی نہ لگ جائے۔ چولہے پہ دھر آئی تھی..... اور سنو ناجو!'' اس نے التجا کے لہجے میں کہا۔ ''تم سے تو کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ کسی سے بات نہ کہنا۔ کیا فائدہ، جو کھڈا کھودے سو گرے۔ ہمیں کیا۔ ہم کاہے کو کسی کا پردہ فاش کرنے لگے''۔

''نہ پڑوسن!'' ناجو نے ناک پہ انگلی رکھ کر کولہے مٹکائے اور بڑے پیار سے کہا۔ ''پہلے بھی میرے منہ سے کسی کی برائی سنی ہے کبھی؟''

پڑوسن ''اللہ توبہ اللہ توبہ'' کا ورد کرتی سیڑھیاں اتر آئی اور ناجو نے بھیگے بالوں کو ایک اور مروڑا دیا اور چھت کی ہی راہ ساتھ والے گھر میں اتر گئی۔

''سنا تم نے بھی خاتون بی بی؟'' اس نے کھاٹ پہ بیٹھی خاتون بی بی کو کندھے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ نئے کرایہ دار آئے ہیں نا، گلی کی نکڑ والے

مکان میں، ان کے گھر پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔ تھانیدار، حوالدار، جمعدار اور سپاہی مار دھاڑ کرتے اندر جا گھسے اور گھر کی عورت اور اس کی جوان بیٹی کی وہ بے عزتی کی کہ اللہ توبہ..... اللہ توبہ! جانتی ہو کون ہیں یہ کرایہ دار؟''

''کون ہیں ناجو!'' خاتون بی بی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''مجھے تو نام لیتے بھی شرم آتی ہے بی بی خاتون! بس تُو خود ہی سمجھ لے۔ پر پولیس بڑی ہوشیار نکلی۔ موقع پر آن پکڑا اور چوری کا سارا مال برآمد کر لیا۔ ریڈیو، صوفے، مشین، زیور، چھالیا کے توڑے، قالین اور جانے کیا کیا۔ تھانیدار نے آتے ہی پوچھا۔ تم کہاں کام کرتے ہو؟ کتنا کماتے ہو؟ اتا ڈھیر سارا سامان کہاں سے لائے ہو؟ گھر والا چپ رہا۔ کیا جواب دیتا؟ اصل راز کھل گیا۔ پولیس نے کھٹ سے ہتھکڑی لگا دی۔ اب پولیس بیٹھی بیان لے رہی ہے''۔

''میں بتاؤں ناجو!'' خاتون بی بی نے رازداری سے سر ہلایا اور آنکھوں کے ڈھیلے گھما پھرا کر کہا۔ ''میرا بڑا لڑکا تو پتے پتے کی خبر رکھتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ پار سال کسی نے اس پر غنڈہ گردی کا جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا تھا اور بے چارے بے گناہ کو چھ ماہ قید ہو گئی تھی۔ پر شریف اتنا ہے کہ جب سے غنڈہ گردی میں پکڑا گیا ہے، پولیس اس کی دوست بن گئی ہے۔ ان کرایہ داروں کی مخبری دراصل میرے لڑکے نے کی تھی۔ تھانے میں جا کے رپورٹ درج کرائی کہ ہمارا محلّہ شریفوں کا محلّہ ہے اور گلی کی نکڑ پر بدکاری کا اڈہ کھل گیا ہے۔ بس پولیس پہنچ گئی..... پر ناجو بہن! کسی کو یہ نہ بتانا کہ مخبری میرے لڑکے نے کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کیس اِدھر ہی الٹ آئے''۔

اِدھر پڑوسن نے نیچے آ کر ہانڈی کو دیکھا۔ آخری بار چمچہ ہلایا اور سوچ میں کھو گئی۔ اس نے سینے میں بے چینی محسوس کی جو پیٹ کی طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے لکڑیوں کو چولہے میں دھکیلا مگر طبیعت چولہے سے بیزار ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے لکڑیاں پیچھے کھینچ لیں اور ہانڈی اتار کر باہر نکل گئی۔

ناجو، خاتون بی بی کے گھر سے اپنے گھر چلی گئی۔ چینی کی بوری والی کوٹھڑی کے کواڑوں کو تالا لگایا اور دوسرے گھر چلی گئی۔

خاتون بی بی نے اپنا برسوں پرانا سفید برقعہ اوڑھا۔ ٹرنک کو تالا لگا کر چابی ازار بند کے ساتھ باندھی اور باہر نکل گئی۔ یہ چابی اس کی شلوار کا لازمی جزو تھا۔ ایک بار وہ چابی گھر بھول گئی تھی تو بڑے لڑکے نے ٹرنک کا تالا کھول کر پندرہ روپے اڑا لئے تھے۔

خاتون بی بی جب سر دھوتی تھی تو گلی والی منڈیر پر بیٹھ کر بال خشک کیا کرتی تھی جہاں سے ہر گزرنے والا ارادی یا غیر ارادی طور پر اوپر ضرور دیکھتا تھا لیکن وہ جب باہر نکلتی تھی تو برقعہ اوڑھ کر نکلتی تھی۔ اس برقعے میں بڑی برکت تھی۔ ایک بار اس نے چوڑیوں کی دکان سے دونی کی چھ چوڑیاں چڑھوائی تھیں اور جب گھر آئی تو اس کے بُرقعے سے ایک درجن چوڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔

نئے کرایہ داروں کا کنبہ مختصر سا تھا۔ جب سے کنبہ محلے میں آیا تھا، محلے والوں نے انہیں اوپر تلے سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں آئے ابھی چار روز ہوئے تھے۔ گھر کا سامان پوری طرح کھلا نہ تھا اور نہ ہی وہ خود محلے کے کسی گھرانے سے کھل سکے تھے۔ دو تین عورتیں ان کے ہاں گئیں لیکن ماں بیٹی اتنی مصروف تھیں کہ کسی کے پاس بیٹھ سکیں نہ کسی کو بٹھا سکیں۔ آج صبح سارے محلے نے دیکھا دو باوردی تھانیدار اور دو باوردی کانسٹیبل، اس کنبے کے ایک آدمی کے ساتھ

وکٹوریہ سے اترے اور اندر چلے گئے۔ پھر انہیں باہر نکلتے کسی نے نہ دیکھا اور نہ کسی نے اندر جا کر دیکھا کہ اندر ہو کیا رہا ہے۔ کوئی بھی گواہ کی حیثیت سے تھانے اور عدالتوں کے چکر میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ بچوں نے کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر دیکھا لیکن شیشے اس قدر میلے تھے کہ کچھ نظر نہ آیا۔ محلے کی بعض عورتیں کام دھندا چھوڑ کر دروازوں میں کھڑی کسی سنسنی خیز خبر کا انتظار بے تابی سے کر رہی تھیں کہ منیاری والے کی بیوی نے ''سکوپ'' مارا اور جنگل میں آگ لگا دی۔ ادھر منیاری والے کی بیوی کی پڑوسن، ناجو اور خاتون بی بی ایک دوسرے کو اس تاکید کے ساتھ کہانی سنا کر کہ ''کسی سے ذکر نہ کرنا''۔ دوسرے گھروں میں جا کر کہانی سنا رہی تھیں۔ اس تاکید کے ساتھ۔ ''کسی سے ذکر نہ کرنا''۔

محلے کے مرد تو اپنے اپنے کام کاج پہ نکل گئے تھے۔ محلے میں عورتوں کی بادشاہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے در و دیوار سے بھی آوازیں اٹھی رہی تھیں۔ ''اری، سنا تم نے بھی؟..... وہ جو نئے کرایہ دار آئے ہیں نا ان کے گھر پولیس اتری ہوئی ہے''۔

''اور دیکھو، ہماری آنکھوں میں دھول کس طرح جھونکی جاتی ہے''۔ بچ سورہ اور حمائل شریف بیچنے والے کی بیوی نے کہا۔ ''نور کے تڑکے اس گھر سے قرآن کی وہ سریلی تلاوت ہوتی ہے جیسے خدا کا گھر یہی ہے اور گھر کے میاں جب سے آئے ہیں، مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے تو بچوں کے ابا کو کہہ دیا ہے کہ ان کا حقہ پانی بند کر دو اور اسے مسجد میں نہ آنے دو۔ کمبخت جانے کیسے لوگ ہیں''۔

''اری! وہ اس دفتر میں کام کرتا ہے، مجھ سے پوچھو''۔ ایک کلرک کی بیوی نے کہا۔ ''بیس ہزار کے غبن میں پکڑا گیا ہے اور آج پولیس گھر کی تلاشی لینے آئی ہے''۔

''اری! نہیں''۔ غنڈے کی ماں نے کہا۔ ''تمہیں تو اصل بات کا علم ہی نہیں، افیون چرس کا کاروبار کرتے پکڑا گیا ہے''۔

''چوری کی تھی لالو کھیت میں''۔ راشن ڈپو والے کی بیوی نے کہا۔ ''اور یہاں بھاگ آئے۔ چینی کی دو بوریاں بیچ چکے تھے۔ باقی پکڑی گئی ہیں۔ نامراد رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں''۔

ڈیڑھ دو بجے تک پولیس نئے کرایہ داروں کے گھر میں ہی بیٹھی رہی۔ عورتوں کو دکانوں پر کھانا بھیجنا تھا۔ خود بھی بھوک سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ آج تو بھوک زیادہ ہی ستا رہی تھی۔ باتیں کر کر کے پیٹ خالی ہو گئے تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیں لیکن گلی کی نکڑ کے رستے، خواہ یہ راستہ دو فرلانگ لمبا ہی تھا مگر نئے کرایہ داروں کا مکان اندر سے بند تھا۔ صرف ایک سپاہی برآمدے میں ایسے انداز سے ٹہل رہا تھا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔

''تفتیش بہت لمبی ہو گئی ہے''۔ گلی سے ایک اور سرگوشی ابھری۔

''سامان بھی تو تھوڑا نہیں''۔ ایک اور سرگوشی سنائی دی۔

بی پڑوسن ابھی چولہے پہ بیٹھی ہی تھی کہ ناجو سیڑھیاں اتر آئی اور اس کے پاس آ بیٹھی۔ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ بوا جمال بیگم کھانستی کھنکارتی اندر آ گئی۔ بوا جمال بیگم بریلی والے عطر فروش کی دادی تھی۔ دن بھر کر دوہری کئے، خراماں خراماں محلے کے گھر گھر کا دورہ کرتی تھی۔ دو چار منٹ یہاں، پانچ سات منٹ وہاں رکتی، کسی کو دعا دیتی، کسی کے سر پر ہاتھ پھیرتی، کسی نئی نویلی دلہن کو دیکھ کر اس کے حسن و جمال کے قصیدے پڑھ دیتی اور اگر کسی نے پاس بٹھا لیا تو بوا جمال بریلی

کے قصے لے بیٹھتی تھی۔ یہ سارے کا سارا محلہ مہاجروں کا تھا۔ کوئی بھی گھرانا کراچی کا مقامی نہیں تھا۔ سبھی سینوں میں کچھ باتیں، کچھ یادیں اور اچھے وقتوں کے قصے اٹھائے پھرتے تھے جو وہ ہر کسی کو سنانے اور ہر کسی سے سننے کو بے تاب رہتے تھے۔

بوا جمال سنتی بھی تھی سناتی بھی تھی۔ خود آنسو بہا لیتی تھی اور دوسروں کے آنسو پونچھ ڈالتی تھی۔ گلی میں کھیلتے بچوں کو دیکھنے رک گئی تو بوا گھنٹوں بچوں کو ہی دیکھتی پوپلے قہقہے لگاتی رہتی تھی۔ جب پیار سے بے تاب ہو جاتی تھی تو لپک کر کسی بچے کو اٹھا لیتی اور اسے دیوانہ وار چومنے لگتی تھی اور وہ یوں ہی بڑھاپے کو بچپن سے ہم آغوش کر کے مسرور اور شاداں زندگی گزار رہی تھی۔ بوا کنواریوں کی سہیلی، سہاگنوں کی ہم راز اور بوڑھیوں کی روحانی ساتھی تھی۔ وہ تو بریلی والوں کا ہنستا مسکراتا، وقت اور زمانے کی جھریوں میں چھپا ہوا ماضی تھی۔ محلے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے دل میں بوا جمال کی چاہت نہ ہو۔ ماتم ہو یا بیاہ، کوئی بلائے نہ بلائے، بوا پہنچ جاتی اور محفل کی جان بن جاتی تھی۔ ماتم ہو تو بوا کے دلدوز بین سارے محلے کو ہلا ڈالتے تھے اور اگر بیاہ ہو تو بوا کنواریوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر ڈھولک کے گرد بٹھا دیتی تھی۔

بوا نے کبھی شکوہ نہ کیا تھا کہ بریلی سے کراچی چلے آئے تو کراچی والوں نے جگہ جیسا مکان دیا۔ بارش کی رُت میں کسی نے شکایت کی۔ ''بوا! رات بھر چھت ٹپکتی رہی، قسم لے لو جو پل بھر آنکھ جھپکی ہو۔ ایسی بارش سے تو خشک سالی بھلی''۔ بوا بولی۔ ''تیرے بچے جیئیں بیٹا! چھت تو اپنی بھی رات بھر ٹپکتی رہی لیکن ہم تو ٹپکنا سنتے رہے۔ فرش پر ایک جگہ کٹورا رکھا، دوسری جگہ پیالہ رکھا۔ جہاں زیادہ ٹپکتا تھا وہاں تانبے کی پرات رکھ دی اور دو جگہوں پہ پیالیاں رکھ دیں۔ ٹپکتا بھی تو جگہ جگہ سے تھا۔ رات بھر کٹورے، پیالے، پرات اور پیالیوں نے وہ جل ترنگ بجایا کہ مزہ ہی تو آ گیا۔ کیا مدھ بھرا ٹپکنا تھا۔ ایک کونہ محفوظ تھا۔ دری بچھائی اور لمبی تان کے سوئے''۔

بی پڑوسن اور ناجو کے سر ابھی جڑے نہ تھے کہ بوا جمال کھانستی کھنکارتی آن پہنچی۔ دوپٹے میں تین چار مالٹے، چار کیلے، تھوڑے سے بادام، کشمش اور سوکھی خوبانیاں باندھے جھکی جھکی دونوں کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گئی اور دوپٹہ ان کے سامنے پھیلا دیا۔ ''اللہ بٹیا! قسمت ہو تو ایسی ہو''۔ بوا نے ایک ہاتھ ناجو اور دوسرا ناجو کی بی پڑوسن کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو کھاؤ''

''یہ کہاں سے اٹھا لائی ہو بوا؟'' ناجو نے پوچھا۔

''نئے کرایہ داروں کے گھر سے، کھڑی کھڑی گئی

ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ

☆.....قرآن میں تم سے پہلے کی خبریں، تمہارے بعد کے واقعات اور تمہارے درمیانی حالات کے لئے احکام ہیں۔

☆.....میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاکت میں مبتلا ہوں گے۔ ایک محبت میں حد سے آگے بڑھ جانے والا اور دوسرا جھوٹ، بہتان باندھنے والا۔

☆.....دل کبھی مائل ہوتے ہیں کبھی اُچاٹ ہو جاتے ہیں لہٰذا جب مائل ہوں اس وقت انہیں مستحبات کی بجاآوری پر آمادہ کرو اور جب اچاٹ ہو تو واجبات پر اکتفا کرو۔

☆.....تمہارا قاصد تمہاری عقل کا ترجمان ہے اور تمہاری طرف سے کامیاب ترجمہ کرنے والا تمہارا خط ہے۔

تھی پر ماں بیٹی نے بٹھا لیا۔ بڑی سگھڑ بیٹیاں ہیں۔ میں اٹھی تو انہوں نے یہ الا بلا باندھ دیا۔ بڑے نیک لوگ ہیں''۔ بوا نے ایک مالٹا بی پڑوسن کو دیا اور ایک کیلا چھیل کر ناجو کے ہاتھ میں دیتے دیتے رک گئی اور بولی۔ ''نہ بٹیا! تم کیلا نہ کھاؤ، تمہارے دن کچھ ایسے ویسے ہیں۔ یہ لو خوبانیاں اور کشمش کھالو۔ صحت کا خیال رکھا کرو، اللہ تجھے چاند جیسا بیٹا دے''۔

''بوا!'' بی پڑوسن نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا۔ ''کیا کہا تھا تم نے، نئے کرایہ داروں کے گھر سے آئی ہو؟''

''ہاں تو''۔ بوا بولی۔ ''میں تو صبح سے وہاں بیٹھی تھی۔ ابھی ابھی روٹی کھلا کے اٹھنے دیا ہے۔ انہی کا تو کہہ رہی تھی کہ قسمت ہو تو ایسی ہو۔ آج صبح صبح ان کا بیٹا تھانیداری کا کورس پاس کر کے لوٹا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا، خیر سلا پوچھنے ان کے گھر جا گھسی۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ بریلی کے رہنے والے ہیں۔ گھر والا کالج میں فارسی پڑھاتا ہے۔ سینکڑوں تنخواہ پاتا ہے۔ ایک ہی بیٹا ہے نیک بختوں کا۔ ارشاد علی نام ہے اور ایک جوان لڑکی ہے۔ لڑکا تھانیداری کے عہدے پر بھرتی ہوا تھا۔ آج ہی کورس پاس کر کے آیا ہے اور یہاں صدر تھانے میں لگ گیا ہے۔ باپ سٹیشن پر لینے گیا تھا۔ ماں بہن دروازے میں کھڑی راہ دیکھ رہی تھیں''۔

بوا بولے جا رہی تھی اور بی پڑوسن اور ناجو ایک دوسری کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھیں۔ بوا کہہ رہی تھی۔ ''اس کے ساتھ اس کا دوست بھی آیا ہے۔ وہ بڑا تھانیدار ہے جسے انسپکٹر کہتے ہیں۔ وہ بھی صدر تھانے میں لگا ہوا ہے۔ اللہ لمبی عمر دے کیا خوبصورت بیٹا ہے ارشاد علی۔ وردی میں تو نگری کا راجا لگتا ہے۔ ماں بہن کا تو مارے خوشی کے یہ حال ہو رہا ہے کہ زمین پر پاؤں نہیں ٹکتے۔ خوشی خوشی میں ایک پرچ اور دو پیالیاں توڑ چکی ہیں..... اور سنو بٹیا! ایک اور خبر سناؤں جو بڑا تھانیدار ساتھ آیا ہے نا، ارشاد علی کا دوست، وہ بھی بریلی کا رہنے والا ہے۔ بڑا خوبصورت جوان ہے وہ بھی۔ ارشاد علی نے میرے سامنے ماں سے کہا کہ میں نے بہن کا رشتہ اپنے اس دوست کو دے دیا ہے۔ دیکھو امی! میری ناک رکھ لینا، انکار نہ کر دینا۔ میرا جگری یار ہے۔ تن تنہا آدمی ہے، ماں باپ بریلی میں شہید ہو گئے تھے۔

یہ سنا تو ارشاد علی کی ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ بولی، میں تو تیری بہن کی فکر میں مری جا رہی تھی بیٹا! تُو نے تو میرا غم ختم کر دیا ہے۔ بہن نے بھی سن لیا، وہ مارے شرم کے اندر جا چھپی۔ اللہ بٹیا! اس گھر میں تو خدا بھی مسکراتا نظر آتا ہے۔ بڑے نیک لوگ ہیں۔ میں تو کل بھی اور پرسوں بھی ان کے ہاں گئی تھی۔ نور کے تڑکے ماں بیٹی تلاوت کرتی اور بیچ وقت نماز پڑھتی ہیں۔ میاں مسجد میں جاتے ہیں۔ تم جانو، اس لڑکی کی خوشی کا کیا ٹھکانہ جس کا بھائی تھانیدار اور خاوند بھی تھانیدار ہو اور باپ پروفیسر۔ دو سپاہی سامان لے کے ساتھ آئے ہیں۔ بس اگلے چاند کی کسی تاریخ بیاہ ہو جائے گا۔ باپ نے حق حلال کی کمائی سے بیٹے کو پڑھایا اور اللہ تعالیٰ نے حق حلال کی لاج رکھ لی''۔

ناجو نے بی پڑوسن کی طرف اور بی پڑوسن نے ناجو کی طرف دیکھا۔ مگر دونوں کی آنکھیں جھک گئیں۔ ناجو نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے؟''

بی پڑوسن نے لپک کر ہانڈی کا ڈھکنا اٹھایا اور بلبلا کر بولی۔ ''ہائے، میری تو ہانڈی جل گئی۔ اللہ سمجھے ان نئے کرایہ داروں سے''۔

(جنوری 1970ء)

چار دیواری کی دنیا

بانجھ

بے اولادی کا غم میری بہن کو لے بیٹھا

☆ عارف شہزاد
0315-6736148

جب میں نے بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا تو ابو مجھے صاف یہ بات کہہ کر چلے گئے کہ تم اب شادی کی تیاریاں کرو۔ کیونکہ تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ مجھے بھی یہ بات معلوم تھی۔ ابو ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں جتنی بھی تعلیم حاصل کر لیں بالآخر انہیں گھر ہی سنبھالنا پڑتا ہے۔ میں ابھی مزید پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں اپنی بات منوا نہیں سکتی تھی۔ میں نے امی سے بارہا کہا کہ ابو کو سمجھائیں لیکن امی کا ایک ہی جواب تھا کہ پڑھ لکھ کر بھی تم نے گھر داری ہی کرنی ہے۔ لہٰذا بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

میں کمزور عورتوں کی طرح والدین کے آگے جھکنا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی جھک گئی۔ کیونکہ جو دکھ وہ برسوں پہلے بھگت چکے تھے۔ وہ دکھ انہیں دینا نہیں چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی میرے والدین کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اب میں ہی ان کا سب کچھ تھی۔

اور پھر خاندان میں ہی ایک لڑکا دیکھ کر میری شادی طے کر دی گئی۔ لڑکا سرکاری افسر تھا۔ شادی میں چند دن رہ گئے تھے اور گھر میں لڑکیوں نے خوب رونق لگا رکھی تھی۔ میری آنکھوں میں بے اختیار سعدیہ باجی کی شادی کا منظر گھوم گیا اور بہت سے زخموں کے منہ کھل گئے۔

ٹھیک انیس سال پہلے بھی اسی گھر میں اسی طرح کا شور و غل تھا۔ بہت سارے مہمان آئے ہوئے تھے۔ میرے والدین بے حد خوش تھے۔ کیونکہ سعدیہ باجی کی شادی ہو رہی تھی۔ سعدیہ باجی انتہائی ذہین، سلیقہ مند

اور ہر خوبی رکھنے والی لڑکی تھی۔ صرف 25 سال کی عمر میں انہوں نے ٹرپل ایم اے کیا۔ ہمارا پورا خاندان کہتا تھا کہ احمد علی نے تو اپنی بیٹی دس لڑکوں کے برابر بنائی ہے۔ ابو باجی سے مشورہ کیے بغیر نہیں چلتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر بگڑا ہوا مسئلہ سیکنڈوں میں حل کر دیتی تھیں۔ باجی ابو کا مان تھیں اور ہر معاملے میں بہت سمجھداری سے کام لیتی تھیں۔ ابو بنک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ لہٰذا امی نے کافی بچت کی ہوئی تھی۔ گھر میں کبھی تنگی دیکھی ہی نہیں۔ امی گھر چلانے میں ماہر تھیں۔ سعدیہ باجی ان سے بھی چار ہاتھ آگے تھیں۔ اسی لیے لوگ ہمارے گھر کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

گھر میں ان کی شادی کی باتیں ہونے لگیں لیکن جب سعدیہ باجی نے اپنی تعلیم مکمل کی تو ابو نے ان سے پوچھا کہ کیا تم شادی کرنا چاہتی ہو۔ تو انہوں نے صاف منع کر دیا اور ابو سے کہا کہ میں ابھی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ ابو نے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ فوراً امی سے کہہ دیا۔ اس گھر میں سعدیہ کی شادی کا ذکر نہ کیا جائے کیونکہ سعدیہ جیسا چاہے گی ویسا ہی ہوگا۔

میں ان دنوں سات سال کی تھی۔ ان باتوں کو صرف سن سکتی تھی۔ سمجھ نہیں سکتی تھی۔ پھر اچانک ابو کی خالہ زاد بہن نے اپنی نند کے بیٹے کے لئے سعدیہ باجی کا رشتہ مانگ لیا۔ فرقان بھائی ہمارے گھر آئے تو سعدیہ باجی کو بھی اچھے لگے اور پھر دونوں کی رضامندی سے یہ شادی ہوگئی۔

سعدیہ باجی اپنے سسرال میں بہت خوش تھیں۔ ہمیں کبھی بھی ان کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ فرقان بھائی کی ساری فیملی بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھی۔ وہ لوگ لڑائی جھگڑے کرنے کی بجائے بات چیت سے مسئلہ حل کرنے کے قائل تھے۔ پھر سعدیہ باجی بھی بہت سمجھدار تھیں۔ اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھیں لیکن ان کی زندگی میں ایک خلا تھا۔ اتنے برسوں بعد بھی ان کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر نے اس بات کو مسئلہ نہیں بنایا اور اللہ کی رضا میں راضی رہے لیکن باجی بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ دراصل ان کی رپورٹ آ چکی تھی۔ اور اس کے مطابق وہ مکمل طور پر بانجھ تھیں۔ میڈیکل سائنس میں ان کا کوئی علاج نہ تھا۔

فرقان بھائی نے تیرہ سال ان کا بہت ساتھ دیا۔ ہر طرح سے ان کا علاج کروایا لیکن وہ بھی تھک چکے تھے۔ باجی نے جب دیکھا کہ شوہر بھی ساتھ دینے والا نہیں رہا تو وہ سخت ٹینشن کا شکار ہوگئیں۔ یہ پہلی بار تھا جب میں نے سعدیہ باجی کو زندگی میں بے بس، لاچار اور مایوس پایا۔ انہوں نے لوگوں کے الٹے سیدھے مشوروں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ مختلف عاملوں اور نجومیوں کے پاس جانے لگیں۔ ہر شخص سے دعا کروانے لگیں۔ فرقان بھائی ابو، امی کو بارہا آ کر شکایت لگاتے کہ سعدیہ کو سمجھائیں کہ تعویذ دھاگوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ جو جس کے نصیب میں ہو وہ اسے مل کر رہتا ہے۔ مگر سعدیہ باجی کا تو دماغ جیسے ختم ہو چکا تھا۔ اتنی پڑھی لکھی اور سمجھدار عورت جس سے لوگ مشورے مانگتے تھے اب لوگوں کے رحم و کرم پر آ گئی تھیں۔

جہاں، امی، ابو اس اذیت سے گزر رہے تھے۔ وہاں فرقان بھی باجی کی حالت سے تنگ آ گئے تھے۔ بالآخر ایک روز وہ سعدیہ باجی کو ہمارے گھر چھوڑ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس عورت نے میرے گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔ امی، ابو کو یہ بات سن کر یقین ہی نہیں آیا کہ جس بیٹی پر انہیں مان تھا اور جس کی سب مثالیں دیا کرتے تھے۔ وہ اپنی جنت کو جہنم بنا سکتی ہے۔ جبکہ

باجی کہتی تھیں کہ اگر میں کچھ غلط بھی کر رہی ہوں تو صرف اور صرف فرقان کی خوشی کے لیے کر رہی ہوں۔ میں اس کو اولاد کی خوشی دینا چاہتی ہوں۔ اگر میں کوشش نہیں کروں گی تو فرقان کے گھر والے اس کی دوسری شادی کروا دیں گے۔ اور میں فرقان کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی۔

فرقان بھائی نے باجی سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے بچے نہیں چاہئیں۔ میں قدرت کے فیصلے پر راضی ہوں۔ تم بھی اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ اور کسی عامل وغیرہ کے پاس مت جاؤ۔ مگر وہ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ بات اس وقت بڑھی جب کسی فراڈیے عامل نے انہیں یہ کہہ دیا کہ اپنی ساس نندوں سے بچنا۔ انہوں نے یہ عمل کروایا ہوا ہے کہ تمہاری اولاد نہ ہو۔

اس کا توڑ وہ کر دے گا۔ بس وہ اپنی ساس اور نندوں کے سر کے بال اور استعمال شدہ کپڑے اسے لا کر دے۔ میں آج بھی حیران ہوتی ہوں کہ باجی جیسی عقل مند عورت صرف اولاد کے لئے اس بات کو کیسے اہمیت دینے پہ تیار ہو گئی۔ جب رات کا پچھلا پہر تھا تو باجی ایک بیگ ہاتھ میں لیے چوری چوری گھر سے نکل رہی تھیں۔ فرقان بھائی نے انہیں دیکھ لیا اور انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ اپنے گھر میں بغیر شور کیے باجی کو لیکر ہمارے گھر آ گئے۔ پھر ہم تو کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ کیونکہ بیگ میں فرقان بھائی کی امی اور بہنوں کے کپڑے تھے گھر سے لیے لیموں تھے، مرچیں تھیں، بال تھے۔

فرقان بھائی نے امی ابو کو صاف کہہ دیا کہ آپ اسے یہیں رکھیے۔ میرا اب اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ اگر میری بہنیں اس کو ایسے دیکھ لیتیں تو سوچئے پھر اس کا کیا حال کرتیں۔ برباد تو میں ہوا ہوں۔ زندگی میری خراب ہوئی ہے۔ کیونکہ میں نے جس سعدیہ سے شادی کی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ سوچا تھا پڑھی لکھی عورت میری سوچ کو سمجھے گی۔ مگر یہ تو قدم سے قدم ملانے کے قابل ہی نہیں ہے۔

فرقان بھائی باجی سے بے تحاشہ پیار کرتے تھے۔ جان چھڑکتے تھے باجی پہ۔ لیکن آخر وہ بھی کب تک برداشت کرتے۔ وہ باجی کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہتے تھے۔ لہٰذا چاہے جتنا بھی ناراض ہوتے پھر بھی منا کر لے جاتے۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ 13 سال میں ہم نے اپنی بہن کو غلط پایا۔ وہ بھی غلط نہیں تھیں۔ اس کا طریقہ غلط تھا۔ وہ ہمیں دلائل دیتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ اگر کسی ہرے بھرے درخت پر بھی بانجھ لکھ دو تو وہ بھی سوکھ جاتا ہے۔ میں کیا کروں اللہ نے میرے اندر یہ کمی کیوں رکھ دی۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا۔ ہم ہر طریقے سے ان کو سمجھا چکے تھے۔ مگر وہ تھیں کہ ان کے دل کو کسی طرح سکون نہیں آتا تھا۔

پھر وہ منحوس دن آیا عید الاضحیٰ سے ایک ہفتے پہلے ہمیں معلوم ہوا کہ فرقان بھائی نے دوسری شادی کر لی۔ وہ کہتے تھے کہ شادی میرا حق ہے۔ میں افورڈ کر سکتا ہوں۔ اور میری بیوی ذہنی بیمار ہے۔ لہٰذا نہ مجھے قانون روکتا ہے، نہ شریعت۔ میں سعدیہ سے ویسے ہی محبت کروں گا۔ جیسے کہ کرتا آیا ہوں۔ میری طرف سے کبھی کچھ غلط نہ ہوگا۔ نہ اسے شکایت کا موقع دوں گا۔ مگر یہ دکھ میری بہن کو ایسا لگا کہ وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا دھیان رکھنا، فکر کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کھاتی پیتی بھی نہیں تھی۔ فرقان بھائی صرف ضرورت کے وقت ہی اپنی دوسری بیوی کے پاس جاتے تھے۔ ورنہ وہ ہر روز سعدیہ باجی کے پاس ہوتے تھے۔ مگر باجی اب میکے سے جانے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ فرقان بھائی ہمارے گھر رہنا نہیں

چاہتے تھے۔ اور پھر یوں ہوا کہ فرقان بھائی دو دن ہمارے گھر نہیں آئے۔ باجی مسلسل فون کر رہی تھیں اور وہ کاٹ رہے تھے۔ باجی ان کے بارے میں غلط باتیں سوچ رہی تھیں۔ ان کے دماغ میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے کہ اب ان کا شوہر نئی بیوی کا غلام ہو گیا ہے اور انہیں نظر انداز کر رہا ہے۔

پھر دو دن بعد جب فرقان بھائی آئے تو باجی نے ان سے کچھ بھی پوچھے بغیر جاہل اور اُجڈ عورتوں کی طرح جھگڑا شروع کر دیا۔ انہوں نے فرقان بھائی کے پورے خاندان کو گھسیٹ لیا اور بددعائیں اور کوسنے دینے لگیں۔ ان کی سات نسلوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میرے امی، ابو، چچا، چچی نے سعدیہ باجی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن بات سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔

پھر فرقان بھائی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور انہوں نے جنونی انداز میں گالیاں بکتی باجی کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مار دیا۔ باجی ایک دم خاموش ہو گئیں اور بے یقینی اور صدمے کے عالم میں اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

اس رات فرقان بھائی بے تحاشہ روئے اور بولے۔ ''انکل، آنٹی میں کہاں غلط ہوں؟ میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں 16 سال بعد باپ بنا ہوں۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ میں دو دن اپنی دوسری بیوی کا خیال رکھ سکوں؟''

قارئین! فرقان بھائی یہ کہہ کر گھر چلے گئے۔ کیونکہ ان کی دوسری بیوی کو ان کی ضرورت ہے۔ ابو، امی، چچا، چچی نے سعدیہ باجی کو اعتماد میں لیا اور کہا۔ سعدیہ زندگی میں ہر چیز ویسی نہیں ہوتی جیسا ہم چاہتے ہیں۔ تم ہماری لاڈلی بیٹی ہو۔ مگر تم ہی سب سے بڑھ کر ہمارے لیے تکلیف کا باعث بنی ہو۔ ہم تمہیں دیکھ کر دُکھی ہوتے ہیں۔ دنیا میں لاکھوں لوگ بے اولاد ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب جینا چھوڑ دیتے ہیں۔ تم نے کیوں اللہ کی رضا کے آگے سر نہیں جھکایا۔

''سعدیہ تم میرا غرور ہو''۔ ابو رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''میرا بازو ہو۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔ مجھے اس دکھ سے نجات دو۔ مجھے میری پہلی والی ہنستی مسکراتی سعدیہ چاہیے''۔ ابو مسلسل رو رہے تھے۔ اور سعدیہ باجی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں۔ انہیں ابو نے بتایا۔ فرقان کا بیٹا ہوا ہے۔ یہ سمجھو کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ بات کو سمجھ میری بچی۔ مگر یہ ایسا دھچکا لگا تھا جو وہ سہہ نہ پائی۔

اس رات وہ سوئی تو صبح پھر نہ اٹھ سکی۔ انہوں نے چوہے مار گولیاں وافر مقدار میں کھالی تھیں۔ جب امی انہیں جگانے گئیں تو معلوم ہوا بہت دیر ہو چکی ہے۔ ہمارے گھر میں قیامت برپا تھی۔ فرقان بھائی اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے۔ ابو نے تو خود کو بالکل نڈھال چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو زندگی کا طریقہ سکھانے والی سعدیہ آج خود عبرت کا نشان بن گئی۔ کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ صرف قسمت کی بات تھی۔ جو میری بہن کو سمجھ نہ آئی میں نے ابو، امی کو دوبارہ کبھی کھل کر مسکراتے نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ امی، ابو مجھے تعلیم مکمل نہیں کرنے دے رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا۔ شاید میں بھی باجی کی طرح اپنی تعلیم کو ضائع کر دوں گی۔ جبکہ ایسا نہیں تھا۔ تعلیم انسان کو عقل و شعور سکھاتی ہے۔ باجی کا مسئلہ صرف قسمت پر ہی راضی نہ ہونا تھا۔ جسے اس نے اپنی سوچ پر سوار کر لیا تھا۔ ورنہ جو کچھ ہوا وہ شاید نہ ہوتا۔ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ اللہ پاک ہی کی رضا میں ہماری رضا ہے تو سوچ پُرسکون گزر سکتی ہے۔

تُو کہانی ہی کے پردے میں بھلی لگتی ہے
اے زندگی! تیری حقیقت دیکھی نہیں جاتی

❁❁❁

خاکہ

صحت مند باتونی

ان کے کھانے کی رفتار بھی بولنے سے کسی طرح کم نہیں جتنی دیر میں ہم دو لقمے لیتے ہیں یہ دو روٹیاں لپیٹ چکے ہوتے ہیں۔

☆ خادم حسین مجاہد

ان کی صحت اتنی ہے کہ عام بندہ دیکھ کر ڈر جائے اور بولتے اتنا ہیں کہ خواتین سر پکڑ کر بیٹھ جائیں اس لئے صحت مند باتونی کہلاتے ہیں۔ اتنا تیز بولتے ہیں کہ ریکارڈ کر کے سلو کر کے سنیں تو شاید کچھ سمجھ میں آ جائے۔ ایک ایک فقرہ اس رفتار اور روانی میں تین تین چار چار بار بولتے ہیں۔ شاید اس تکرار کی وجہ بات پر زور دینا ہو لیکن اتنی بار کہنے کے باوجود سمجھ میں ایک بار بھی نہیں آتا اس کی بجائے وہ ایک بار آرام سے کہہ دیتے تو شاید کچھ پلے پڑ جاتا کیونکہ جتنی دیر میں ہم ایک فقرہ بولتے ہیں وہ کئی فقرے بول کر آگے پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

ایک بار میں نے کہا کہ تم یہ فقروں اور لفظوں کی تکرار نہ کیا کرو ورنہ کبھی تم بیوی کو ایک طلاق دینا چاہو گے تو تین چار نکل جائیں گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی اور پھر تم حلالے کے لئے کوئی شریف آدمی ڈھونڈتے پھرو گے تو بولے۔ شادی تو ہونے دو کون کافر ایک بار بھی یہ لفظ منہ سے نکالے گا لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد ملے تو بولے کہ میں تو وہ لفظ تین چار بار بولنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہوں لیکن مجھے خطرہ ہے کہ مولوی میری تکرار کی عادت اور معذوری کے باعث مجھے رعایت دیتے ہوئے تین چار کو بھی ایک طلاق ہی گنیں گے جس سے آزادی کی بجائے معاملات اور پیچیدہ ہو جائیں گے۔

نوجوانی میں فلموں اور ڈراموں کے بے حد شوقین تھے اور جو اداکارہ پسند آتی اس کی تصویر اخبارات میں سے ڈھونڈ کر کاٹ لیتے اور سرہانے کے نیچے رکھتے اور

ان کی نفاست کی بنا پر ان کو یقین کامل تھا کہ وہ سب فطری حوائج ضروریہ کی مجبوری سے آزاد ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ وہ بھی انسان ہیں اور تمام انسانی علائق ان کے ساتھ بھی ہیں تو پہلے تو تسلیم ہی نہ کیا اور جب رفتہ رفتہ انہیں حقیقت معلوم ہوگئی تو بڑے بدمزہ ہوئے تو میں نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ اچھے کام کرو تاکہ جنت کی حور ملے صرف وہی ان علائق سے پاک ہو گی۔

جب ان کے لئے رشتہ پسند کرنے کا مرحلہ درپیش تھا تو جسے یہ پسند کرتے اسے کسی نہ کسی وجہ سے گھر والے رد کر دیتے اور جو گھر والے پسند کرتے اسے یہ کوئی نہ کوئی عذر رکھ کر منع کر دیتے۔ ابھی اتفاق رائے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تھی کہ یہ ایک رشتے پر اڑ گئے گھر والے حسب معمول نہیں مانے تو درمیانی صورت یہ نکالی گئی کہ استخارہ کیا جائے۔ مولوی صاحب سے ملے تو انہوں نے کہا کہ سب سے بہتر استخارہ وہ ہوتا ہے جو خود کیا جائے۔ انہوں نے طریقہ بتایا اور سمجھایا کہ خواب میں کوئی اشارہ سا ہوگا جس سے نتیجہ نکالا جائے گا کہ رشتہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ بہرحال اگر سمجھ میں نہ آئے تو مجھے بتانا اور اگر پہلی رات کچھ نظر نہ آئے تو دو دن مزید یہی عمل دہرانا۔ رات کو انہوں نے نیا بستر نکلوایا، وضو کر کے استخارہ کے نفل پڑھے اور لیٹ گئے۔ صبح ہم نے پوچھا کہ کچھ نظر آیا تو بولے کہ میں تو اس ڈر سے کہ پتا نہیں کیا نظر آ جائے ساری رات سو ہی نہیں سکا۔ میں اپنی ضد چھوڑتا ہوں یہ استخارہ میرے بس کا نہیں۔

ان کے کھانے کی رفتار بھی بولنے سے کسی طرح کم نہیں جتنی دیر میں ہم دو لقمے لیتے ہیں یہ دو روٹیاں لپیٹ چکے ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کی کوئی بھی محفل ہو وہاں کچے دھاگے سے بندھے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

دراصل ان کی پوری ایک ٹیم ہے جو آس پاس بلکہ دور دور ہونے والی کسی بھی محفل کی سن گن رکھتے ہیں اور وہاں اس وقت دھاوا بولتے ہیں۔ جب اختتامی دعا ہو رہی ہو اس سلسلے میں ان کو وقت کا تجربہ اور اندازہ اچھی طرح ہو چکا ہے پھر بھی اگر بھول چوک سے کسی دن دعا سے پہلے پہنچ جائیں تو مجال ہے کہ مولوی یا نعت خواں کو سنیں گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہتے ہیں اور دعا شروع ہوتے ہی پہنچ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مولویوں کی اتنی تقریریں سن چکے ہیں کہ سارے مسائل کا پتا چل گیا ہے۔ اب بے شک کوئی ہم سے سن لے بار بار مولویوں کی وہی باتیں سن کر بور ہونے کا کیا فائدہ حالاں کہ جب بار بار کھا سکتے ہیں تو بار بار سن کیوں نہیں سکتے۔

اگر ان کو کوئی شادی پر بلائے تو نہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن حیران نہ ہوں، شادیاں اٹینڈ کرنے کا بھی ان کا اپنا ہی طریقہ ہے۔ ایک دن پہلے ہی کھانا پینا بند کر دیتے ہیں اور شادی میں اتنا کھا لیتے ہیں کہ ایک دن بعد بھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یوں پانچ سو دے کر کم از کم ایک ہزار کا کھانا کھا کر آتے ہیں۔ ان کا سر بہت بڑا ہے اور اس حساب سے دماغ بھی لیکن مجال ہے جو کبھی اسے استعمال کرنے کی زحمت کی ہو۔ اس کی جگہ بھی زبان اور ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔ مشکل کام کو آسانی سے کر لیتے ہیں لیکن اسے آسان طریقے سے کرنے کو سستی و کاہلی کی علامت سمجھتے ہیں مشکل کام کو اتنے مشکل طریقے سے کرتے ہیں کہ اس سے مشکل انداز میں کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ مجھے اس طرح کام کرنا پسند ہے کیونکہ یہی مردانگی ہے، عورتوں کی طرح شارٹ کٹ تلاش کرنا مجھے پسند نہیں۔

یہ کبوتر بازی بھی کرتے ہیں، اس دوران ایک

مرتبہ ان کے وزن سے کمزور چھت گر گئی، گرے یہ بھی لیکن بچ گئے، دوسری بار خود چھت سے گر گئے۔ لوگوں کو یہی بتایا کہ میرا دھیان کبوتر کی طرف تھا مگر اصل بات کچھ اور تھی اور اس لئے حادثات کے باوجود باز نہیں آتے کہتے ہیں۔ کبوتر بازی کے نام پر پورے محلے کی مانیٹرنگ کرتا ہوں اور چھت پر کپڑے یا بال سکھانے آنے والی مسمات کا دیدار مفت میں ہوتا ہے اور جہاں سے گرین سگنل ملے ان کی چھت پر بھی کبوتر کے بہانے جایا جا سکتا ہے۔ ایسے تو نہیں گرمیوں کی شکر دوپہر میں دھوپ میں ڈیوٹی دی جاتی۔ قدیم کبوتروں کی طرح انہوں نے ایک دو کبوتروں کو پیغام رسانی کی تربیت بھی اسی لئے دے رکھی ہے۔

لفٹ بازی بھی ان کا شوق ہے لیکن یہ لفٹ لیتے نہیں دیتے ہیں۔ ویسے تو لفٹ لینا دینا دونوں ہی رسکی کام ہیں کہ کسی نہ کسی طرف سے واردات کا خطرہ ہو سکتا ہے لیکن یہ عموماً ایسے اوقات میں گاڑی یا بائیک لے کے نکلتے ہیں۔ جب عموماً گاڑی ملنا مشکل ہوتی ہے اور رستے میں اگر کوئی خاتون پریشان کھڑی ہو تو اسے جذبۂ خدمتِ خلق کے تحت لفٹ آفر کر دیتے ہیں جو عموماً قبول کر لی جاتی ہے مگر مجال ہے کہ ان کی اس انسانی ہمدردی کا شکار کوئی بوڑھا، بڈھیا، بچہ یا مرد ہو۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک لڑکے نے دوپٹہ اور نقاب اوڑھ کر ان سے لفٹ لی اور پروگرام کے مطابق آگے جا کر رکوائی جہاں پہلے سے موجود ایک گروپ نے ان کی طبیعت لاتوں مکوں تھپڑوں اور جوتوں سے صاف کی بعد میں معلوم ہوا کہ اس لڑکے کے خاندان کی کسی لڑکی کو انہوں نے لفٹ دی تھی اور ان کو خاصے رومانی انداز میں چپک کر بیٹھے ہوئے کسی نے دیکھ کر اس لڑکے کو خبر کر دی تھی حالانکہ اس کی وجہ سردی بھی ہو سکتی تھی۔

بچوں اور بڑوں کے معروف ادیب
خادم حسین مجاہد
کی طلبہ کے لیے وطن کی محبت سے بھرپور
کہانیوں پر مشتمل کتاب
حُرمتِ وطن
قیمت 70 روپے صفحات 92
شائع ہو گئی ہے
ملنے کا پتہ ادارہ مطبوعات طلبہ
اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور
042-7553991

انتخاب

حاصل مطالعہ

جس پیشے سے تمہیں محبت ہو اسے اختیار کرتے ہوئے خوشی کا بے بہا خزانہ میسر آتا ہے لیکن جو پیشہ پسند نہ ہو اس میں آمدنی چاہے زیادہ ہو تو اس صورت حال میں روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ خوشی بھی خریدنا پڑتی ہے اور تم جانتے ہو خوشی کتنی مہنگی ہے۔

☆ محمد سعید اعوان

کسی دانشور کا کہنا ہے کہ بجائے اس کے کہ میں سینکڑوں کتابیں پڑھوں، اس سے بہتر ہے کہ مجھے کسی صاحب علم کی چند لمحوں کی رفاقت نصیب ہو جائے۔ میرا ایک طویل عرصہ لائبریری کی کتابوں کی خاک میں صرف ہوا۔ جو گوہر نایاب حاصل ہوئے اس کے کچھ حصے اپنی ڈائری سے "حکایت" کے قارئین کی نذر ہیں۔

انسانیت

دور حاضر کے وہ پاپ سنگرز جنہیں علماء کرام طوائفوں اور کنجروں میں شمار کرتے ہیں، آج وہی ہیں جنہوں نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے افریقہ کے حق میں مؤثر ترین آواز اٹھائی ہے جو مسلمانوں کو اٹھانی چاہئے تھی۔

1985ء میں ایک پاپ سنگر باب گیڈاف اور اس کے دو ساتھیوں Bono اور رچرڈ کرٹس نے راک کنسرٹ منعقد کر کے بارہ سو کروڑ جمع کئے تھے اور افریقہ کے قحط زدگان پر خرچ کئے تھے۔ انہی لوگوں نے 2 جولائی 2005ء کو یورپ اور امریکہ کے چیدہ چیدہ شہروں میں G8 کے مقابلے میں Live8 بنائی اور کنسرٹس کئے جن میں میڈونا، پنک فلائڈ اور پال میکارٹنی جیسے ہر دلعزیز گائیکوں نے مفت حصہ لیا۔ انہوں نے ترقی یافتہ ممالک سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ غریب ممالک کے قرضے معاف کر دیں۔ ان کی آواز رائیگاں نہیں گئی۔ یوں ورلڈ بینک نے 18 غریب ممالک کے 40 ارب ڈالر (چوبیس کھرب) کے قرضے معاف کر دیئے۔

ہمارے دور کا مشہور فلسفی برٹینڈ رسل خدا کو نہیں مانتا تھا لیکن اس نے انسان اور انسان کے درمیان امن کے لئے جو طویل اور بھرپور جدوجہد کی اس کی بناء پر وہ ان لوگوں سے یقیناً زیادہ قابل قدر ہے جنہوں نے خدا کے نام پر خدا کی بے گناہ مخلوق کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا۔

گاندھی کی شرائط

گاندھی نے مرن برت (بھوک ہڑتال) توڑنے کی جو شرطیں لکھوائیں وہ یہ تھیں:

(i) ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملے کرنا فوراً بند کر دیں اور انہیں یقین دلائیں کہ آئندہ وہ سب بھائیوں کی طرح ساتھ رہیں گے۔

(ii) ہندو اور سکھ ہر طرح اس بات کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان بھی جان و مال کے ڈر سے ہندوستان نہ

چھوڑے۔

(iii) چلتی گاڑیوں پر مسلمانوں پر جو حملے کئے جا رہے ہیں وہ فوراً بند کئے جائیں اور ان ہندوؤں اور سکھوں کو جو اس طرح کے حملوں میں شرکت کر رہے ہیں روکا جائے۔

(iv) جو مسلمان نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ اور ناصر الدین چراغ دہلویؒ جیسی درگاہوں کے آس پاس رہتے تھے اور مصیبت کی وجہ سے اپنے مکانات چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلے گئے ہیں انہیں واپس لا کر ان مکانوں میں پھر آباد کیا جائے۔

(v) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا تھا حکومت اس کی مرمت کروا سکتی تھی لیکن گاندھی کو اصرار تھا کہ ہندو سکھ اس کی مرمت اپنے گناہ کا کفارہ سمجھ کر خود کروائیں۔ (انڈیا ونز فریڈم)

خیال اپنا اپنا

ہالینڈ میں دوران سیاحت ایک ہپی خاتون کہنے لگی۔ ''محبت بذات خود ایک مذہب ہے۔ سارے مذاہب کے لوگ لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو مارتے ہیں لیکن ہپی صلح اور پیار میں یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا کسی بات پر جھگڑا نہیں ہوتا۔ دولت، عورت اور زمین اس دنیا میں فساد کی جڑ ہے۔ ہپی ان تمام خرافات سے بچے ہوئے ہیں۔ دولت کو ہم منہ نہیں لگاتے، زمین اور جائداد ہمارے پاس نہیں ہے۔ رہ گئی عورت تو اس کے لئے کوئی جھگڑا نہیں کرتا۔ جس کے ساتھ جی کرتا ہے وہ رہتی ہے، جب چاہتی ہے الگ ہو جاتی ہے۔ وہ کسی قانون اور معاہدے کی پابند نہیں ہوتی۔ اگر چاہے تو بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اس کا ساتھی بھی اس بات پر جھگڑا نہیں کرتا۔ اب بتائیں اس سے اچھا مذہب کون سا ہے؟

اگر یہ لوگ اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ کر لیں تو ان کو معلوم ہو کہ اچھا مذہب کیسا ہوتا ہے۔ اسلام سلامتی کا مذہب ہے۔

وہ آنکھیں سکیڑ کے کہنے لگی کہ ہم لوگ صرف اور صرف محبت پر یقین رکھتے ہیں، فائدہ یا نقصان کاروباری لوگ سوچتے ہیں۔ دنیا کو فیکٹریوں، ایجادات اور بزنس کی ضرورت نہیں بلکہ صرف محبت کی ضرورت ہے آخر ہزاروں سال پہلے بھی تو یہ چیزیں نہیں تھیں۔

ہالینڈ میں ہی مسٹر گروٹر بولا۔ ''آپ پاکستانی عجیب سیاح ہیں۔ نہ ڈرنک کرتے ہیں، نہ سگریٹ پیتے ہیں، نہ جوا کھیلتے ہیں، نہ نائٹ کلب جا کر ناچتے ہیں اور نہ ہی لڑکیوں سے دل بہلاتے ہیں۔ آخر ایسی سیاحت کا کیا فائدہ؟''

ایک انگریز اور قرآن

علامہ مشرقی لکھتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کو جب میں نے سورۃ فاطر کی آیت نمبر 27 اور 28 پڑھ کر سنائیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں'' وغیرہ.....

آیتوں کا ترجمہ سنتے ہی سر جیمز بولے۔ ''اوہ! کیا کہا..... اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں..... حیرت انگیز بہت عجیب..... یہ بات مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی۔ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے۔ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان پڑھ تھے، انہیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی... یقیناً اللہ نے بتائی تھی..... بہت خوب، بہت عجیب!

علماء کو ہدایت

علماء کا موجودہ انداز وعظ ازبس ناقص ہے۔ موضوع کوئی ہوتا نہیں اور واعظ کی تمام تر توجہ سُریں نکالنے، لطائف چھوڑنے، آیات کا ترجمہ گا کر سنانے، کسی کی پگڑی اچھالنے اور غلط روایات سے سامعین کو خوش کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ میں نے کتنے ہی ایسے وعظ سنے، جہاں واعظ کا انداز دلکش اور بعض نکات بڑے کام کے تھے لیکن آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ موضوع کیا تھا۔ تقاریر کی اس بے ربطی، طوالت اور لامقصدی کو جدید ذہن گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے علماء کو چاہئے کہ وہ نئے مذہبی ادب کو پڑھیں۔ مختلف افکار و تحریکات کا مطالعہ کریں اور تمام مسائل پر قرآن کا نقطہ نگاہ پیش کریں۔ بس یہی ایک صورت ہے [illegible] کو ہدایت و قیادت کا منصب دوبارہ دلا سکتی ہے۔

(ماخوذ: "اسلام اور عصر رواں")

گناہ کی پاداش

دنیا کے تمام دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ دکھ خواہ وہ دماغی ہو یا جسمانی، گناہ کی پاداش ہے۔ بعض دکھ ایسے بھی ہیں جنہیں بعض لوگ اعلیٰ مقصد کے لئے خرید لیتے ہیں مثلاً امام حسینؓ کی شہادت، امام احمد بن حنبلؒ کی قید و بند، اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کا جہاد، آزادئ ہند کی جنگ میں ہزاروں نفوس کو موت وغیرہ وغیرہ۔

یہ لوگ ایک خاص قسم کا دل و دماغ لے کر دنیا میں آتے ہیں یا اس قدر حساس ہوتے ہیں کہ دوسروں کا دکھ یا کسی اصول کی پامالی دیکھ کر سخت مضطرب ہو جاتے ہیں یہ لوگ، جھومتے اور ناچتے ہوئے مقتل کی طرف بڑھتے ہیں۔

انتخاب

جارج برنارڈ شا سے عمر کے آخری حصے میں ایک صحافی نے پوچھا۔ "شا! تم مرنے کے بعد پھر زندگی ملے تو کیا بننا پسند کرو گے اور کون بننا چاہو گے"۔

شا نے کہا۔ "میں ایسا جارج برنارڈ شا بننا چاہوں گا جیسا اسے ہونا چاہئے تھا، ایسا نہیں جو ہو کر گزر گیا"۔

احساسِ زیاں

ایک بات میری روح پر ضرور بوجھ ڈالتی ہے جب میں کہیں پانی کا کوئی فضول کھلا ہوا نل یا کوئی بجلی کا بلب بلا ضرورت جلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے دل سے یہ آواز آتی ہے کہ اگر یہ نل یا بلب بلاوجہ چل رہا ہے تو ملک میں یہ کسی نہ کسی کا حق تھا جو اس سے محروم ہو رہا ہے۔ (اشفاق احمد)

آرزو

میرے دل میں جنت کی آرزو کبھی نہیں پیدا ہوئی۔ اگر اللہ جنت عطا فرما دے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کی آرزو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ دوزخ کا ڈر شدت سے محسوس کرتا ہوں لیکن دوزخ سے بچنے کے لئے ثواب کمانے کی آرزو نہیں رکھتا۔ مجھے اس آرزو سے دکانداری کی بُو آتی ہے۔ مجھے صرف ایک آرزو ہے کہ میرا رخ مثبت رہے، انسان کی طرف اللہ کی طرف۔

(ممتاز مفتی "لبیک")

سکون کی قیمت

ہمارا ایک ساتھی اچھی خاصی تنخواہ والی نوکری چھوڑ کر پرانی کم تنخواہ والی پر آ گیا ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ جس پیشے سے تمہیں محبت ہو اسے اختیار کرتے ہوئے خوشی کا بے بہا خزانہ میسر آتا ہے لیکن جو پیشہ پسند نہ ہو اس میں آمدنی چاہے زیادہ ہو تو اس صورت حال میں روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ خوشی بھی خریدنا پڑتی ہے اور تم جانتے ہو خوشی کتنی مہنگی ہے۔

آثار قدیمہ

یہ قلعہ پاکستان کے بیس خطرناک اور پُراسرار مقامات میں شمار ہوتا ہے اس کے بارے میں لوگوں میں یقین پایا جاتا ہے کہ اس قلعے میں کسی رانی کی روح نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگ اس کو دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگرچہ راوی اس بات پر یقین نہیں رکھتا مگر قلعے کی پُراسراریت اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قلعہ اپنے دامن میں بہت سے خطر چھپائے ہوئے ہے۔

قلعہ شیخوپورہ

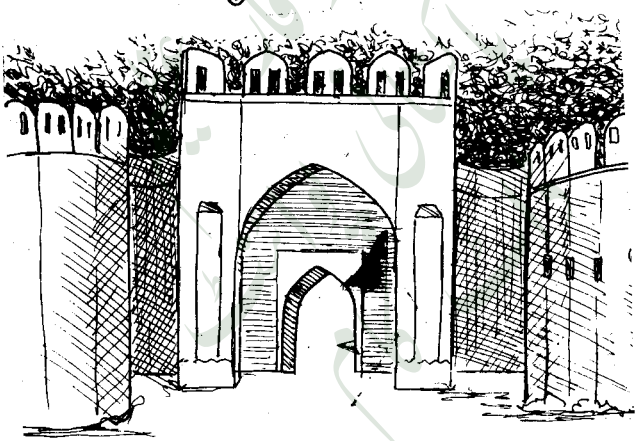

☆ حامد رضا قادری
0308-4192456

1982ء میں پہلی بار میں اس قلعے میں آیا تھا، اس وقت اس قلعے کی حالت بہت زیادہ خستہ تھی۔ آج تقریباً 35 برس بعد ایک مرتبہ پھر میں اس کے مرکزی دروازے کے سامنے موجود ہوں۔ اس کی بیرونی فصیلوں کی موٹائی 5 فٹ اور بلندی تقریباً 60 فٹ ہے۔ مشرقی اور مغربی فصیلیں شمالاً جنوباً تقریباً 380 فٹ اور شمالی اور جنوبی فصیلیں مشرق سے مغرب تقریباً ساڑھے چار فٹ ہیں۔ اس قلعے کے اندر دو گہرے کنویں موجود ہیں۔ ایک مغربی دیوار کے ساتھ اور دوسرا مرکزی دروازے کے پیچھے جنوبی دیوار کے ساتھ ان کنوؤں کا پانی قلعے میں رہنے والے استعمال میں لاتے تھے۔ تیسرا کنواں مرکزی دروازے کے سامنے قلعے کے باہر ہے جسے اب بند کر دیا گیا ہے اس کا پانی آبپاشی میں استعمال ہوتا تھا۔

چار سو سال سے یہ فصیلیں کسی دیو کی طرح سر اٹھائے کھڑی گئے دنوں کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ کبھی یہاں عام آدمی قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتا ہو گا۔ مگر آج لوگ اس کے پاس سے پیدل، موٹر سائیکلوں پر، رکشوں پر، گاڑیوں پر اس پر توجہ دیئے بغیر گزرتے چلے جاتے ہیں۔

چار سو سال پہلے یہ قلعہ اس شہنشاہ وقت نے تعمیر کرایا تھا جس کے محل کے دروازے پر ہر وقت ایک زنجیر عدل لٹکی رہتی تھی۔ جس کا عدل تاریخ میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا مگر آج یہ قلعہ حسرت اور بے بسی کی تصویر بنا جس زبوں حالی کا شکار ہے اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔

مانا جاتا ہے کہ 1607ء میں یہ قلعہ شہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس بات پر کچھ لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قلعہ شہنشاہ اکبر نے 1500ء کے لگ بھگ اپنے بیٹے جہانگیر کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں سامان رسد اور فوج ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تعمیر یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہ ہندوستان پر درہ خیبر کے راستے آنے والے حملہ آوروں پر اور قافلوں پر نظر رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ایک طرح سے اس کی حیثیت ایک چوکی کی سی تھی۔ زیادہ تر مؤرخین اس بات پر ہی متفق ہیں کہ اسے جہانگیر نے ہی 1607ء میں تعمیر کرایا تھا۔

کبھی یہ ایک خوبصورت اور بارونق قلعہ رہا ہو گا لیکن آج یہ کسی بیوہ کے دل کی طرح ویران اور اجڑا پڑا کسی آسیب زدہ کھنڈر کا منظر پیش کر رہا ہے اور زبان حال سے اپنی بے قدری پر نوحہ کناں ہے۔ اگرچہ اس کا یہ حال گردش ایام کا نتیجہ ہے مگر اس میں محکمہ آثار قدیمہ کی غفلت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

تغیرات زمانہ اور حکومت کی عدم توجہی اور بے حسی کے باعث اس کے کئی حصے ٹوٹ کر گر چکے ہیں جس سے کئی لوگ ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ 1964ء میں حکومت نے اس قلعے کو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا مگر محکمہ کی مسلسل لاپروائی اور غفلت کی وجہ سے یہ قلعہ ایک پُراسرار ویرانے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کی سینکڑوں کنال اراضی پر لوگوں نے محکمہ آثار قدیمہ اور محکمہ مال کی ملی بھگت سے قبضہ کر لیا ہے۔ قلعے کی اراضی پر ایک قبرستان بھی وجود میں آ چکا ہے اور دیگر املاک پر لوگوں نے ناجائز تجاوزات تعمیر کر رکھی ہیں۔ لوگ قلعے کے اندر سے اخروٹ کی لکڑی کے بیش قیمت دروازے اور کھڑکیاں تک اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔

اس دور میں قلعہ کے اردگرد سینکڑوں ایکڑ زمین جن پر باغات اور لہلہاتی کھیتیاں تھیں جن کو سیراب کرنے کے لئے کنویں موجود تھے۔ ان کھیتوں سے حاصل ہونے والا اناج اور باغات سے حاصل ہونے

والے پھل سے قلعے میں رہنے والے افراد کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ آج ان پھلدار باغات کا کہیں نام و نشان بھی باقی نہیں۔ کنویں خشک ہو چکے ہیں، کھیتیاں اجڑ چکی ہیں اور ان کی جگہ گنجان آبادی نے لے لی ہے۔

مغلیہ دور میں جہاں اس قلعہ میں اناج، سامانِ حرب وضرب رکھا جاتا تھا وہیں قلعے کے تہہ خانوں میں فوج اور رسد ہر وقت موجود رہتی تھی۔ مشہور ہے کہ لاہور کے قلعے پر حملے کی صورت میں شاہی خاندان کے افراد اسی قلعے میں پناہ لیتے تھے۔ خیال ہے کہ لاہور کے قلعے کے محاصرے میں آ جانے کی صورت میں اسی قلعے سے رسد اور کمک بھیجی جاتی ہوگی۔

اس کے زنداں میں جنگی قیدی، ریاستی مفرور اور حکومت کے باغیوں کو ڈال دیا جاتا تھا۔ زنداں کی آدھی عمارت زمین بوس ہو چکی ہے جبکہ آدھی عمارت اور بہت سی کوٹھریاں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہیں۔ زنداں کے نیچے جانے والے راستے اوپر والی عمارت کے گرنے سے بند ہو چکے ہیں۔

مختلف ادوار میں یہ قلعہ مختلف لوگوں کے زیرِ تسلط رہا۔ سکھوں نے اس پر تسلط قائم کیا۔ انگریزوں کے بھی زیرِ نگیں آیا۔ ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں اس میں رد و بدل کی۔ سب سے زیادہ اس کی خوبصورتی کو سکھوں نے نقصان پہنچایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ تاریخی عمارات کو لوٹ مار کر کے جتنا نقصان سکھ قوم نے پہنچایا کسی دوسری قوم نے نہیں پہنچایا۔ اس قلعے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سکھوں نے اس قلعے میں مغلیہ عمارتیں گرا کر اس پر سکھ حویلیوں کی بنیاد رکھی پھر بھی اس کے اندر مغلیہ دور کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اس میں بالاخانے ہیں۔ میٹنگ رومز ہیں جہاں اردگرد کے راجوں مہاراجوں کی مشاورتیں ہوتی تھیں۔ پلان بنتے تھے۔ ضیافت خانے ہیں جہاں آنے والے مہمانوں کے اعزاز میں ضیافتیں دی جاتی تھیں۔ خواب گاہیں موجود ہیں۔ مہارانی جنداں نے اپنی زندگی کے بہت سے ایام اس خواب گاہ میں گزارے تھے۔

جگہ جگہ دالان ہیں، لان ہیں جہاں راگ رنگ کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ کبوتر خانے اور شاہی اصطبل کے آثار موجود ہیں۔ ملازمین کی رہائش گاہوں کے کھنڈر ہی باقی بچے ہیں۔ شاہی باورچی خانے کی چمنیاں گر چکی ہیں۔ اندھیری غلام گردشیں اور پُراسرار سرنگیں آج بھی موجود ہیں۔ اندرونی دیواروں پر مغلیہ آرٹ کی درجنوں تصویریں اور نقش و نگار آج بھی کندہ ہیں اگرچہ یہاں آنے والے باذوق لوگوں نے ان پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر ان کو داغ دار کر دیا ہے۔ پھر بھی مغل آرٹ کے یہ فن پارے چار صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ماہ و سال کی ستم ظریفیاں بھی اس کے حُسن کو گہنا نہ سکیں۔ یقیناً کبھی یہ ایک مضبوط اور دیدہ زیب قلعہ رہا ہوگا۔ کبھی ان صدیوں سے ویران اور سنسان پڑی خوابگاہوں میں، ان اندھیری غلام گردشوں میں باادب، باملاحظہ، نگاہ رُوبرو، ہوشیار کی صدائیں بلند ہوتی ہوں گی لیکن آج ان سوئی پڑی خوابگاہوں کی فضاؤں میں ان ویران کمروں اور ان پُراسرار غلام گردشوں کی فضاؤں میں چمگادڑوں کی چیخوں اور اُلوؤں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹوں کی منحوس آوازیں بھٹک بھٹک کر ان کی سنگی دیواروں سے سر ٹکرا کر دم توڑ جاتی ہیں۔

اس قلعے کے اندر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رانی، مہارانی جنداں نے زندگی کے کئی شب و روز گزارے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ مہارانی جنداں جس کا اصل نام جند کور تھا، نے جو شب و روز یہاں گزارے وہ ایک قسم

کی نظر بندی تھی کیونکہ مہاراجا رنجیت سنگھ کی عدالت سے ایک فیصلہ مہارانی جنداں کے خلاف آیا تھا۔ اس وقت تک جندکور مہارانی نہیں بنی تھی۔ رنجیت سنگھ کی پہلی شادی 16 سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ جندکور اس کی دوسری بیوی تھی اور رنجیت سنگھ کی بیوی بننے سے پہلے وہ رنجیت سنگھ کے دربار میں نرتکی تھی۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی۔ گھنے سیاہ بالوں اور موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی جندکور رنجیت سنگھ کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ مگر جندکور نے رنجیت سنگھ کو پلے نہ باندھا بعد میں اس نے رنجیت سنگھ سے شادی کر لی اور ہندوستان کی مہارانی بنی اور مہارانی جنداں کے نام سے مشہور ہوئی۔ مہارانی جنداں پنجاب کی آخری مہارانی تھی۔ لاہور کے شاہی قلعے میں سکھوں کے دور کی بہت سی نوادرات موجود ہیں۔

اس قلعے کے اندر مغربی فصیل کے ساتھ ایک ولی اللہ "رتی شاہ دیوان" المعروف شرف الدین الرزاقی کا مزار بھی موجود ہے۔ اس قلعے میں جب سکھ حویلیاں تعمیر ہو رہی تھیں تو یہ ولی اللہ اس کی تعمیر میں بطور مزدور مزدوری کرتے تھے پھر ان کی ایک کرامت ظاہر ہو گئی (میں یہاں اس کرامت کا ذکر نہیں کر رہا) تب لوگوں کو ان کے ولی اللہ ہونے کا پتہ چلا تو انہیں مزدوری کرنے سے روک دیا گیا اور ان کے حلقے میں باعزت رہنے کا انتظام کر دیا گیا اور لوگ ان سے فیضیاب ہونے لگے۔ بعد میں ان کے وصال پر انہیں اسی قلعے میں دفن کیا گیا، ان کا مزار آج بھی قلعے میں موجود ہے۔ اس قلعے میں مغلیہ بلڈنگ کے سامنے ایک مسجد بھی موجود ہے جس کے اب صرف آثار ہی باقی بچے ہیں۔

کسی حد تک اس قلعے کی مرمت کا کام کیا گیا ہے مگر اتنا کافی نہیں۔ ابھی بھی اس کے اندھیرے کمروں میں سینکڑوں چونے کے بورے پڑے پڑے خراب ہو رہے ہیں جو اس قلعے کی مرمت کے لئے لائے گئے تھے مگر وہی محکمے کی لاپروائی اور غفلت۔ یہ چونا بھی کسی استعمال میں آئے بغیر یونہی پڑے پڑے خراب ہو جائے گا۔ اگرچہ کسی حد تک اس کی مرمت کا کام کیا گیا ہے مگر اتنا کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قلعے کی مرمت وسیع پیمانے پر کرائی جائے اور اسے عوام الناس کے لئے کھولا جائے۔ یہ ایک بڑا ذریعہ آمدن بن سکتا ہے۔ بہت سے افراد کو روزگار میسر آئے گا۔ اسے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کیا جائے ورنہ حکومت کی غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے کچھ عرصے بعد یہ قلعہ صرف تصویروں میں ہی رہ جائے گا۔

یہ قلعہ پاکستان کے بیس خطرناک اور پُراسرار مقامات میں شمار ہوتا ہے اس کے بارے میں ایک بات بہت مشہور ہے۔ لوگوں میں یقین پایا جاتا ہے کہ اس قلعے میں کسی رانی کی روح نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگ اس کو دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگرچہ راوی اس بات پر یقین نہیں رکھتا مگر قلعے کی پُراسراریت اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قلعہ اپنے دامن میں بہت سے خطر چھپائے ہوئے ہے۔ لہٰذا عوام الناس سے گزارش ہے کہ اس کے مخدوش حصوں میں نہ جائیں اور نگران کو بتائے بغیر پُراسرار راستوں پر جانے سے احتیاط کریں۔

یہ قلعہ پاکستان کے تاریخی شہر شیخوپورہ میں واقع ہے جہاں ایک تاریخی یادگار "ہرن مینار" بھی موجود ہے۔ اس قلعے کو قلعہ شیخوپورہ کہا جاتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اب یہ قلعہ عین آبادی کے اندر آ گیا ہے۔

❁❁❁

خطوط و ای میل

اظہارِ خیال

یہ کالم قارئین کے خطوط اور آراء سے ترتیب دیا جاتا ہے اور ایڈیٹر کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اب قارئین اپنی آراء بذریعہ SMS بھی بھجوا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

افسوس آپ نے یہ ریکارڈ بھی نہ بننے دیا

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! اگست کا پرچہ لیٹ ہونے کا رونا کیا رویا تھا ستمبر میں تو حد ہی ہو گئی، 25 کو آخر مل گیا۔ ایک خیال تھا کہ شاید بیس بیس سال کے وقفہ کی ہیٹرک ہو جائے لیکن یہ بھی نہ ہوا۔ وہ اس طرح کہ عنایت اللہ مرحوم کے زمانے میں ستمبر اکتوبر 1977ء کا پرچہ اکٹھا آیا تھا۔ پھر بیس سال بعد ستمبر اکتوبر 1997ء کا بھی شمارہ اکٹھا نکلا۔ اب بھی خیال تھا کہ ستمبر اکتوبر کا پرچہ اکٹھا آئے گا۔ افسوس آپ نے یہ ریکارڈ بھی نہ بننے دیا۔

سالگرہ نمبر اچھا سیٹ کیا ہوا پرچہ ہے۔ ''ستاروں بھری رات'' سالگرہ میں اتنے کم صفحات اس سے تو بہتر تھا کہ یہ قسط روک کر کوئی اور کہانی دے دیتے۔ منظر کشی اپنی جگہ، پرندے ہمارے ماحول اور قدرت کا شاہکار حسن ہیں اس میں کوئی شک نہیں۔ پھر حلال پرندوں

کے شکار پر اعتراض کیا؟ کیا ہمارا مذہب اسلام ناچ گانے اور رقص کی اجازت دیتا ہے؟

"میں اور میرا تخلیقی عمل" محترم دستگیر شہزاد صاحب نے اپنے تخلیقی عمل کا تعارف تو مکمل کر کروایا، اپنا تعارف بھی شامل کرتے تو اور اچھا ہوتا مثلاً تعلیم، رہن سہن وغیرہ۔

کون کہتا ہے یہ ادیب، ناول نگار، ایڈیٹر شاعر، مزاح نگار نہیں بن سکتے میں کہتا ہوں یہ آل راؤنڈر ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب! باقی پرچہ جوں کا توں پڑا ہوا ہے، تو پھر اس پر تبصرہ کیسا۔ قارئین! ادارہ "حکایت" کے خلاف مال روڈ پر دھرنا دینے سے تو رہے۔ قصور آپ کا بھی نہیں ہے، ستمبر میں قارئین جس ذہنی پریشانی سے گزرے، بچے آپ بھی نہ ہوں گے۔

—— محمد صدیق۔ جنڈ والہ، چونیاں

نقطۂ توحید

عزیزم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! کئی سالوں سے اپنے ضلع کی ثقافتی تاریخ مرتب کر رہا ہوں اس لئے "حکایت" کا مطالعہ کرنے کے بعد فوری طور پر چاہتے ہوئے بھی آپ کو یاد کرنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ شمارہ اگست میں "کہنے کی بات" کے حوالے سے جالب کا یہ شعر حکمرانوں پر کس قدر صادق آتا ہے؟

تم سے پہلے وہ جو "اک شخص" یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

آپ نے پاکستانی وزرائے اعظم کے انجام کی فہرست پیش کر کے قوم کو آئینہ اور طالب علموں کو معلومات بہم پہنچائی ہیں لیکن پہلے وزیر اعظم کے قتل پر پڑا ہوا پردہ ابھی تک نہیں اٹھ سکا۔ لیاقت علی خاں کو سید اکبر نامی شخص نے گولی ماری لیکن اُسے کس نے فوراً گولی مار دی؟

ایم اے جاوید صاحب نے انگلینڈ سے لکھا ہے کہ کب تک مسلمان مافوق الفطرت طاقتوں کو مانتے رہیں گے؟ جناب! اس وقت تک جب تک جہالت عام ہے اور مسلمان قرآن کا راستہ نہیں اپناتے۔ خصوصاً نقطۂ توحید کی سچی تعبیر سے واقف نہیں ہوتے۔ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

بیان میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

میرے خیال میں سعودی عرب میں ماسوا روضۂ فخرالرسلؐ کے کسی جگہ کوئی مزار نہیں ہے۔ سنا ہے یورپ میں بھی ایسے سلسلے نہیں ہیں جیسے ہمارے ہاں ہیں۔ خدا جانے وہاں بغیر پیروں فقیروں کے ان کی زندگیاں کیسے بسر ہو رہی ہیں؟

"حکایت" ستمبر سالگرہ کے بارے میں عرض ہے کہ "دوزخ" اور "عشق خانہ خراب" نہایت عبرت آموز اور سبق آموز کہانیاں ہیں۔ محترم سکندر خان بلوچ کا "سولجرنامہ" ہلکے ہلکے مزاح سے پُر معیاری سفرنامہ ہے۔ عزیزم شعار کا سفرنامہ "دیارِ حرم کو چلے" خاصا معلوماتی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

"قصہ غیرت کا" میں ایک خاص نقطہ قابل توجہ ہے کہ پیر صاحبان بے اولاد عورتوں پر کیوں دم تعویذ کرتے ہیں، مردوں پر کیوں نہیں؟

محترم محمد افضل رحمانی باکمال شخص ہیں، انہوں نے میرے چند جملے دوبارہ "حکایت" کی زینت بنا کر عزت افزائی کی ہے۔ شکریہ!

ان شاء اللہ، علامہ اقبالؒ نے دھوکا باز پیروں کا جس طرح پردہ چاک کیا ہے اسے مزید آگے بڑھاؤں گا۔ علامہ اقبالؒ کی ایسے لوگوں پر خاص نظر رہی ہے۔ پچھلے شماروں میں دو لفظوں کی املا کی اصلاح بھی کر

دوں۔

ادائیگی کے بجائے ادائی اور مطلع نظر کے بجائے مطمح نظر درست الفاظ و ترکیب ہیں۔ سب کو دعا والسلام!

❁ ——— پروفیسر فلک شیر لیل۔ بھکر

سالگرہ نمبر..... مزہ نہیں آیا

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ جون 2017ء سے آپ کے پرچے کا معیار گر چکا ہے، اسے سنبھالئے۔ خاص کر ستمبر 17ء کا سالگرہ نمبر تو معیار سے بہت کم تھا۔ دستگیر شہزاد صاحب کی کہانی ''آزادی'' پڑھ پڑھ کر ''چھاوا'' ہو گیا ہوں۔ کہانی دلچسپ معلوم ہوتی ہے مگر سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہی کہانی دستگیر صاحب دوبارہ لکھیں، روسی ناول نگاروں کی طرح کریکٹر اور ان کے بیک گراؤنڈ کا تعارف کرائیں۔ یہ بھجن سنگھ، چاچا فضل، دل شیر خاں کون تھے، کون پاکستان آیا تھا، کون جا رہا تھا، اکبر سنگھ اور اکبر علی دونوں رولا ہے۔

ایک حقیقت ایک افسانہ کیا ہے۔ حقیقت افسانہ نہیں ہو سکتی، افسانہ حقیقت نہیں ہوتا خواہ مخواہ قاری کو پریشان کرنے والی بات ہے۔ والسلام!

❁ ——— سید اسد اللہ

دیارِ حرم اور روحانی کیفیت

محترم ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! ستمبر کا شمارہ سالگرہ نمبر سرورق پر لکھا اچھا لگا۔ ماشاء اللہ ''حکایت'' 48 برس کا ہو گیا ہے۔ اللہ اسے مزید کامرانیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

''یہ ہے امریکہ کا اصل چہرہ'' (خصوصی فیچر) ''حکایت'' کے سرورق کی زینت بنا تھا۔ اندر دیکھا پڑھا اچھا لگا۔ حقائق بالکل ایسے ہی ہیں جیسے بیان کئے گئے ہیں، تاریخی نقطۂ نظر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

جنگ ستمبر کے حوالے سے دونوں لکھاری خواتین نے خوب لکھا۔ ''مٹی کا قرض'' اور ''شہید کا شاہی جلوس'' دونوں تحریریں پسند آئیں۔ ''دیارِ حرم کو چلے'' اعجاز حسین ستھار اچھا اور دل سے لکھ رہے ہیں، روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

دستگیر شہزاد کا تعارف ''میں اور میرا تخلیقی عمل'' بہت اچھا لگا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیاد۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ ''حکایت'' کے لئے ان کی شعری اور نثری تخلیقات اعزاز کا باعث بنتی رہیں۔ آمین ثم آمین!

❁ ——— یاسمین کنول۔ پسرور

جمہوری نہیں اسلامی نظام

مکرم و محترم پاکستانی بھائیو اور بہنو! پاکستانی حکومت کے لیڈروں اور اپوزیشن کے لیڈروں کی خودغرضی اور دولت پرستی اور عوام کے ہر فرد کی غفلت و بے خبری نے ہر فرد کو زندہ لاش بنا دیا ہے۔ ہر طرف ظلم ہے جہاں ظلم ہے وہاں موت ہے، جہاں انصاف ہے وہاں زندگی ہے۔ اب ہماری حالت ایسی ہے کہ موجودہ تکلیف دہ پریشان کن صورت حال کو برقرار رکھنا بھی غیر ممکن ہو گیا ہے۔ اب تمام پاکستانیوں کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں۔ نمبر ایک انگریز کے قائم کردہ مہوری نظام پر عمل کرتے ہوئے ٹوٹ پھوٹ کر تباہی کے گڑھے میں گر جائیں۔ نمبر دو موجودہ سرمایہ داری نظام کا قلع قمع کر کے اس کی جگہ رب رحمٰن کا نازل کردہ اور پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا نافذ کردہ نظام

اسلام پر عمل پیرا ہو کر تمام بیرونی و اندرونی قرضہ جات سے نجات حاصل کریں۔ ہر دکھ درد کی دوا اسلامی نظام میں ہے لیکن قرآن حکیم کی رُو سے یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک لوگوں کے دلوں میں تبدیلی کی خواہش پیدا نہ ہو جائے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے (بخاری جلد اوّل حدیث 584) یعنی کوئی تبدیلی ایسی نہیں جس کی طاقت فقط اللہ کے پاس نہ ہو اور اللہ کا ارشاد ہے۔ ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک اس قوم کے دل و دماغ میں اس تبدیلی کی خواہش نہ پیدا ہو جائے۔

آئین پاکستان کی دفعہ 2(A) پر عمل کرتے ہوئے آئین پاکستان کی تمام شقوں کو قرآن و سنت حسنہ کے مطابق درست کرنا ضروری ہے۔ عوام نواز شریف زندہ باد، زرداری زندہ باد، یہ زندہ باد اور وہ مردہ باد میں لگی ہے۔ جمہوری نظام شیطانی نظام ہے۔ پچاس یا سو مرتبہ الیکشن کروا لو یہی بدمعاش لٹیرے لوگ اسمبلیوں میں آئیں گے۔ وہ بھی لوٹ مار اور کرپشن کے نئے عزائم اور ہتھکنڈوں کے ساتھ میں ہر پاکستانی کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آیئے! لوگوں کی غلامی سے نکلیں اور اللہ کی غلامی اختیار کریں۔ باقی سب کو چھوڑ دو قرآن سے ناطہ جوڑ لو۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

محمد طفیل طوفی (نمائندہ خصوصی)۔ کویت

سالگرہ نمبر.....ایک نظر

حیرت انگیز طور پر ٹائٹل آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا ہے۔ خوبصورت رنگ اور مناظر روح کو تازگی اور طراوٹ بخشتے ہیں۔ مار دھاڑ، جنگی مناظر اور غیر فطری ماحول جنون میں مبتلا کر دیتا ہے۔ البتہ خاص مواقع کی مناسبت سے ٹائٹل ترتیب دینے کا اہتمام ضروری ہے۔

''دیارِ حرم کو چلے'' پر قارئین کی طرف سے بڑی پذیرائی ملی ہے۔ میں خاص طور پر منظور احمد طارق، گمنام بھائی پھیرو بھیرو ضلع جھنگ، استاد رازی اور سعید اعوان ''ڈان'' اخبار کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر مدیر صاحب صلہ افزائی کی تو کہانی بھی جلد پڑھ سکیں گے۔

''دوزخ'' میں سارا کیا دھرا ہی بلقیس کا ہے۔ راشدہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح ہر اونچ سمجھائی لیکن وہ ماریہ اور روحی کے رنگ میں رنگتی گئی۔ گاؤں کے پنجرے سے نکل کر شہر اور آزاد دوستوں میں خود کو پُرسکون سمجھا اور کسی چوٹ اور بھول پر ہائے کی نہ افسوس کا اظہار کیا۔ اب شکر ادا کیجئے کہ بات چھپی رہی ہتنا ہو سکے اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگئے۔ اگر خلوص نیت سے آنسو بہا کر سجدہ ریز ہو گئیں تو بس جانئے بیڑا پار اتر جائے گا۔ ''ستاروں بھری رات'' کی سست رفتاری اور مکالمہ بازی سے بیزاری ہونے لگی ہے۔ واقعات ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں، چلتے رہنا زندگی کی روانی کی نشانی ہے۔ واقعات آگے بڑھیں گے تو قارئین کی دلچسپی بڑھے گی۔ ''عشق خانہ خراب'' میں پروین نے ماحول، رواجوں اور احکام خداوندی سے بغاوت کی اسے سنبھلنے، توبہ کرنے اور سیدھی راہ چلنے کے مواقع ملتے رہے۔ خاوند بھی فرشتہ ملا جس نے اس کے گناہ نظرانداز کر کے جنت میں جاگیر بنا لی لیکن پروین قبر انگاروں سے بھرتی رہی۔ جب رسی تنگ ہوئی، منزل کھوٹی ہو گئی اور سہارے دھوکہ دے گئے تو عقل آئی ہے۔

''ایک چاقو دو قتل'' قریبی ماحول کی کہانی لگتی ہے پھر احمد یار خان کی تفتیش اور پیش کرنے کا انداز جداگانہ

ہے وہ ''حکایت'' کا سرمایہ تھے۔ یہ کہانی پڑھ کر مائیں اپنے رویے پر غور کر لیں تو چاردیواری میں سکون کے لمحات کا دورانیہ بڑھ جائے۔ یوں کتنے حادثات وقوع پذیر ہونے سے پہلے دم توڑ دیں۔ ''الاؤ'' کے واقعات پُر پیچ ہو گئے ہیں۔ پولیس والے اپنی اصلیت پر آ گئے ہیں، موسیٰ خان انجام کو پہنچ گیا ہے، اب عبدالرحمٰن سے کیا سلوک ہو، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہاں دنیاوی لالچ میں سب درندے بنے ہوئے دانت کچکچا رہے ہیں۔ حرام حلال کی تمیز مٹ جائے تو خیر کی توقع رکھنا فضول ہے۔ کہانی کا اختتام ہوا چاہتا ہے، آنے والے ماہ تمام تجسس دور ہو جائے گا۔

''کنواری، بھیڑیے اور باؤلا کتا'' پڑھ کر یقین ہو گیا کہ کبھی جلدی اور موجودہ زندگی میں بھی انسان اللہ کی گرفت میں آ جاتا ہے ورنہ اکثر مظلوموں کی آہ و فریاد اور سسکیاں رائیگاں جاتی ہیں اور ظالم زمینی خدا بن کر دندناتے رہتے ہیں اور غریب بے بسی میں صرف آہیں بھرتا رہتا ہے۔ یہاں ایسا انصاف ہوا ہے کہ اردگرد کے سارے علاقے میں مدتوں خوف و ہراس رہا ہوگا۔ صابر حسین راجپوت نے انسان دوستی اور ہمدردی کا حق ادا کر دیا۔ ''مٹی کا قرض'' دراصل ہمارے ٹھنڈے پڑتے جذبوں پر تھپڑ کی مانند ہے جس میں سپاہی ظفر اقبال کی بہادری اور میجر طارق کی منصوبہ بندی اور جذبہ حب الوطنی کی داستانِ شجاعت ہے۔ یہ ایسی لازوال قربانی ہے جس میں دنیاوی لالچ اور داد و تحسین کا دخل ذرہ برابر نہیں ہے۔ سب ملک و ملت اور پاک سرزمین کی سالمیت اور عزت بچانے کے لئے کیا پھر صفحہ آخر پر شاہدہ شاہ نے اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ اس پر سوائے جلنے کڑھنے کے عام شہری کیا کر سکتا ہے۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر کے آخرت سنوار لی ہے۔ کسی کی سوچ، کردار اور انفرادی بے حسی پر پابندی نہیں لگائی

الریاض فین

20۔اے سمال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

جاسکتی البتہ اپنی ذات کے احتساب کی تحریک ضرور ملتی ہے۔ یوں اتنا احساس ضرور ہوتا ہے کہ ضمیر میں زندگی کی رمق باقی ہے۔

''پیار، پردیسی اور پیر'' میں گلو کی آپ بیتی میں تسلسل، روانی اور واقعات کا باہم ربط قابل تعریف ہے۔ ابھی خدوخال ابھرے نہیں ہیں کوئی واضح شکل سامنے نہیں آئی لیکن اندازہ ہو رہا ہے راوی کو کسی ٹھکانے تک پہنچنے اور مستقل ٹھکانہ بنانے کے لئے مشقت جھیلنی ہو گی۔ دھکے کھانے پڑیں گے اور انسانوں کی مٹی چاپی کرنا پڑے گی۔ ''میں اور میرا تخلیقی سفر'' پڑھ کر دستگیر شہزاد کی صلاحیتوں کے قائل ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ تعارف کے نام پر چاہنے والوں سے مذاق کے مترادف ہے۔ ''شہید کا شاہی جلوس'' پڑھنے کے بعد پاک بھارت تعلقات اور کسی طرح کے معاہدوں پر بات کرنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ بھلا کافر بھی مسلمانوں کے لئے مخلص ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ ہمیں بھائی چارے کی تھپکیاں دے کر ہمارے دشمنوں سے تعلقات بڑھا رہے ہیں اور جنگی جنون پورا کرنے کے لئے دھڑا دھڑ جدید سے جدید ہتھیار تیار کر رہا ہے۔

''بندش'' میں جیسے حالات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے یہ دستور کی طرح صدیوں سے ایک ہی منظر ہے، لوگوں کے خیالات بدلے ہیں نہ اندر کا کالا پن گیا ہے۔ آج بھی ایسے جال بنے جا رہے ہیں، پھندے لگے ہیں اور منافقانہ برتاؤ ہے۔ یہ کیسی انسانیت اور مسلمانیت ہے بھلا مذہب سے اتنی دوری اور لاعلمی بھی ہو۔ اس دن کا انتظار ہے جب ایسے بنگالی بابوں، جادو توڑ کے ماہر اور ہر مشکل کے حل آستانوں پر قانونی چڑھائی ہو گی اور ساتھ کچھ لوگوں میں شعور جاگے گا اور عقل صحیح فیصلے کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ ''آگ اور فریب'' پڑھ کر افسوس کے ساتھ واقعات کی دلچسپی اور دوسروں کی چالاکی پر ہنسی بھی آئی۔ واقعی بات معمولی ہوتی ہے لیکن ہماری سادگی یا مصلحت کوشی کی وجہ سے پیچیدہ اور پُراسرار معاملہ بن جاتا ہے۔ اگر گھر میں مساوات، انصاف قائم اور سب کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو چاردیواری کے مسائل حل اور ماحول خوشگوار اور پُرسکون ہو جائے گا۔

''قصہ غیرت کا'' میں داستان گوئی کے تمام لوازمات پورے کئے گئے ہیں، دلچسپ ایسی کہ سماں باندھ دیا ہے۔ اشفاق احمد ایڈووکیٹ کھرے، سچے اور مومن مسلمان ہیں گو ملزم واقعی مجرم اور قاتل تھے لیکن وہ حق بجانب تھے، دوسرا کوئی راستہ نہ تھا البتہ خود مر جاتے تو سارے جھگڑے ختم ہو جانے تھے۔ بیٹی کو اپنے نصیب کے دکھ سمیٹنے تھے لیکن انہوں نے شیطان کو انجام تک پہنچا کر پورے علاقہ کو رسوائی اور بے غیرتی سے بچا لیا وگرنہ پیر جو حرام کی خوراک اور شراب پی کر بدمست ہاتھی بنا ہوا تھا، کیا کیا تباہی مچاتا یہ سامنے کی بات ہے۔ امید ہے وکیل کی ڈائری کا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ شفیع اللہ خان بنوں نے ''دیار حرم کو چلے'' سے متعلق حقیقت پسندانہ میسج کر کے میرا حوصلہ اور خون بڑھا دیا ہے۔ شکریہ قبول کیجئے!

❁ ——— اعجاز حسین ستھار۔ نور پور تھل، خوشاب

❁❁❁

آنحضرت ﷺ نے فرمایا

انسان کی آزمائش اس کی اپنی ذات، اہلِ خانہ، اس کا مال، اس کی اولاد اور اس کے پڑوسی کے بارے میں ہوتی ہے۔ روزہ رکھنا، صدقہ کرنا، نماز پڑھنا، نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے منع کرنا، اس کا کفارہ بنتے ہیں۔
(صحیح ابن حبان، جلد:7)

❁ ——— ہما شہزادی۔ لاہور